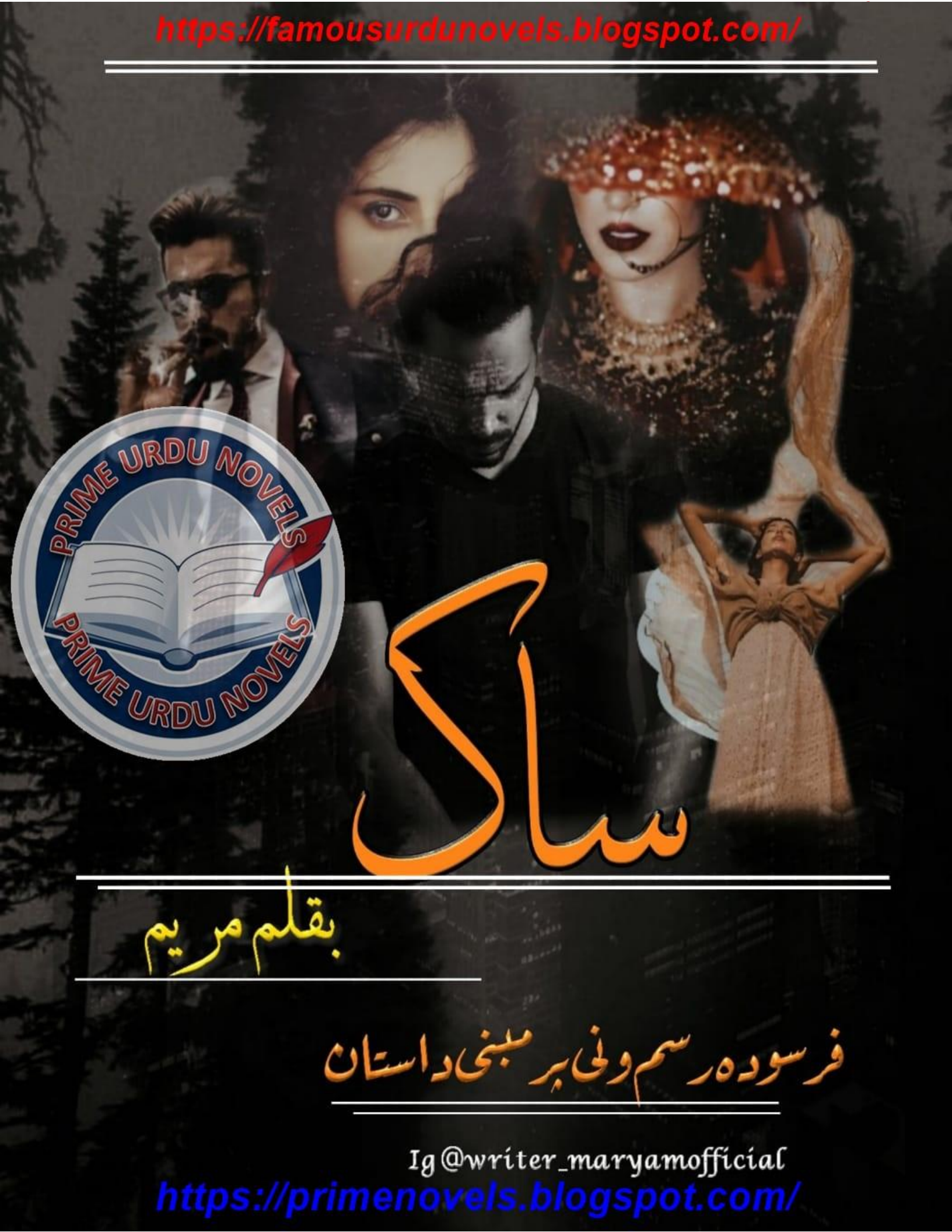

https://famousurdunovels.blogspot.com/
PRIME URDU NOVELS
PRIME URDU NOVELS
ساک
بقلم مریم
فرسودہ رسم ونی پر مبنی داستان
Ig @writer_maryamofficial
https://primenovels.blogspot.com/

ساک

عرضِ ناشر:

ساک لفظ ونی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔اس کے لفظی معنی "خاطر" کے ہیں۔یہ کہانی ہے فرسودہ رسم "ونی" کی بھینٹ چڑھی ایک پندرہ سالہ لڑکی کی۔یہ کہانی ہے انجان راستوں کی مسافت کی اور ایک ایسے ان چاہے رشتے کی جس کی منزل لاپتا تھی۔

☆☆☆☆☆

آغازِ سفر

ہرنی جیسی آنکھوں میں خوف ہی خوف تھا۔بدن پر کپکپی طاری تھی تو دل ڈوبتا جارہا تھا۔پھوپھی کہہ رہی تھی کہ کسی بھی وقت سائیں کے آدمی موت کا فرشتہ بنے آسکتے ہیں، پھوپھی کی جس بات نے اسے سب سے زیادہ خوف زدہ کیا وہ یہی تھی کہ وہ اسے ان سے چھین کر لے جائیں گے اور پھر کبھی یہاں نہیں آنے دیں گے۔اس کا گھر؟اس کی گڈیاں؟اس کے کپڑے؟اس کی سہیلیاں؟اس کے ابا اور اس کا لالہ؟ابھی تو اسے گڈی اور گڈا کی شادی بھی کروانی تھی۔لیکن اب پھوپھی یہ کیا کہہ رہی تھی؟وہ پھوپھی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر بیٹھ گئی۔

"پھوپھی مجھے چھپادے۔۔۔مجھے اپنے دوپٹے میں چھپالے۔میں نہیں جاؤں گی پھوپھی۔۔۔حویلی والے بہت ظالم ہیں۔"

معصومیت اور خوف کے ملے جلے امتزاج سے بولتی وہ رومانہ میں سمٹتی جارہی تھی۔رومانہ بھی اسے خود سے لپٹائے ہوئے تھی جیسے اسے کہیں جانے نہیں دے گی۔وہ اس کی پناہوں میں ممتا کا احساس محسوس کرنے لگی۔پھوپھی بیوہ ہونے کے بعد یہیں چلی آئی تھی۔ابھی تین سال ہی تو گزرے تھے اس کی ماں کو مرے۔پھوپھی نے وہ کمی کچھ نا کچھ حد تک پوری کر دی تھی اور باقی کمی قمر نے پوری کر دی تھی۔

"رونا بند کر زینی میں تجھے کہیں جانے نہیں دوں گا۔تو جانتی ہے تیرے رونے سے مجھے درد ہوتا ہے تو کیوں رو رہی ہے؟"

وہ سولہ سال کا ایک دھان پان سا لڑکا تھا۔ ہلکی، ہلکی مونچھیں اس کی جوانی کی چغلی کھا رہی تھی۔ وہ اس کے برابر بیٹھا اور اس کا رخ اپنی جانب موڑے اس کے آنسو پونچھے۔ رومانہ نے اسے آنکھیں دکھائیں پھر سختی سے بولیں۔

"قمر اندر جا۔"

قمر ان کا ایک ہی ایک بیٹا تھا جو مرحوم شوہر کی نشانی تھا جس کے گزرنے کے بعد وہ بھائی کے در پر آ بیٹھی تھیں۔ اب یہ ایک ہی ایک بیٹا بھی سائیں کے بندوں کے ہاتھ چڑھ جاتا تو ان کی عمر بھر کی کمائی لٹ جاتی۔

"پھوپھی میں سمی کے گھر چھپ جاتی ہوں۔"

اپنی ایک دوست کا ذکر کیے وہ چارپائی سے اٹھی تو ایک دم ہی قمر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے مڑ کر قمر کی جانب دیکھا جو اسے نظر انداز کیے یونہی اس کا ہاتھ تھامے رومانہ کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"امی تو ان لوگوں کے آنے سے پہلے ہی مسجد لے جا کر ہمارا نکاح کروا دے میں اپنی زینی کو لے کر یہاں سے دور چلا جاؤں گا۔"

وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ زینی نے گھبرا کر ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکالا۔

"تو پاگل ہو گیا ہے قمر؟ سائیں تجھے مار دے گا۔ سائیں کے بندے تم دونوں کو ڈھونڈھ کر مار دیں گے۔"

رومانہ کے لہجے میں ہزاروں خوف اور اندیشے چھپے ہوئے تھے۔

"امی میں۔۔۔"

قمر کی بات دبا دی گئی۔

"بس کر قمر۔۔۔ چپ رہ، تو میری عمر بھر کی کمائی ہے میں تجھے سائیں کے ہاتھ نہیں چڑھنے دوں گی۔"

رومانہ سخت لہجے میں بولی۔ وقت برہنہ تلوار بنا ان کے سروں پر لٹک رہا تھا کسی بھی لمحے وہ تلوار ان پر آ گرنی تھی۔

"اور یہ امی؟ یہ کیوں اس رسم کی بھینٹ چڑھے؟ کیوں؟"

رومانہ نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر تھپڑ دے مارا۔

"ایک بار کی بات سمجھ نہیں آتی تجھے؟ چار جماعتیں پڑھ کر مجھے پڑھانے چلا ہے۔"

وہ تنفر سے بڑبڑائیں۔ تبھی لکڑی کا دروازہ زور، زور سے بجنے لگا۔ دستک جاری تھی اور وہ سن ہوئے کھڑے تھے۔ دروازے کے پار اس کی قسمت کھڑی تھی۔ کیا یہی تھا اس کا نصیب؟ اس کی سہیلیاں قمر کا نام لئے اسے چھیڑتی تھیں۔ وہ انھیں ڈپٹ دیتی تھی مگر اتنا جانتی تھی کہ اس کا نصیب قمر ہی ہے مگر یہ اب کیا ہو گیا تھا؟ بعض اوقات ہم انسان جو سوچتے ہیں، اور جو حقیقت ہوتی ہے اس میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے، اور جب حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے تو قدموں تلے نا زمین رہتی ہے نا سر پر آسمان۔ انسان زمین و آسمان کے درمیان خلاء میں معلق ہو کر رہ جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

جوانی تو اس پر ایسی چڑھی تھی کہ خود جوانی بھی شرما گئی۔ نازک سراپا، عمر کے حساب سے قد، گول مٹول سا چہرہ، سرخ و سپید گال جو روئی کی مانند لگتے، ستواں ناک میں چمکتا لونگ، باریک قدرت کے تراشے ہونٹ جاذبِ نظر آنکھیں جو نیلے اور ہرے رنگ کا امتزاج تھیں ایسے لگتیں گویا کانچ ہوں۔ اور سب سے منفرد چیز اس کی بے پناہ معصومیت تھی۔ قمر اکثر کہتا تھا کہ میں خوش نصیب ہوں کہ میری دلہن اتنی پیاری ہو گی۔ سارے جلیں گے مجھ سے۔ اور جب پھوپھی سن لیتیں تو ڈانٹ کر رکھ دیتیں تھیں۔

☆☆☆☆☆

منڈیر پر صبح کی دودھیا روشنی پھیلنے لگی تھی۔ کچھ کبوتر بھی وہاں بیٹھے تھے۔ نہ جانے یہ کبوتر کہاں سے آتے تھے مگر ہر صبح اکٹھے ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔ یہ کبوتر زینی کے دوست تھے اور ہمیشہ یہیں موجود رہتے تھے۔ لکڑی کے دروازے کے آگے کچا صحن تھا۔ ایک جانب دو چار بکرے اور ایک بھینس بندھی ہوئی تھیں۔ پاس ہی چھت ڈالے

ایک اٹاری بنائی گئی تھی۔ جہاں چولہا پڑا تھا۔ یہ جگہ رسوئی کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ برسات کے دنوں میں اس جگہ کا بڑا فائدہ رہتا تھا۔ چارپائیاں یہیں کھڑی کر دی جاتی تھیں۔ وسط میں برگد کا درخت لگا ہوا تھا جس کی شاخیں پھیل کر پورے صحن کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ ایک جانب رو میں تین کمرے میں بنے ہوئے تھے اور کونے میں غسل خانہ تھا۔

اٹاری سے مسلسل دھواں نکل رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا اندر چولہا کچھ دیر قبل ہی چلایا گیا ہے۔ اندر جائیں، تو رومانہ مصروف سے انداز میں کونڈی ڈنڈے سے مرچیں کوٹ رہی تھی۔ پاس بیٹھی زینی لجاجت سے انھیں دیکھ رہی تھی۔ ایک دفع پھر وہ منت آمیز لہجے میں بول اٹھی۔

"پھوپھی جانے دے نا۔۔۔۔ شام تک لوٹ آوں گی، وعدہ کرتی ہوں۔ سمی کہہ رہی تھی بس لالی (سمی کی بکری) اور سونو (اس کا بکرا) کو گھمانے لے جانا ہے، چارہ توڑنا ہے اور واپس آجانا ہے۔"

اس نے طے شدہ لائحہ عمل رومانہ کے سامنے دہرایا۔ کونڈی میں ڈنڈا کھڑک رہا تھا۔ گوشت بھونا جا رہا تھا جس کی اشتہا انگیز خوشبو پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہفتے میں ایک دن گوشت پکتا تو وارے نیارے ہو جاتے تھے۔

"تو بہت تنگ کرتی ہے زینی مجھے۔"

رومانہ نے بے بسی سے سر ہلایا تو زینی کا چہرہ کھل اٹھا وہ رومانہ کے گال چومتی اٹھی اور چھلانگیں مارتی بکروں کے پاس چلی آئی۔ جھک کر وہ سونو (اپنے بکرے) کی رسی کھولنے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ خوشی سے کچھ بڑبڑا بھی رہی تھی۔ منڈیر پر بیٹھے کبوتر کبھی گردن دائیں جانب گھماتے تو کبھی بائیں جانب۔

☆☆☆☆☆

سوات کا دل فریب موسم کچھ مزید دل فریب ہو چکا تھا۔ گھنی گھٹائیں آسمان کا احاطہ کر چکی تھی۔ یہاں کا موسم بہت بے اعتبار تھا کبھی کسی بھی لمحے بارش ہونے لگتی تو اگلے ہی لمحے موسم صاف ہو جاتا تھا۔ ان کے گاؤں کی حدود

کے آخر میں پہاڑوں پر ہموار سا راستہ بنایا گیا تھا جو حویلی کے راستے میں ہی تھا۔ اس راستے سے بائیں جانب مڑ کر حویلی تھی تو دائیں جانب سر سبز و شاداب کھلا میدان جدھر تا حد نگاہ بس سبزہ ہی سبزہ اور مختلف پھلوں کے درخت تھے۔ وہیں پہاڑوں کے درمیان خوبصورت اور چھوٹی سی ندی تھی جو گاؤں سے بھی ہو کے گزرتی تھی۔ رومانہ ہوتیں تو کبھی انھیں یہاں نہ آنے دیتیں۔ یہاں گاؤں کی لڑکیوں کا داخلہ ممنوع تھا مگر انھیں یہاں کے مالٹے یہاں کھینچ لائے تھے۔

"بس کر دے زینی اور کتنے مالٹے توڑے گی۔ دیکھ ابھی تو لالی اور سونو چرنے میں مصروف ہیں سو خاموشی ہے اگر یہ میں، میں کرنے لگے تو یہاں کوئی نا کوئی آجائے گا۔"

درخت کے نیچے کھڑی ہم عمر، عام صورت سی لڑکی بار، بار سر گھما کر ادھر، ادھر دیکھتی پریشانی سے بول رہی تھی جب کہ زینی کا ہی دوپٹہ پھیلا رکھا تھا جس میں لاتعداد مالٹے موجود تھے۔ مالٹے بھی وہ جو اوپر درخت پر چڑھی زینی توڑ، توڑ کر پھینکتی جا رہی تھی۔

"چپ کر جا سمی۔۔۔ ایک اور توڑ لوں بس۔"

وہ پاؤں دوسری شاخ پر رکھے تنا مضبوطی سے تھامے مزید اوپر چلی گئی۔

"پچھلے پندرہ منٹ سے یہی سن رہی ہوں میں۔"

سمی پریشان معلوم ہو رہی تھی۔ وہ پہلی بار یہاں آئی تھیں، ایسے میں پریشان ہونا تو بنتا تھا۔ سمی نے ایک بار پھر اطراف کا جائزہ لیا پھر ذرا آگے ہو کر اوپر کی جانب جھانکا۔ زینی ایک ساتھ تین، چار مالٹے توڑے ہوئے تھی۔ وہ دوبارہ کچھ کہنے کو لب کھولنے ہی والی ہی کہ کسی آواز نے اس کی بات کا گلہ گھونٹ دیا۔

☆☆☆☆☆

حویلی پوری شان و شوکت سے کھڑی تھی۔ یہ "خان حویلی" علاقے کی شان تھی جو کئی ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھی۔ حویلی کے گرد اونچی، اونچی فصیلیں قائم تھیں۔ دائیں اور بائیں جانب دو لوہے کے مضبوط گیٹ لگے ہوئے تھے۔ دونوں گیٹ کے سامنے گیٹ کیپر کھڑے تھے۔ اندر داخل ہونے پر دونوں جانب پتھریلی روش موجود تھی جو کہ حویلی کے مرکزی بڑے لوہے کے دروازے تک جاتی تھی۔ دائیں اور بائیں دونوں جانب پارکنگ کی جگہ بنائی گئی تھی جہاں مختلف قسم کی گاڑیاں لینڈ کروزر کھڑی تھیں۔ تاحد نگاہ کھلا، کشادہ و سرسبز لان تھا۔ اطراف میں کئی کیاریاں بنائی گئی تھیں، جن میں مختلف قسم کے پودے اور درخت لگائے گئے تھے۔ کچھ درخت اتنے بڑے اور تنومند ہو چکے تھے کہ وہ حویلی کی اونچی فصیل تک جا پہنچے تھے۔ لان میں دونوں جانب کرسیاں اور میزیں لگائے گئے تھے جن پر اکثر شام گئے حویلی کے مرد بیٹھ جاتے تھے۔ شام اور صبح کے وقت موسم بہت دلفریب اور سہانا ہوتا تھا۔

لکڑی کے بڑے اور پائیدار دروازے پر مختلف نقش و نگار بنائے گئے تھے جنھے دیکھ کر ایک پل کو انسان انہی میں کھو سا جائے۔ بڑے لکڑی کے دروازے کے کھلتے ہی ایک لمبی سی راہدری تھی جس کے دو حصے کر دیئے گئے تھے، ایک حصہ زنان خانے کی جانب جاتا تھا تو دوسرا حصہ مردان خانے کی جانب جاتا تھا۔ یہ دیوار تب تک قائم رہتی جب تک کہ درمیان میں لگی لکڑی کی جالیاں نا آجاتیں۔ اس جالی میں سوراخ اتنے ہی تھے کہ با آسانی مردان خانے سے آوازیں زنان خانے تک پہنچ پاتی تھیں۔ مردان خانہ اور زنان خانہ دونوں ہی دو، دو حصوں میں تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ نیچے والے حصے میں حویلی کے بڑے رہتے تھے چونکہ سیڑھیاں اترنا اور چڑھنا ایک مشکل کام تھا سو اوپر والے حصے میں عطاء اللہ خان کے پوتے اور پوتیوں کے کمرے تھے۔

☆☆☆☆☆

سردار عطاء اللہ خان قبیلے کے بڑے سردار تھے۔ ان کی شادی ان کی خالہ زاد فیروزہ خانم سے ہوئی تھی۔ ان کے دو ہی بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا سلیمان خان اور چھوٹا بیٹا زمان خان۔ جرگے کا فیصلہ عدل و انصاف اور علاقے کے قانون کے

مطابق کرتے تھے۔اب انہوں نے جرگے کے فیصلے سنبھالنے کا اختیار اپنے بڑے بیٹے سردار سلیمان خان کو دے دیا تھا۔جب کہ زمینوں کا حساب کتاب چھوٹے بیٹے سردار زمان خان کو سونپ دیا تھا۔

سلیمان خان کی شادی صبور خانم سے ہوئی تھی جو ان کی پھوپھی زاد تھیں۔ان کے دو بیٹے تھے۔بڑا بیٹا بہرام خان اور چھوٹا بیٹا سفیر خان۔ایس ایس پی بہرام خان زیادہ تر لاہور ہوتا تھا۔نوکری کے بعد سے حویلی آنا،اور عید کے چاند کا نظر آنا ایک ہی بات ہو چکی تھی۔سفیر شروع سے پڑھائی سے چلتا تھا۔یونیورسٹی بھی درمیان میں ہی چھوڑے واپس سوات آ گیا تھا۔بہرام نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر نتیجہ وہی ڈھاک کی تین پات،اس فیصلے سے سب سے زیادہ خوشی عطاء اللہ خان کو ہی ہوئی تھی۔ان کے نزدیک پڑھائی سے زیادہ اہم خاندانی جاہ و جلال اور زمین جائیداد تھیں۔اب بہرام تو ان کی مخالفت مول لئے نوکری کر ہی رہا تھا مگر سفیر کے فیصلے نے ان کا سیروں خون بڑھا دیا تھا۔

زمان خان کی شادی صلہ خانم سے ہوئی تھی ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔بڑی بیٹی کشف خان تھی جو پرائیویٹ بی اے کر رہی تھی،اس سے چھوٹے صائم اور زعیم جڑواں تھے۔وہ دونوں بی ایس کے سٹوڈنٹ تھے۔دونوں ہی حویلی بھر کی ناک میں دم کیے رکھتے تھے۔مصیبت کا نام بعد میں لیا جاتا تھا اور صائم اور زعیم کا نام پہلے۔

☆☆☆☆☆

سفیر کڑکڑاتے سفید کرتا شلوار میں اپنے کمرے سے نکلا۔کف لنک باندھتے وہ سیڑھیاں اترتا نیچے لاؤنج میں آ پہنچا۔داخلی دروازے کے پاس ہی مرتضیٰ ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔سر اٹھائے،اس کی گہری جانچتی آنکھیں اسی کی جانب متوجہ تھیں۔ہلکی،ہلکی شیو اور پٹھانوں سی رنگت،وہ اگر عام آدمی نہ ہوتا تو سردار ضرور کہلاتا۔نظریں ابھی بھی اسی کی جانب متوجہ تھیں۔انھیں جھکانا شاید اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔وہ بھورے رنگ کے سوٹ پر کریم شال لپیٹے ہوئے تھا۔اس کا چال چلن اور اٹھنے بیٹھنے کا انداز ایسا تھا کہ وہ کہیں سے ملازم معلوم نہیں ہوتا تھا۔حال ہی میں

اس کی ملاقات سفیر سے ہوئی تھی۔وہ گاؤں کا عام سا مرد تھا۔اس کے پاس کوئی نوکری نہ تھی۔سفیر نے اسے اپنا خاص ملازم رکھ لیا تھا۔اس دن سے وہ ہر جگہ پر سفیر کے ساتھ ہوتا تھا۔وہ سفیر کے کردار سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔سفیر کس قسم کا مرد تھا یہ بات محض وہی جانتا تھا۔جو سفیر کے کردار کی حقیقت کو پالیتا تھا اس کا منہ بند کروانے کو سفیر کسی بھی حد تک چلا جاتا تھا۔پھر چاہے اسے مقابل کی جان ہی کیوں نا لینی پڑتی۔عطاء اللہ خان کے بے جا پیار ولاڈ نے اسے بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔اسے زر،زن اور زمین کی ایسی لت پڑ چکی تھی کہ وہ چاہ کر بھی خود کو سدھار نہیں سکتا تھا۔اس کے بگاڑ میں کچھ حصے دار بخش بھی تھا جسے سفیر کا جوٹھا چاٹنے کی عادت ہو چکی تھی۔

سفیر نے نظریں لاؤنج میں دوڑائیں پھر مسکراتے ہوئے اس کی جانب چلا آیا۔

"کیسے ہو؟"

چہرے پر مسکراہٹ سجائے بولا تو مرتضیٰ پل بھر کو مسکرایا۔

"ٹھیک سرکار۔۔۔"

اس نے سر کو خم دیا پھر مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے باہر کی جانب بڑھ گیا۔مرتضیٰ نے سرد نظروں سے اس کی پشت کو تکا۔سرکار ایک اچھا آدمی تھا اگر اس کا اندر بھی باہر جیسا ہوتا۔مگر انسان بھی آرٹس کی اس کتاب کی طرح ہے جس کا ایک صفحہ بھرا اور ایک کورا ہوتا ہے۔بھرا صفحہ تو بھرا ہوا ہے اور اسے کوئی بھی پڑھ سکتا ہے،دیکھ سکتا ہے لیکن کورے صفحے پر کیا لکھنا ہے اور کیا بنانا ہے اس کا تعین انسان خود کرتا ہے۔

گیٹ کے باہر سفیر کی گاڑی تیار کھڑی تھی۔آج اسے شکار پر جانا تھا وہ گاڑی کے قریب پہنچ کر رکا۔تیز ہوا کے سب بال ماتھے پر بکھرنے لگے تھے۔اس نے بیزاری سے ذرا سر نیچے کیے گاڑی کے سائیڈ مرر میں دیکھتے ہوئے انگلیاں بالوں میں چلاتے ہوئے بال سلجھائے۔ایک نظر خود کو دیکھ کر مسکرایا۔بلاشبہ وہ خوبصورت مردوں میں سے ایک تھا۔چوڑے کندھوں پر شال ڈال رکھی تھی۔منتشر بال کسی کا بھی دل دھڑکانے کو کافی تھے۔مغرور

آنکھیں، اور تیکھے نقوش، سلیقے سے تاؤ دی گئی مونچھ اور اسکی سفید رنگت ایسی تھی کہ وہ صحیح معنی میں خوبرو مرد کی تعریف پر پورا اترتا تھا۔

"مرتضیٰ۔۔۔میری بندوق؟"

سر اٹھا کر اس نے کچھ فاصلے پر کھڑے مرتضی سے پوچھا۔

"سرکار سب سے پہلے وہی گاڑی میں رکھوا دی تھی۔"

وہ مبہم سا مسکراتے ہوئے بولا تو سفیر نے سر ہلایا۔ پھر گاڑی میں سوار ہوا جس کا دروازہ بخش پہلے ہی کھولے ہوئے تھا۔ بخش دوسری جانب سے آکر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے ہی والا تھا جب سفیر بول اٹھا۔

"مرتضیٰ آج گاڑی تم چلاؤ گے۔"

"جو حکم سرکار"

وہ طنزیہ مسکراہٹ بخش کی جانب اچھالتا گاڑی تک آیا۔ پھر ایک ہاتھ سے بخش کو ایک جانب کرتا فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھا۔ زیادہ تر گاڑی بخش چلاتا تھا مگر جس روز سفیر کا دل فاسٹ ڈرائیونگ کا ہوتا وہ مرتضیٰ کو ہی گاڑی چلانے کا بولتا تھا کیوں کہ مصطفیٰ فاسٹ ڈرائیونگ کرتا تھا اور اس انداز سے کرتا تھا کہ کسی قسم کا نقصان نا ہو پاتا۔ بخش اپنی کھولن سنبھالتا پیچھے والی گاڑی میں جا بیٹھا۔ نجانے اب مرتضیٰ سے سرکار کیا، کیا باتیں کرتے۔ اس کا دل جل رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

گاڑی فراٹے مارتی حویلی کی حدود سے باہر نکل آئی تھی۔ سفیر مطمئن انداز میں ٹیک لگائے پرسکون بیٹھا تھا۔ مرتضیٰ گاہے، بگاہے اسے دیکھ لیتا تھا۔

"سرکار کس طرف لے چلوں؟"

اس نے نظریں ونڈ سکرین کے پار جمالیں۔

"پاس کے میدان میں لے چلو۔۔۔شکار ملا تو کر لیں گے ورنہ ندی کے پاس بیٹھ کر ہی کام چلا لیں گے۔"

وہ آخر میں ہلکا سا ہنسا۔مرتضیٰ نے سر اثبات میں ہلایا۔

"جی ٹھیک سرکار" کہتے ہی اس نے گاڑی میدان کے راستے پر ڈال دی۔

☆☆☆☆☆

میدان پہنچنے پر جب سفیر نے بندوق طلب کی تو علم ہوا کہ وہ بندوق گاڑی میں نا تھی۔مرتضیٰ کے بہت ڈھونڈھنے پر بھی کچھ بر آمد نہ ہو سکا۔سفیر سخت نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔مرتضی ایک دم ہی چونکا اور سر اٹھا کر فاصلے پر کھڑے بخش کی جانب دیکھا جس نے مرتضی کے دیکھنے پر کندھے اچکا دیئے۔تو مرتضی کا شک درست تھا یہ اسی کا کام تھا۔مرتضی نے دانت پیسے۔

"سرکار میرے خیال سے بندوق حویلی ہی رہ گئی ہے۔"

وہ سر جھکائے بولا۔سفیر نے اسے زبردست گھوری سے نوازا۔

"تم کہہ رہے تھے کہ رکھ لی ہے۔"

"سرکار میں بتانا بھول گیا تھا کہ آخری وقت پر بخش نے بندوق صاف کرنے کے لئے گاڑی سے بندوق نکالی تھی۔وہ کہہ رہا تھا کہ خود گاڑی میں رکھ دے گا۔مجھے علم نا تھا۔"

بات مکمل کیے اس نے فاصلے پر کھڑے بخش کی جانب زہریلی مسکراہٹ اچھالی۔وہی مسکراہٹ جو بخش کو پور،پور سلگا گئی۔سفیر نے بخش کی جانب دیکھا۔

"تم سے اس نااہلی ولاپرواہی کی امید نا تھی۔"

"سرکار۔۔"

وہ کچھ بولنے ہی والا تھا جب اس کی سنے بغیر وہ مرتضیٰ کی جانب مڑا۔بخش ہاتھ مل کر رہ گیا۔

"تم جاؤ اور جلد از جلد بندوق لے آو۔تب تک میں ندی کنارے جارہا ہوں۔"

وہ حکم سنائے مڑ گیا۔مرتضیٰ تیکھی نظریں بخش پر ڈالے مسکراہٹ چہرے پر سجائے کچھ گنگناتا ہوا گاڑی کی جانب چلا گیا۔پل بھر میں گاڑی فراٹے مارتی سڑک پر دھول اڑاتی جارہی تھی۔

وہ چہل قدمی کرتا ندی کنارے آیا مگر پھر اس سمیت بخش اور باقی گارڈ بھی چونکے۔اس ویرانے میں جہاں کسی کو آنے کی اجازت نا تھی وہاں گاؤں کی لڑکی اپنی بکریوں سمیت آئی ہوئی تھی۔انہوں نے ابھی تک محض سمی کو دیکھا تھا درخت پر چڑھی زینی انہیں نظر نہیں آئی تھی۔دوسری جانب سمی کو جیسے ہی قدموں کی چاپ سنائی دی وہ گھبرا کر پلٹی مگر پلٹنے پر چھوٹے سرکار کے ہمراہ دیگر گارڈ دیکھ کر اس کے چھکے چھوٹ گئے۔گھبراہٹ ایسی طاری ہوئی کہ ہاتھ میں موجود دوپٹے کا پلو بھی چھوڑ دیا نتیجہ یہ ہوا کہ مالٹے زمین پر بکھر گئے کچھ لڑھکتے ہوئے دور جا پہنچے۔سمی کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا۔منہ سے آواز بھی نہیں نکل پارہی تھی۔سفیر نے سر جھٹکا پھر بولنے ہی والا تھا جب ایک اور آواز پر چونک گیا۔

"سمی۔۔۔او سمی۔۔۔پاگل ہوگئی ہے۔افففف اللہ جی سارے مالٹے گرا دیئے۔ابھی تو کھانے بھی تھے۔سمی ادھر کر منہ، کیا ہوا ہے ادھر دیکھ اور یہ بھی پکڑ۔"

زینی اپنی ہی رو میں بولتی جارہی تھی۔مگر سمی تو اپنی جگہ پر چپک چکی تھی۔

"آنے دے مجھے نیچے ابھی تیرا منہ توڑتی ہوں۔"

وہ مالٹے ایک، ایک کیے نیچے پھینک چکی تھی۔جانتی تھی پچک گئے ہوں گے اور اب اس کا حساب اسے نیچے جا کر بخوبی لینا تھا۔سفیر کی نظریں درخت پر جم گئیں جہاں کوئی لڑکی مہارت سے تنا تھامے نیچے اتر رہی تھی۔اسے سامنے سے دیکھے بغیر ہی سفیر جان گیا کہ وہ حد درجہ خوبصورت ہے۔نازک کمر پر لہراتی لمبی چوٹی اس بات کی گواہ تھی۔سفیر کی نظروں میں اشتیاق جاگ اٹھا۔رخ موڑے اس نے خاموشی سے گارڈز کو دیکھا پھر ہاتھ جھلا کر جانے

کا اشارہ کیا وہ سب انہی قدموں پر پلٹ گئے۔ بخش پہلے تو نا جانے کے ارادے سے کھڑا رہا مگر سفیر کی گھوری پر دل مسوس کر چلا گیا۔ دوسری جانب سمی نے زمین پر پڑا زینی کا دوپٹہ بے بسی سے دیکھا۔ زینی کی بڑبڑاہٹ جاری تھی۔

"تو آج واجب القتل ہے"

وہ زمین پر چھلانگ مارے ہاتھ جھاڑتی مڑی مگر سن رہ گئی۔ بات منہ میں ہی دم توڑ گئی۔ اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔

دوسری جانب سفیر خان بے بس ہو گیا۔ اتنا کامل حسن جو ایک ہی وار میں مقابل کی جان لے ڈالے۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی حسین ہو گی۔ وہ بچی تھی اس بات کی بھی سفیر کو پرواہ نo تھی۔ اسے اب کھیلنے کو یہ کھلونا چاہیے تھا وہ کھلونا جو اس کا من پسند کھلونا ثابت ہونے والا تھا۔

"سس۔۔۔ سرکار آپ۔"

سفیر کی نظریں اسے آر پار جاتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ان نظروں میں کچھ ایسا تھا کہ زینی کانپ کر رہ گئی تھی۔ اس کے دیکھنے کا انداز اور قمر کے دیکھنے کا انداز مختلف تھا۔ وہ زمین پر بیٹھ کر اپنا دوپٹہ اٹھانے ہی والی تھی کہ سفیر منٹوں کا فاصلہ لمحوں میں طے کیے اس کی جانب چلا آیا۔ اس سے قبل وہ دوپٹہ اٹھاپاتی سفیر نے اپنے کھیڑی میں مقید پیر اس کے دوپٹہ پر رکھ دیئے۔ زینی نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

"سرکار"

وہ دبے لہجے میں بولی۔ دوپٹہ نکالنے کی کوشش کی، مگر بے سود۔ سفیر آہستہ سے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"ایسے زیادہ حسین لگ رہی ہے۔ کیا نام ہے تیرا چھوکری؟"

مونچھوں کو تاؤ دیئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ چند لٹیں چہرے کے اطراف میں جمع ہو چکی تھیں۔ سفیر نے ہاتھ بڑھا کر انھے کان کے پیچھے کرنا چاہا جب اچانک اس میں ہمت آ گئی۔ اس نے سفیر کے سینے پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈالے اسے پیچھے کو دھکا دیا۔ سفیر اس کے لئے تیار نہ تھا سو ایک دم ہی پیچھے کی جانب گرا مگر بروقت ہاتھوں کے

سہارے خود کو بچایا۔ موقع پاتے ہی زینی نے دوپٹہ اٹھایا۔ پھر مڑ کر چارمالٹے جیسے تیسے اٹھائے۔ مالٹے وہ چھوڑ کر نہیں جاسکتی تھی۔ چاہے جو بھی ہو۔ سمی بھی اس کے پیچھے ہی دم دبا کر بھاگی تھی۔ سفیر ہاتھ جھاڑتا اٹھا۔ پل، پل نظروں سے دور جاتی اس حسینہ کی پشت تکی۔ بخش بھی تب تک آچکا تھا۔

"سرکار بندے دوڑائیں ان کے پیچھے۔ گاؤں کی حدود سے پہلے ہی اٹھالائیں گے۔"

اس کا اپنا جی للچا رہا تھا۔ سفیر نے ہاتھ اٹھائے نفی میں اشارہ کیا۔

"نہیں بخش، ابھی نہیں۔ مجھے ساری خبر چاہیے، یہ لڑکی کون تھی، اس کا خاندان سب کچھ۔"

پھر سیٹی پر دھن بجاتے مست انداز میں واپس مڑ گیا۔ مرتضیٰ بندوق لئے واپس آچکا تھا۔ بخش بھی ہاتھ مسلتا دور اس جانب دیکھتا رہا جہاں سونو اور لالی اپنی مالکن کے پیچھے دوڑتے جا رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

شام پھیل رہی تھی۔ آسمان دو رنگوں کے امتزاج میں ڈھل گیا۔ کہیں سے نیلا اور کہیں سے ہلکا گلابی رنگ۔ جو دیکھنے والے کی آنکھوں کو بھاتا تھا۔ منڈیر اب خالی تھی وہاں کوئی کبوتر موجود نہ تھا البتہ آسمان پر پرندوں کے جھنڈ محو پرواز تھے وہ سب اپنے آشیاں کی جانب لوٹ رہے تھے۔

رومانہ کمرے میں تھیں۔ قمر اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے گیا تھا۔ اس کا باپ اور اس کا لالہ ابھی تک اپنی نوکری سے نہیں لوٹے تھے۔ مالٹے کھانے کے بعد اس نے وہ تمام چھلکے اکٹھے کیے اور جھولی میں ڈالے جانوروں کے باڑے میں چلی آئی۔ کونے میں ایک ڈرم پڑا تھا جس میں سارا کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا تھا جو دو دن بعد ڈرام بھرنے پر پھینک دیا جاتا تھا۔ اس نے چھلکے اس میں پھینکے۔ پھر باڑے میں موجود سب جانوروں کی پیٹھ تھپکنے لگی۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی اس نے دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھا پھر دروازے کی جانب بڑھی۔ وہ جانتی تھی دروازے پر ابا، لالہ یا قمر ہو گا۔

اس نے دروازے میں موجود ہلکی سی جھری سے باہر جھانک کر دیکھا۔ پھر مطمئن ہو کر کنڈی کھول دی۔ دروازہ کھولے وہ ایک جانب ہوئی مرتضی اندر داخل ہوا اور دروازہ بند کیا پھر مڑ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھے اسے ادھر، ادھر ہلایا وہ مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام گئی۔

"لالہ"

وہ چڑ کر بولی۔ مرتضیٰ نے ہنس کر اس کی خفا صورت تکی۔ پھر شال اتار کر اس کی جانب بڑھائی۔

"دھونے والی ہے؟"

اس کے پیچھے چلتے ہوئے وہ سوالیہ انداز میں بولی تو مرتضیٰ نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں دھونے والی تو نہیں ہے آج ہی پہنی تھی، ایک کام کرو میرے لیے کھانا لگا دو بہت شدت سے بھوک لگی ہے۔"

وہ منہ بنا کر بولتا واش بیسن کی جانب چل دیا۔ زینی نے سر جھٹکا۔ اس کی شال کی تہہ لگائی اور وہ شال وہیں چارپائی پر رکھی۔ بیسن پر مرتضیٰ ہاتھ منہ دھو رہا تھا۔ وہ نیچے موجود نل چلا کر ہاتھ دھونے کے بعد اٹاری کی جانب چلی آئی۔ مدھم دہکتے کوئلوں پر سالن کی دیگچی اٹھا کر رکھی، ہاٹ پاٹ میں موجود چپاتیاں ابھی بھی گرم تھیں۔ یہ رومانہ تازی، تازی بنا کر گئی تھیں۔ ان نے ایک تھالی میں اپنے لئے اور دوسری میں مرتضیٰ کے لئے سالن اور چپاتی رکھی۔ تب تک ہاتھ منہ دھوئے مرتضی صحن میں بچھی چارپائی پر آ بیٹھا تھا۔ دیگچی پر ڈھکن رکھتے وہ اٹھی۔ پہلے مرتضیٰ کی تھالی اس کے سامنے رکھی پھر مٹکے سے پیالے میں پانی نکال کر وہ مرتضی کے سامنے رکھا، اپنی تھالی سنبھالے وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

"آپ کا دن کیسا گزرا لالہ؟"

اس نے نوالہ توڑا پھر سالن لگاتے ہوئے مصروف سے انداز میں پوچھا۔

"اچھا تھا۔"

مرتضیٰ نے کندھے اچکا دیئے۔ پھر پیالہ منہ کو لگائے پانی کی گھونٹ بھرنے لگا۔ دو تین نوالے کھانے کے بعد اس نے سر گھمائے ارد گرد دیکھا۔ مسکراتے ہوئے سر جھٹک کر ایک دفعہ پھر اپنی پلیٹ پر جھکا۔ زینی نے حیرانی سے اس کی جانب دیکھا۔

"آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟"

اسے لگا جیسے لالہ اس کا بھید پا چکے ہیں۔ تبھی گھبرا سی گئی۔ مرتضی کو چھوٹے خان کے ساتھ نہ پا کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا تھا ورنہ اب وہ ایسے اس کے برابر میں نہ بیٹھی ہوتی۔

"نہیں ویسے ہی سونو کو دیکھ کر مسکرا رہا ہوں ایسا لگتا ہے کہ وہ آج بہت خوش ہے۔"

مرتضیٰ کے وضاحت دینے پر زینی نے مسکرا کر سامنے دیکھا جہاں سونو ادھر، ادھر اچھل رہا تھا۔

"ہاں جی آج گھومنے گیا تھا تبھی اتنا خوش ہے۔"

بے دھیانی میں نوالہ توڑتے اس کے منہ سے پھسلا۔ اس کی بات پر مرتضی کا ہاتھ میں پکڑا نوالہ منہ میں جانے سے قبل ہی رک گیا۔

"کیا کہا دوبارہ کہنا؟"

اس نے نوالہ واپس تھالی میں رکھا۔ زینی کو بھی زبان کے پھسل جانے کا اندازہ ہو چکا تھا۔ بوکھلا کر اس نے سر اٹھایا۔ اسکول کے علاوہ اس کا باہر جانا مرتضیٰ نے بند کر رکھا تھا۔ اس نے تھوک نگلا پھر بمشکل گلا کھنکھارے بولنے لگی۔

"اف۔۔۔ لالہ وہ دراصل سمی کو اپنی امی کے ساتھ لالی کا چارہ لینے جانا تھا۔ سونو کافی دنوں سے بیمار، بیمار لگ رہا تھا۔ تبھی پھوپھو کے کہنے پر میں نے اسے بھی سمی کے ساتھ ہی بھیج دیا تھا۔"

اس نے عام سے انداز میں کہا پھر دوبارہ سر جھکائے کھانا کھانے لگی۔ مرتضیٰ کچھ دیر جانچتی نظروں سے اس کی جانب دیکھتا رہا۔

"پکی بات ہے؟"

ایک بار پھر تصدیق چاہی تو زینی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"ہاں نا اب بھلا میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گی؟"

اس نے سوالیہ انداز اپنایا یہ الگ بات تھی کہ لفظ "جھوٹ" کہتے ہوئے اس نے تھوک نگلا۔ مرتضیٰ نے سر ہلایا۔ وہ کچھ خاص مطمئن نظر نہیں آرہا تھا۔ مگر پھر بھی خاموشی اختیار کرنے میں عافیت جانی۔ وہ بعد میں رومانہ سے پوچھ سکتا تھا۔

☆☆☆☆☆

کمرہ حویلی کے دیگر کمروں کی طرح کھلا اور شان دار تھا۔ وسط میں پلنگ موجود تھا۔ دائیں جانب لگی کھڑکی پچھلی جانب کھلتی تھی۔ کھڑکی پر دبیز پردے تھے۔ ایک جانب کتابوں کا شیلف تھا۔ شاید کمرے کی مکین کو کتابوں سے شغف تھا۔ ایک دروازہ غسل خانے اور ڈریسنگ کا تھا۔ بیڈ پر کوئی وجود اوندھے منہ نیم دراز تھا۔ نظریں بظاہر تو سامنے کھلی پڑی کتاب پر تھیں مگر دل و دماغ کہیں اور پہنچے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا عکس لہرا رہا تھا۔ وہ اسے بار، بار یاد آرہا تھا۔ اس کا کبھی کبھار کا وہ مسکرانا، اس کی وجاہت اور عزت دینے کا انداز، اس نے بلا آخر اکتا کر کتاب بند کر دی اور بستر پر چت لیٹ گئی۔

"آج پھر آپ یاد آرہے ہیں۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟"

اس نے خود سے سوال کیا۔ نیلی آنکھیں چھت کی جانب تک رہی تھیں۔ گالوں پر اس کے خیال کے ذہن میں آنے سے قبل لالی آجاتی تھی۔ گلابی ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ خیالِ یار مسکرانے پر مجبور کر ہی دیتا ہے اور یہی حال

اس کا تھا۔ پھر یکا یک ایک اور سوچ اس کے ذہن کے پردوں پر لہرائی۔ آغا جان مر جائیں گے مگر ایسا ہونے ہی نہیں دیں گے۔ ذہن نے خبر دار کیا تو حقیقت ایک کڑوا سچ بنے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ بھلا حقیقت سے کہاں بھاگا جاتا ہے۔ اس نے گہرا سانس بھرا۔ مسکراتے لب سکڑ سے گئے۔ آنکھوں میں جلتی امید کی جوت بجھ گئی۔ مایوسی جیسے پوری فضا میں پھیلی تو گہری رات کو مزید سیاہ کرتی گئی۔ اس نے گہرا سانس بھرا پھر کتاب اٹھا کر سامنے رکھ لی۔ خیالی دنیا حقیقی دنیا سے زیادہ خوبصورت تھی۔

☆☆☆☆☆

گاڑی پتھریلے راستے پر چلتی جا رہی تھی۔ کبھی ارد گرد ہچکولے کھاتی پھر دوبارہ متوازن انداز میں چلنے لگتی۔ چاند آسمان سے لاپتہ تھا۔ آج اماوس کی رات تھی۔ جھاڑیوں کی سنسناہٹ ان جھاڑیوں میں موجود حشرات کی گواہی دے رہی تھی۔ لمبے چیڑ کے درخت خاموش پڑے تھے۔ خاموشی ایسی تھی کہ گھبراہٹ طاری ہو جائے۔ گاڑی گاؤں کے درمیان سے سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ خالی سڑک پر دھواں اڑاتی گاڑی کی ہمت جواب دے گئی۔ انجن زیادہ گرم ہونے پر بند پڑ گیا تھا۔ اس نے دو، تین بار گاڑی دوبارہ چلانے کی کوشش کی مگر ناسود۔ اکتا کر وہ گاڑی سے باہر نکلا۔ یہاں اس جانب اکا، دکا گھر تھے۔ وہ لڑکھڑاتا اندھیرے میں راستے کا تعین کرتا آگے بڑھا۔ ہاتھوں سے دیواریں ٹٹولتا وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ مزید آگے جاتا اگر وہ گنگنانے کی آواز نہ سنتا۔ وہ آواز بہت خوبصورت تھی۔ مدھر گنگناہٹ اس کے حواسوں پر چھانے لگی۔ وہ آگے جانے کا ارادہ ترک کیے اس دیوار کے قریب آیا جس کے پار کسی کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔ نشے کی زیادتی کے سبب وہ لڑھک رہا تھا مگر خود کو قدرے سنبھالے وہ اس چھوٹی سی دیوار پر با آسانی چڑھ گیا۔ دیوار آہستہ سے پھلانگی کہ کسی کو بھی بھنک نہ پڑی۔ اوائل مارچ کے دن تھے تبھی باہر کا موسم درمیانہ تھا صحن میں کچھ چارپائیاں قطار میں ڈالی گئی تھیں جن پر گھر کے افراد لحاف اوڑھے محوِ استراحت تھے۔ وہ پھونک، پھونک کر قدم رکھتا اس کمرے کے پچھلی جانب چلا

آیا، جہاں ایک خستہ حال کھڑکی تھی اسی کھڑکی سے آواز باہر آرہی تھی۔اس نے اندر جھانکا۔کسی لڑکی کی پشت کھڑکی کی جانب تھی۔سارے بال ایک کندھے پر ڈالے وہ کچھ جھکی ان کی چٹیا بنانے میں مگن تھی۔دوپٹہ ندراد تھا۔وہ لڑکی یونہی خود میں مگن تھی۔کمرے میں دیا سلائی کی ہلکی سی روشنی تھی جو بہت زیادہ نا صحیح کچھ حد تک روشنی کیے ہوئے تھی۔لو مدھم کر رکھی تھی تبھی زیادہ روشنی نا تھی۔آسمان خاموش اور خالی پڑا تھا۔کہتے ہیں اماوس کی رات انسان پر شیطان کا زیادہ غلبہ چھاتا ہے اور یہی اس کے ساتھ ہونے لگا۔کچھ نشے کی زیادتی، اقدار کا گھمنڈ اور کچھ سیاہ رات کا اثر وہ سب بھلائے، آہستہ سے ادھ کھلی کھڑکی کو مزید کھولے، بغیر آہٹ پیدا کیے اندر قدم رکھ چکا تھا۔مڑ کر کھڑکی بند کی پھر اس لڑکی کی جانب چلا آیا جو ابھی بھی گنگنا رہی تھی۔

"ہمممممم۔۔۔"

وہ سراداکرتی مڑی مگر مڑنے پر اپنے بلکل پیچھے کھڑے شخص کو دیکھ کر اس کا رواں، رواں خشک پتے کی طرح کانپنے لگا۔آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئیں۔دل مٹھی میں لے لیا گیا۔

"چھوٹے۔۔۔ سس۔۔۔ سرکار"

وہ بمشکل جملہ مکمل کر پائی جبکہ مقابل اس کے سحر میں جکڑتا جا رہا تھا۔ایک جھٹکے سے اس کی کمر میں بازو لپیٹے اسے اپنی جانب کھینچا، اس کی چیخ حلق میں دب گئی بغیر سنبھلنے کا موقع دیئے اس کے بال کھول دیئے۔خمار آلود آنکھیں اس کے نقوش کا معائنہ کرنے میں مگن تھی۔اس کے انتہائی قدم پر اس کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"چھوڑو مجھے۔۔۔ چھوڑو"

وہ اس کی قید میں پھڑ پھڑانے لگی تھی۔کسی بن آب ماہی کی طرح۔کسی ایسے مسافر کی طرح جس کا سارا سامان ڈاکو لوٹنے والے ہوں، اس کی زندگی بھر کی جمع پونجی۔مگر مقابل پر شیطان سوار تھا۔اسے لڑکی کی آہیں، سسکیاں کیا

خاک سنائی دیتیں۔وہ رات آنسوؤں،تکلیف، غم،پل،پل موت اور قیامت کی رات تھی۔وہ جانور اس کی عزت و ناموس کی دھجیاں اڑاتا جارہا تھا۔اس کی نسوانیت تباہ کرتا جارہا تھا۔خود کو اپنے محرم کے لئے سینچ، سینچ کر رکھنے والی لڑکی تباہ و برباد ہو گئی تھی۔طاقت کے نشے میں چور وہ فرعون ایک بنتِ حوا کے مقدر میں تاریکی بھرتا گیا۔باہر چھاتی رات کی کوئی صبح معلوم نہیں ہو رہی تھی۔رات جیسے ہر گزرتے پہر مزید تاریک ہو رہی تھی۔تاریک سے تاریک تر۔

تیسرا پہر شروع ہوتے ہی اپنے پیچھے نیم مردہ سا وجود چھوڑے وہ اپنی قمیض کے بٹن بند کرتا کھڑکی سے باہر صحن میں کودا اور دیوار پھلانگے تاریکی کا حصہ بنتا گیا تھا۔دور،دور تک کچی پگڈنڈی پر اب کوئی ذی روح نظر نہیں آتا تھا۔کہیں دور بھیڑیوں کے بولنے کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں۔

☆☆☆☆☆

منڈیر پر کبوتر پھر سے آبیٹھے تھے۔کبھی دائیں تو کبھی بائیں سر گھماتے وہ سونو کو چارہ کھلاتی زینی کو دیکھ رہے تھے۔کچھ فاصلے پر کھڑا قمر بظاہر چارہ کترنے میں مصروف تھا مگر نظریں اسی پر جمار کھی تھیں جو زرد رنگ کے جوڑے میں بالوں کی چٹیا بنائے مگن سے انداز میں سونو کو چارہ کھلا رہی تھی۔قمر کا دھیان تب اس پر سے ہٹا جب اسے رومانہ کی آواز سنائی دی۔

"زینی۔۔۔۔اوزینی۔۔۔جلدی آجا،ناشتہ کرلے لے سب نے اپنے اپنے کام کو جانا ہے۔"

"آئی پھوپھو۔"

اس نے اونچی آواز میں کہا پھر نل سے ہاتھ دھوتی وہ ہاتھ دوپٹے سے پونچھتی اٹاری کی جانب چل دی۔کبوتروں کے ساتھ ہی ساتھ قمر کی بھی گردن مڑی تھی یہاں تک کہ زینی اٹاری میں داخل ہو گئی۔یہاں قمر نے رخ موڑا وہیں کبوتر بھی یک ٹک اب اسی کی جانب دیکھنے لگے۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟ اچھا گھورو تو مت۔۔۔وہ میری ہے میں اسے دیکھ سکتا ہوں۔"

اس نے پختہ یقین سے کہا جیسے اس بات میں کوئی شک ہی نا ہو مگر ایک دم ہی منڈیر پر بیٹھے تمام کبوتر جیسے روٹھ گئے ۔پہلے ایک کبوتر اڑا، پھر دوسرا اور بلا آخر منڈیر خالی ہو گئی۔ قمر حیرانی سے ان جاتے کبوتروں کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ نا قابل رسائی ہو گئے۔اس نے سر جھٹکا اور ایک بار پھر سر جھکائے چارہ کترنے لگا۔

☆☆☆☆☆

مرتضیٰ صبح، صبح ہی حویلی آ پہنچا تھا۔خاکی شلوار قمیض میں اس کا نمایاں قد مزید نمایاں معلوم ہو رہا تھا۔کندھوں پر گرم شال اوڑھ رکھی تھی۔وہ مالی سے کوئی بات کرتا مسکرا رہا تھا۔ایسے میں اس کے چہرے کی وہ دلکش مسکراہٹ کسی کا چین لوٹنے کے در پر تھی۔وہ نہیں جانتا تھا کہ کسی کی پیاسی نگاہیں اپنی تشنگی بجھانے میں مگن ہیں۔اس کی مسکراہٹ میں مگن ہیں جو کبھی، کبھی اس کے چہرے کی زینت بنتی تھی۔ آج وہ اسے کتنی مدت بعد دیکھ رہی تھی ۔وہ چونکی پھر سر جھٹکا۔دو دن مدت ہی تو تھے۔دلِ بے قرار کو اس کے بن کہاں چین مل رہا تھا۔کیا محبت یہ ہوتی ہے کہ محبوب کا دیدار نصیب نا ہو تو دو دن کیا دو گھنٹے بھی مدت لگتے ہیں۔کوئی اگر کشف سے پوچھتا تو وہ بے جھجھک کہہ دیتی۔"ہاں یہی محبت ہے"۔وہ نا جانے اس کی نظروں سے انجان تھا یا بنتا تھا۔کشف کو یہی لگتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اس کی نظروں سے انجان بنتا ہے۔وہ ایسا کیوں تھا اور وہ کیوں ایسا کرتا تھا؟ کیا اسے کشف کی آنکھوں کی چمک سب بتا نہیں دیتی تھی؟ وہ لاتعداد سوچوں میں گم تھی نظریں مرتضیٰ پر ہی تھیں۔اور تبھی مرتضیٰ نے رخ موڑ کر اس کی جانب دیکھا محض ایک پل، پھر چہرہ دوسری جانب کر لیا۔کشف کے دل میں میٹھا سا درد جاگا۔سر جھٹکے اس نے اندر سے خجستہ کو آواز لگائی جو جی بی بی جی کرتی دوڑی چلی آئی۔

"خجستہ کتنی دیر لگا دی تم نے چلو ہمارے ساتھ۔"

خجستہ نے اپنی چادر سنبھالتے ہوئے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ سادی جامنی شلوار قمیض میں کالی چادر سے خود کو ڈھانپے اس کی بھوری آنکھوں میں بے صبری تھی۔ جیسے وہ اڑ کر گاڑی تک جانا چاہتی ہو۔

"بی بی سرکار خیریت ہے نا؟ اچانک کہاں جانے کی تیاری ہو گئی۔"

کشف کی تیز رفتاری کے ساتھ ملنے کی بھرپور کوشش کی۔ تھوڑا چونک کر کشف دھیمی پڑی۔

"ہمیں لائبریری جانا ہے بند نا ہو جائے نا۔"

اس نے جلدی سے وضاحت دی جو اس کی طبیعت کے برخلاف تھی۔ خجستہ نے آسمان کی جانب دیکھا۔ سرمئی شام پورے لان میں اتر رہی تھی۔

"تو بی بی ابھی چار بجے ہیں پانچ بجے بند ہو گی ابھی تو گھنٹہ ہے۔"

خجستہ نے اسے تسلی دی۔ کشف بدوقت نقاب تلے پھیکا سا مسکرائی۔

"ہمممم۔۔۔"

وہ ہنکارہ بھرے خاموش ہو گئی۔ خجستہ بھی چہرہ ڈھانپے اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ روش پر کونے میں کھڑی گاڑیوں میں سے ایک کے سامنے آ کھڑی ہوئی جو گاڑی اکثر حویلی کی عورتوں کو کہیں آنے، جانے کے لئے درکار ہوتی تھی۔ خجستہ ڈرائیور بلانے گئی تھی۔ اسے یقین تھا وہ مرتضیٰ کو ساتھ لائے گی۔ سینے پر بازو لپیٹے وہ تاحد نگاہ پھیلے لان پر اترتی شام دیکھنے لگی۔ سرمئی شام چھا رہی تھی۔ حویلی کی آدھی فصیل پر روشنی اور آدھی پر اندھیرا چھا چکا تھا۔ کہیں پاس ہی درخت پر کسی پرندے کے چہچہانے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ چہچہاہٹ پر چونکی تھی پھر نظر سامنے پڑی جہاں خجستہ بخش کے ہمراہ چلی آ رہی تھی۔ بخش حویلی کی عورتوں کا ادب کرتا تھا تبھی نظریں جھکائے ہوئے تھا۔ کشف کی خوش گوار طبعیت ایک دم ہی بدمزہ ہو گئی وہ ٹیک چھوڑے کھڑی ہوئی جب تک وہ دونوں گاڑی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ بخش نے مودب انداز میں پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔

"تشریف رکھیں بی بی سرکار۔"

وہ سر جھکائے ہاتھ باندھے بولا جب کشف جی اکڑا کر بول پڑی۔

"خجستہ ہمیں مرتضیٰ کے ساتھ جانا ہے۔"

اس کے بے باکی سے کہنے پر خجستہ نے گڑبڑا کر اسے دیکھا۔جب کہ بخش سر جھکائے ایسے کھڑا تھا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔کشف بھی زبان کے بے اختیار ہونے کو سمجھ گئی تبھی جلد وضاحت دی۔

"ہمارا مطلب ہے کہ جلد پہنچنا ہے تو اس لئے۔۔۔"

بخش نے کھولتے دل کو سنبھالا پھر سر اٹھا کر متوازن لہجے میں بولا۔

"بی بی معذرت۔۔۔مگر مرتضیٰ سفیر سرکار کے کام سے ابھی باہر نکلا ہے۔ابھی محض دو منٹ قبل۔"

کشف کا دل کسی نے مٹھی میں لے کر دبایا۔اس نے بدوقت خود کو سنبھالا۔محض ایک لمحے وہاں کھڑی ہوئی پھر بغیر کچھ بولے اندر کی جانب بڑھ گئی۔بخش نے سر اٹھا کر خجستہ کی جانب دیکھا جو اس سے بھی زیادہ حیران نظر آرہی تھی۔

"بی بی سرکار کو جلد پہنچنا تھا اب دیر ہو گئی ہو گی۔۔۔خیر"

وہ وضاحت دیتی اندر کی جانب بڑھ گئی۔بخش پر سوچ نگاہوں سے حویلی کا دروازے تکتا رہا۔اونچی فصیل پر تاریکی چھا رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

پولیس موبائل سڑک پر دھواں چھوڑتی جا رہی تھی۔اگلے دس منٹ میں وہ تھانے پہنچ چکا تھا۔حوالدار شفیق کے فون پر وہ تیس منٹ کا فاصلہ دس منٹ میں طے کر آیا تھا۔جیپ کا دروازہ کھلا تو وہ مکمل یونیفارم میں ملبوس گاڑی سے باہر نکلا۔ماتھے پر بکھرے بال اس بات کی چغلی کھا رہے تھے کہ یہاں جلد بازی میں آیا گیا ہے۔کسرتی بدن پر

پولیس یونیفارم خوب جچ رہا تھا۔ چہرے پر سنجیدہ تاثرات رقم تھے۔ بھوری آنکھیں اور مغرور نقوش، ہلکی بڑھی شیو اس کے وجیہہ چہرے پر خوب بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ بالوں میں ہاتھ چلاتے وہ تھانے میں داخل ہوا، کرسیوں پر بیٹھے اور ادھر ادھر گھومتے حوالدار سمیت تمام اہلکار چونک گئے۔ اپنی نشستیں چھوڑے سب کھڑے ہو گئے۔ اس نے سب کو ایک نظر دیکھا۔ یہ نظریں معمولی ہر گز نہیں تھی۔ سلام کا جواب دیئے وہ ٹھنڈے لہجے میں بولنے لگا۔

"ہزار مرتبہ سمجھا چکا ہوں کہ یہاں مفت کی روٹیاں توڑنے نہیں بیٹھے تم سب مگر اثر تو کسی کو نہیں ہو گا۔ جتنے مہذب اب بن کر کھڑے اور اپنا کام کر رہے ہو میری غیر موجودگی میں بھی کر لیا کرو۔"

سب پر ایک آخری کڑی نگاہ ڈالے وہ حوالات کی جانب آیا جہاں انسپکٹر جمشید اور حوالدار شفیق کھڑے تھے۔

"السلام علیکم سر۔"

اس کے پاس آنے پر وہ مؤدبانہ انداز میں ایک ساتھ بولے۔

"وعلیکم السلام۔۔۔! کیا رپورٹ ہے؟ منہ کھولا اس نے کہ نہیں؟"

اس کے سوال پر شفیق اور جمشید دونوں کو چپ لگ گئی اس نے ایک نظر شفیق کی جانب دیکھا اور دوسری نظر جمشید پر ڈالی۔

"میں نے کیا پوچھا ہے؟"

سخت لہجے میں بولا تو اب کی بار شفیق سٹپٹا گیا۔

"جناب وہ منہ نہیں کھول رہا، تبھی آپ کو فون کرنا پڑا ہے، ورنہ آپ کو کبھی زحمت نہ دیتے۔"

شفیق خوشامدی لہجے میں بولا۔ بہرام نے سخت نظروں سے اسے گھورا۔

"کیوں نہیں دیتے آپ مجھے زحمت؟"

"میں نے پوچھا کیوں نہیں دیتے آپ مجھے زحمت؟"

شفیق خاموش رہا تو اب کی بار وہ مزید سخت لہجے میں بولا۔

"سس۔۔۔ سر میں تو یونہی کہہ رہا تھا کہ آپ کا آج اوف تھا آرام کر سکتے تھے آپ پر ہمیں رپورٹ تیار کرنی تھی اور یہ منہ ہی نہیں کھول رہا تھا۔"

شفیق نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔ خوامخواہ ہی وہ اپنی شامت بلا لایا تھا۔

"یہ میرا فرض ہے حوالدار صاحب۔۔۔ اس کرسی پر آرام کرنے نہیں بیٹھا میں۔ اوف لوں بھی تب بھی میری ڈیوٹی ختم نہیں ہوتی۔ آئندہ یہ بات نا سنوں میں۔ گوٹ اٹ؟"

اس نے آخر میں تنبیہی لہجہ اپنایا۔ شفیق نے فوراً سے سر ہلایا۔

"اب چلیں۔۔۔ میں بھی دیکھوں کیسے نہیں منہ کھولتا وہ۔۔۔"

بہرام آستین موڑتے ہوئے سب سے آگے چل رہا تھا پیچھے حوالدار اور انسپکٹر تھا۔ حوالات کے پاس رک کر اس نے ہلکا سا رخ موڑے شفیق کی جانب دیکھا۔

"لاک اپ کھولیں۔"

شفیق نے پینٹ کے ساتھ لٹکتی چابیوں کے گچھے سے ایک چابی نکالی اور آگے بڑھ کر لاک میں گھمائی۔ لاک فورا کھل گیا وہ ایک جانب ہوا اور بہرام کو اندر جانے کا راستہ دیا۔ بہرام اندر داخل ہونے ہی والا تھا مگر کچھ سوچ کر رکا۔

"تم دونوں یہیں ٹھہرو"

"پر سر آر یو شیور۔۔۔" بہرام کی سخت گھوری پر جمشید کی چلتی زبان بند ہوئی۔ "ٹھیک ہے سر"

وہ متوازن انداز میں بولتا وہاں سے واک اوٹ کر گیا اس کے پیچھے ہی شفیق بھی چل دیا۔ ان کے جانے کے بعد بہرام اندر داخل ہوا۔ یہ حوالات ٹاچر سیل کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہ سب سے آخر میں اسی لئے بنایا گیا تھا کہ

کسی ملزم کی نظر یہاں نا پڑے مگر وہ چیخیں باخوبی سن سکیں۔اس سے بیان نکلوانے میں آسانی رہتی تھی۔حوالات کے وسط میں ایک آدمی کرسی پر بندھا پڑا تھا۔اس کی حالت اس بات کی گواہ ہیں کہ اس پر خاصا تشدد کیا گیا ہے ۔بہرام نے تنفر سے سر جھٹکا اتنے تشدد کے بعد بھی وہ منہ نہیں کھول رہا تھا۔ظفر نامی اس شخص کا تعلق کسی گینگ سے تھا جو ڈرگز اور لڑکیوں کی سمگلنگ میں ملوث تھے۔بہرام کو بیس روز کی ڈیڈ لائن دی گئی تھی۔اس سارے وقت میں اسے ہر حال میں اس گینگ کی سرغنہ کو تلاشنا تھا۔مگر تین روز بیت جانے کے بعد بھی اب تک کوئی سراغ نہیں مل پایا تھا۔ظفر سے قبل ملنے والے ایک شخص سے نے دورانِ تفتیش خودکشی کرلی تھی۔اس کی ایک داڑھ کی جگہ ایسی نقلی داڑھ لگائی گئی تھی جسے زبان سے اکھاڑ کر چبا لینے پر اس کے اندر موجود زہر سے پانچ سیکنڈ کے اندر، اندر آدمی کی جان چلی جاتی ہے۔مگر ظفر کے ایسی کوئی داڑھ موجود نہ تھی۔شاید وہ گینگ میں نیا، نیا بھرتی ہوا تھا۔جو بھی تھا، بہرام کو اس سے دلچسپی نہ تھی بہرام کو تو محض اس کا منہ کھلوانا تھا جو کہ اس کے لئے مشکل نا تھا۔کلائی میں باندھی گھڑی اتار کر اس نے پاس پڑے ایک میز پر رکھی۔پھر مضبوطی سے زمین پر قدم جمائے اس تک پہنچا۔بائیں ہاتھ کی مٹھی میں اس کے بال جکڑے پوری قوت سے دائیں ہاتھ کا طمانچہ اس کے منہ پر دے مارا۔دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنی پتھر کی انگوٹھی کے باعث ظفر کا گال پھٹ گیا۔تھپڑ کی شدت اس قدر تھی کہ وہ ادھ موا ہو گیا۔بہرام نا کچھ بولا تھا اور نا اسے بولنے دیا تھا۔ظفر نے ہمت کی اور بمشکل آنکھیں کھولے اس کی جانب دیکھا دھندلی آنکھوں کے پار اسے کسی کا عکس دکھائی دیا۔

"ہوش آیا؟ یا ایک اور ڈوز چاہیے؟"

طنز میں ڈوبا لہجہ، اس تھپڑ کی شدت کو یاد کیے ظفر کا جی چاہا کہ کاش اس کی بھی ایک داڑھ میں زہر بھرا ہوتا تو بنا ہچکچائے وہ زہر کھانے کو ترجیح دیتا۔

"چل اب بول؟"

بال اس قدر زور سے کھینچے گئے کہ اس کا سر پیچھے کی جانب جھک گیا۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے چھوڑ دو۔۔۔"

نقاہت زدہ لہجے پر بہرام نے بمشکل خود پر قابو پایا۔ پھر اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے اب وہ مطمئن انداز میں اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"جانتے ہو قانون میں کیا سزا ہے سمگلنگ کی؟ ساری عمر جیل میں چکی پیسو گے اور مجھے تو تم نئے، نئے معلوم ہوتے ہو۔ میرا نہیں خیال تم اتنا لمبا عرصہ جیل میں رہ سکو گے۔ یہ تو عادی مجرموں کا کام ہے۔ خیر میں آج چھٹی پر تھا۔ ارادہ تھا گھر رہ کر آرام کروں۔"

وہ ایک دم ہی اہم موضوع سے غیر اہم موضوع پر اتر آیا تھا۔ اس کے چھٹی لینے نا لینے سے ظفر کا کیا تعلق۔

"حیران نہ ہو بتا رہا ہوں۔"

وہ اطمینان سے آگے کو جھکا پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے محظوظ انداز میں بولنے لگا۔

"اب چونکہ گینگ لیڈر کو تمہارے پکڑے جانے کی اطلاع ہو گئی تھی اور اس تک یہ خبر بھی پہنچ گئی تھی کہ تمہارے زہریلی داڑھ نہیں لگی تو انہوں نے مجھے انٹرنیٹ کے ذریعے صبح ہی صبح ایک ویڈیو بھیجی تھی۔ پوچھو کیا تھا ویڈیو میں؟"

اب ٹیک لگائے بیٹھے اس کا انداز مطمئن سا تھا۔ ظفر اچھنبے سے اسے گھورنے لگا۔ منہ پر نیل اور جگہ، جگہ سے خون رس رہا تھا۔ آنکھیں بھی سوجھی ہوئی تھیں اور بمشکل کھل پا رہی تھیں۔ مگر بہرام کی باتیں اب اسے چونکا رہی تھیں۔

"کک۔۔۔ کیا؟"

اس کا لہجہ ڈگمگایا۔ بہرام کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگنے کی اجازت مانگنے لگی یہی چیز تو وہ چاہتا تھا۔ ایک بار پھر خود کو سنجیدہ کیا وہ بولنے لگا۔

"تمہاری دو شادیاں ہیں نا۔۔۔ تو اس نے تمہاری دوسری بیوی اغوا کر لی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر تم منہ کھولو گے تو وہ اسے سمگل کر دیں گے۔ مگر جانتے ہو کیا ہوا؟ ہم نے اس جگہ کی نشان دہی کر لی ہے جہاں تمہاری بیوی کو رکھا گیا ہے۔ اس پر بہت تشدد کیا گیا ہے۔ ہم ایک ہی شرط میں اسے وہاں سے نکال لائیں گے جب تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گے ورنہ۔۔۔"

بات کے آخر میں اس کا لہجہ تنبیہی ہوا۔ اس نے معمولی سی دھمکی دی اگر ظفر پروفیشنل ہوتا تو اس بات پر غور ضرور کرتا کہ جب وہ جگہ کی نشان دہی کر چکے ہیں تو خود کیس نپٹا لیں مگر بہرام جانتا تھا وہ اتنی عام سی بات پر بھی غور نہیں کر پائے گا۔ کیوں کہ وہ جذباتی تھا اور اس کے دماغ سے کھیلنا بہرام کے لئے آسان تھا۔ ظفر کا چہرہ پیلا پڑ چکا تھا۔

"ورنہ کیا؟"

اس نے مرے، مرے انداز میں پوچھا۔

"ورنہ تم یہاں رہو گے ساری عمر اور تمہاری بیوی چچ۔۔۔ چچ نجانے کتنے بستروں کی زینت بنے گے۔ بیچاری۔۔۔"

تلخ حقیقت بیان کی پھر کرسی کھسکا کر اٹھا اور بے نیازی سے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔ بمشکل دو ہی قدم اٹھائے تھے جب ظفر کی آواز سنائی دی۔

"میں کیسے مانوں کہ جو تم کہہ رہے ہو، وہ سچ ہے۔ مجھے ویڈیو دیکھاو۔"

اس کی جانب پشت کئے کھڑے بہرام کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی۔ پھر جلد ہی مسکراہٹ پر سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے وہ مڑا۔ جیب سے موبائل نکالا تو ظفر کی بچی کچی ہمت بھی فنا ہونے لگی۔ سکرین پر دو تین دفعہ انگلیاں

پھیرنے کے بعد اس نے ایک ویڈیو کھولا اور موبائل ظفر کے سامنے کر دیا۔ جو جو ویڈیو آگے بڑھ رہا تھا ظفر کا طنطنہ اور ہمت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ڈھیلا پڑتا جا رہا تھا۔ یہاں ویڈیو بند ہوا وہیں اس کی زبان چلنے لگی۔ بہرام مسکراتے ہوئے باہر نکلا۔

"شفیق رپورٹ تیار کرو اور اس کا بیان لے لو۔"

مبہم مسکراہٹ سے بولتا وہ باہر کی جانب بڑھ گیا۔ اسے اب گھر جانا تھا اس بیان کے بعد وہ منزل کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ گاڑی تک پہنچتے، پہنچتے ایس ایس پی بہرام خان کو صبح ظفر کی دوسری بیوی کے گھر جانا اور اس سے ظفر کی بازیابی کا وعدہ کیے ایک کلپ بنوانا یاد آ رہا تھا۔ لب مسلسل مسکرا رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

منڈیر خالی تھی۔ زینی کے چوکھٹ پار کرتے ہی کبوتر بھی اڑ گئے تھے۔ یہاں زینی کی بدولت ان کا جی لگا رہتا تھا۔ شاید انھیں سمی پر غصہ بھی آتا ہو گا کہ جب وہ آتی ہے زینی کو لے جاتی ہے۔ روز صبح وہ سمی کے ساتھ ہی اسکول جاتی تھی۔ جو گاؤں سے دو کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ یہ اسکول بھی عطا اللہ خان نے ہی تعمیر کروایا تھا اور اس کے بعد تو وہ علاقے بھر کی ہر دل عزیز شخصیت بن گئے تھے۔

انھیں اسکول پہنچنے میں کم از کم آدھا گھنٹہ لگتا تھا۔ کبھی کبھی آہستہ چلتیں تو پورے گھنٹہ بھی لگ جاتا تھا۔ جس دن کلاس لینے کا دل نہیں چاہتا وہ بہت آہستہ، آہستہ چلتیں کہیں، کہیں رک کر ادھر ادھر درختوں پر چڑھ کر پھل توڑ کر کھاتیں یا کسی کے گھر جا بیٹھتیں۔ وہاں کے لوگ مہمان نواز نہ ہوتے تو ان دونوں کی ذرا اچھے سے خاطر مدارت کرتے مگر مسئلہ یہی تھا کہ لوگ بہت مہمان نواز تھے۔

"یار زینی آج دل نہیں کر رہا اسکول جانے کا۔"

یہ سمی تھی جس کی ہمیشہ پیدل چلنے سے جان جاتی تھی۔زینی نے رک کر اسے گھورا۔بڑی سی سفید چادر مزید اچھے سے اپنے گرد لپیٹی۔

"تو چلتی ہے کہ مجھ سے جوتے کھانے ہیں تو نے ؟"

زینی نے سختی سے کہا تو منہ بسورے سمی نے بھی تیزی سے قدم اٹھانے شروع کر دیئے۔اب اگر اسکول جانا ہی تھا تو ذرا جلدی ہی پہنچ جاتیں۔جوتے کھانے سے بہتر تھا اسکول جایا جاتا۔صبح کی دودھیا روشنی آہستہ، آہستہ ختم ہو رہی تھی۔سورج پوری آب و تاب سے آنکلا تھا۔

☆☆☆☆☆

زمینوں کے درمیان گھرے ڈیرے پر مکمل خاموشی تھی۔داخلی دروازے پر دو تین گارڈ کھڑے تھے۔دائیں ،بائیں جانب پھیلا سبزہ زار سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔کیاریوں میں ڈھیروں ڈھیر پھول لگے ہوئے تھے۔کیا نیلے کیا پیلے، کیا سرخ گلابی، پرندوں کی مدھر چہچہاہٹ اور خاموشی ایک فسوں خیز ماحول پیدا کر رہے تھے۔پتھریلی روش پر کچھ دیر قبل ہی پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔کچھ پانی بھاپ کی صورت اڑ چکا تھا اور کچھ ابھی بھی روش پر موجود تھا۔ایک جانب بڑا سا برآمدہ تھا جہاں قطار میں چند پنجرے تھے۔جن میں پرندے اور چند جانور شامل تھے۔وہاں کے نگران علیحدہ تھے جنھے اس جگہ کی نگرانی کرنا ہوتی تھی۔ایک نگران ہاتھوں پر دستانے چڑھائے تھیلے سے گوشت نکال رہا تھا۔دائیں ہاتھ بنے پنجرے میں بیٹھا بھوکا شیر چونک کر کھڑا ہو گیا تھا گوشت کی خوشبو اشتہا انگیز تھی۔واپس روش پر آئیں تو سامنے ہی ڈیرے کا مرکزی حصہ آجاتا تھا۔جو دو تین کمروں اور کھلے سے صحن پر مشتمل تھا۔صحن میں تخت بچھا ہوا تھا جس پر بخش مونچھوں کو تاؤ دیئے بیٹھا تھا۔پاس ہی دو تین ملازم بھی بیٹھے تھے۔مرتضی آج حویلی تھا۔اسے عطاء اللہ خان کے کسی کام سے ان کے ساتھ شہر جانا تھا۔مرتضیٰ کی غیر موجودگی بخش کو شیر بنا دیتی تھی ورنہ بخش کی مجال کہ وہ مرتضیٰ کے سامنے کچھ بول پاتا۔

"تو سرکار سے بات کب کرے گا؟"

پاس بیٹھے ایک ملازم نے بے صبری سے پوچھا۔ بخش نے ایک نظر اسے دیکھا پھر گردن موڑے سامنے کے بند دروازے کو دیکھا۔

"سرکار ذرا خاص مہمان سے فارغ ہو جائیں پھر بات بھی ہو جائے گی سوہنیو۔"

وہ بے ڈھنگے انداز میں بولا۔ بائیں ہاتھ پڑا حقہ کھسکا کر پاس کیا اور نال منہ میں لئے حقے کے کش بھرنے لگا۔ غلام حسن کو عجیب سا لگا تو وہ ٹوکے بغیر نہ رہ سکا۔

"یہ حقہ سرکار کا ہے بخشے۔"

وہ مزید بھی بولنا چاہتا تھا مگر بخش نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ فضا میں دھواں چھوڑا اور مونچھوں کو تاؤ دیئے گھمنڈی انداز میں بول اٹھا۔

"سرکار اور میرا کچھ بانٹا نہیں ہے۔"

بات کے آخر میں قہقہہ لگایا اور دوبارہ سے گردن موڑے بند دروازہ دیکھا۔ حسن منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ اور ایک نظر بخش کی جانب دیکھا جس کی للچائی نظریں ابھی تک دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔

☆☆☆☆☆

تیسرے سمیسٹر کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ پانچ روز حویلی گزار کر واپس لاہور آ چکے تھے۔ اور پہلے دو سمیسٹر کی مانند ہی اس بار بھی آغاز میں خود سے جی لگا کر پڑھائی کرنے کے وعدے زور و شور سے کیے جا چکے تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ دو دن بعد ان کے وعدے ریت کا محل ثابت ہو جانے تھے۔

آج وہ دونوں کل آنے والے فریشرز کے استقبال کی تیاری کے لئے خریداری کرنے مال چلے آئے تھے۔ گاڑی پارک کرنے کی ذمہ داری صائم کو سونپے خود زعیم اندر کی جانب بڑھ گیا۔ ایک اور گاڑی برابر میں آ رکی۔ گاڑی

پارک کرتے صائم نے بلاارادہ نظر اٹھا کر برابر والی گاڑی میں جھانکا اور تبھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی لڑکی نے بال جھٹکے اور اس کی جانب دیکھا۔ خاصا فلمی سین تھا۔ صائم صاحب ان کاجل سے بھری آنکھوں میں ایسے غوطہ زن ہوئے کہ مال کر اندر گئے زعیم کو دوبارہ واپس آنا پڑا۔ کھڑکی بجا کر وہ کھڑکی پر ہلکا سا جھکا۔ کھڑکی پہلے ہی ادھ کھلی تھی مزید اس نے ہاتھ بڑھا کر کھول دی اور گھما کر ایک تھپڑ گوں مگوں کیفیت میں بیٹھے صائم کے چہرے پر دے مارا۔ وہ اس اچانک حملے پر بلبلا گیا۔

"اللہ کی قسم بس دیکھ ہی رہا تھا۔"

صائم کو لگا تھپڑ شاید لڑکی کی طرف سے آیا ہے۔ زعیم جو اسے باہر آنے کا بولنے ہی والا تھا چونک گیا۔ شاکی نظروں سے اسے گھورا اور گاڑی سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

"کیا دیکھ رہا تھا؟"

زعیم کے سوال پر وہ سٹپٹا گیا۔ نظریں ادھر، ادھر گھمائیں۔ گاڑی وہیں تھی مگر مالکن اب شاید اندر جا چکی تھی کیوں کہ پارکنگ لاٹ میں کھڑے اکا، دکا لوگوں میں وہ چہرہ کہیں نہیں تھا۔

"آں۔۔۔وہ۔۔۔شام۔۔ہاں شام ہی دیکھ رہا تھا۔ کتنی خوبصورت، دل فریب، سحر انگیز شام ہے۔"

صائم بوکھلائے لہجے میں جلدی سے وضاحت دینے لگا جبکہ زعیم نے شاکی انداز میں اسے دیکھا گویا اسے جانچنا چاہا۔ اتنی خالص اردو تو اس نے آج تک نہیں بولی تھی۔ مگر پھر کچھ یاد آنے پر بول اٹھا۔

"میں نے تجھ سے کہا تھا نا کہ ہماری جوڑیاں آسمان پر بنی ہیں۔"

اس کی بے تکی بات پر صائم نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ اب اس بات کا یہاں کیا ذکر؟

"بھائی سب کی وہیں بنتی ہیں۔ زمین پر تو بہانے بنتے ہیں۔"

صائم نے ناک سکوڑا۔ زعیم نے بھی ناک سے مکھی اڑائی اور اس کے ساتھ چلتے مال میں داخل ہوا۔

"ابے میری بات سن۔۔۔ابھی میں باہر آرہا تھا تو یقین جان دو بیوٹیز میرے پاس سے گزریں اور بوجھ وہ کیا تھیں؟"

صائم رک کر نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگا پھر چونک کر چٹکی بجائی۔

"ٹرانس جینڈر"

اس نے چہکتے لہجے میں کہا اب اگر وہ انسان نہیں تھیں تو یہی ہو سکتی تھیں۔اس کا دماغ یہیں تک گھوڑے دوڑا پایا ۔اس کا جواب سن کر منتظر نگاہوں سے اسے دیکھتے زعیم کا دماغ ہی گھوم گیا۔جی چاہا کہ ابھی رکھ کر دو چماٹ اسے دے مارے مگر ضبط کیے رہ گیا کیوں کہ سامنے ہی اسے وہ بیوٹیز دوبارہ نظر آگئی تھیں۔

"بول نا بھائی یہی تھے؟"

اسے خاموش پا کر صائم نے ٹہوکا دیا۔زعیم نے مڑ کر اسے سخت نگاہوں سے گھورا۔وہ ان نگاہوں کا مطلب سمجھے چپ سادھ گیا۔

"ہماری جوڑی کی بات کی ہے اور تو ہے کہ۔۔۔تف ہے تجھ پر۔"

زعیم نے سر جھٹکا۔صائم نے دانت نکوسے اور بازو اس کے شانے پر رکھا۔

"اچھا نا صحیح ہے اب بتا بھی دے۔"

صائم کے اصرار پر اس نے مسکراتے ہوئے ہلکا سا جھک کر آہستہ آواز میں اسے کچھ کہا ساتھ ہی نظر اٹھا کر سامنے دیکھا جہاں جڑواں لڑکیاں لیڈیز سیکشن میں کھڑی کپڑے دیکھ رہی تھیں۔

"دکھیں؟"

وہ لفظوں سے ان کا نقشہ کھینچ چکا تھا۔صائم بھی دیکھتے ہی پہچان گیا کہ یہ وہی گاڑی والی لڑکی تھی۔

"انہی کی بات کر رہا ہے؟"

صائم نے باقاعدہ ان کی جانب اشارہ کیا۔زعیم سٹپٹا گیا۔ایک نظر اسے دیکھا پھر ان کی جانب جو اشارے پر چونک گئی تھیں۔اپنی طرح ہی جڑواں لڑکے دیکھے وہ دونوں بھی چہ مگوئیاں کرنے لگیں۔

"ابے ہاتھ نیچے کر۔۔۔کتنی بار سمجھایا ہے اشارے نا کیا کر۔"

زعیم نے ہونٹوں پر ہاتھ کی مٹھی جمائے سختی سے کہا۔صائم نے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ہاتھ واپس گرا لیا۔وہ لڑکیاں بھی دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔

"چل آجا دال گلانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

زعیم کے کہنے پر بمشکل اپنی مسکراہٹ دبائے وہ بھی اسکے پیچھے ہو لیا۔وہ دونوں آہستہ، آہستہ مردانہ حصے سے زنانہ حصے میں داخل ہو گئے۔زعیم نے رک صائم کو ٹھوکا دیا اشارہ تھا بات شروع کر مگر اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔زعیم دانت پیس کر رہ گیا۔

"ڈوب مر منحوس۔"

پھر گلا کھنکھارے وہ ان کے برابر میں جا کھڑا ہوا۔مرتا کیا نا کرتا کے مترادف صائم کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا ۔آواز پر وہ دونوں لڑکیاں چونکیں،ایک قدرے خفگی سے تو دوسری بے تاثر انداز میں ان کی جانب دیکھ رہی تھی۔ان کی سوالیہ نظریں خود پر پا کر صائم کی بولتی بند ہو گئی جب کہ زعیم کو کچھ سوجھ ہی نا رہا تھا۔ابھی دو منٹ پہلے اسے سب معلوم تھا کہ کیا بولنا ہے اور کیا نہیں، مگر اب تو یہ حال تھا کہ بولتے کیسے ہیں؟ یہ بھی بھول گیا تھا۔صائم نے جلد ہی زعیم کو ٹھوکا دیا اور یہیں زعیم نے ہوش سنبھالا۔ایک بار پھر گلا کھنکھارا اور دانت نکوسے۔

"السلام علیکم"

وہ دونوں خاموشی سے انھے دیکھتی رہیں۔جواب ندراد۔زعیم اور صائم نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا پھر زعیم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تسلی دی کہ رک جا بیٹا آج یہاں سے کام بنا کر ہی جائیں گے۔

"سلام کا جواب دینا فرض۔۔۔"

زعیم کی بات ادھوری رہ گئی جب پیچھے کھڑی لڑکی تیزی سے آگے آئی۔

"وعلیکم السلام۔"

زعیم کے چہرے پر یکایک مسکراہٹ کھلی جو اسی وقت تھم گئی جب دوسری لڑکی نے پیچھے سے آنے والی لڑکی کا بازو مروڑ ڈالا۔

"چپ کر کے کھڑی رہو۔"

وہ سختی سے بولی تو دوسری لڑکی نے شکوہ کناں نظروں سے اسے گھورا۔

"کیا ہو گیا صفا وہ کون سا کچھ کہہ رہے ہیں سلام ہی تو کیا تھا۔"

وہ خاموش نا رہ سکی۔زعیم کی بتیسی نکل آئی۔

"ہاں اور سلام دعا سے آپسی پیار بڑھتا ہے۔"

وہ بولے بغیر نا رہ سکا۔مگر اتنے ڈائریکٹ جملے پر نا صرف وہ لڑکیاں چونکیں بلکہ خود وہ بھی سٹپٹایا۔اور صائم کا جی چاہا اس کے منہ میں روئی ٹھونس دے مگر کسی طرح اسے چپ کروادے۔جس کی زبان بے ساختہ ہی صحیح مگر پھسل چکی تھی۔

"جی میں سمجھی نہیں۔"

وہ ناسمجھ انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔

"اچھا ہوا نہیں سمجھیں۔"اس نے دل میں سوچا اس سے پہلے بول پاتا پہلی لڑکی بول اٹھی۔شاید محترمہ کو بولنے کا بہت شغف تھا۔

"مگر میں بہت اچھے سے سمجھ رہی ہوں۔"

"دیکھیں آپ زعیم کی بات کو غلط مت سمجھیے گا اسے ڈائریکٹ بات کرنے کی عادت ہے۔"

صائم پہلی بار کچھ بولا تھا۔ مروا نے بھی اس تمام عرصے میں پہلی بار اسے غور سے دیکھا تھا۔

"آپ تو بات نا ہی کریں تو بہتر ہے۔ توبہ ہے میں گاڑی میں بیٹھی تھی ایسے دیکھنے لگے مجھے جیسے ابھی نکال کر کھا جائیں گے۔"

وہ نخوت سے بولی۔ صفا اور زعیم کا قہقہہ بے ساختہ تھا جب کہ صائم نے تھوک نگلا پھر مدد طلب نظروں سے زعیم کی جانب دیکھا جس نے کندھے اچکا دیئے کہ بھائی جو کہنا ہے کہہ دے میرا کیا؟

"اچھا چھوڑیں یہ بتائیں شاپنگ کے لئے آئی ہیں آپ دونوں؟"

زعیم نے بے تکا سا سوال پوچھا اب کوئی پاگل سے پاگل شخص بھی سمجھتا ہے کہ مال میں شاپنگ کے لئے آیا جاتا ہے مگر یہ زعیم تھے جن کے پاگل پن کا بھی اپنا ہی لیول تھا۔ مروا توعام سے انداز میں کھڑی تھی جب کہ صفا نے اسے ایسے دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ اب وہ کیا جانے کہ واقع اس کا دماغ نہیں ہے۔

"نہیں یہاں پکنک منانے آئی ہیں۔ ابھی بس بیٹھنے کی جگہ ڈھونڈھ رہی تھیں۔"

صفا تیکھے لہجے میں بولی۔ مروا اس تمام عرصے میں پہلی بار مسکرائی تھی۔ گندمی آنکھیں بھی ساتھ ہی مسکرائی تھیں۔ صائم نے ان آنکھوں کا مسکرانا محسوس کیا تھا۔

"لو جی کر لو بات۔۔۔ اب لاہور کے پارک سیل ہو گئے تھے جو آپ لوگ یہاں پکنک منانے آ گئیں؟"

مقابل بھی زعیم تھا کوئی اگر طنز کرتا تو وہ اسے ڈبل کراس کرتا۔ اب کی بار مروا اور صائم ہنسے جب کہ صفا دھواں دھواں چہرے لئے ضبط سے مسکرائی۔

"ہمیں کسی نے بتایا تھا کہ یہاں ایک پاگل انسان آنے والا ہے ہم نے کہا چلو پکنک کی پکنک اور تفریح کی تفریح۔"

صفا دانت نکالتے ہوئے بولی۔ مروا نے اسے تھمبز اپ دیا۔

"اوہ شاید آپ کے گھر شیشہ نہیں ہے تبھی اس نے یہاں کا ایڈریس دیا ہے آپکو کہ یہاں شیشے میں آپ اپنے آپ کو دیکھ سکیں۔"

اب کی بار زعیم، صائم اور مروا اتنی زور سے ہنسے کہ سب نے مڑ کر انھیں دیکھا۔ صفا کچھ دیر یونہی نا سمجھی سے کھڑی رہی پھر سمجھ آنے پر غصے سے مڑی۔

"مروا گھر جانا ہے تو باہر آجانا۔"

وہ وہاں سے واک اوٹ کر گئی۔ مروا نے ان کی جانب دیکھتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"توبہ بہت غصے میں ہیں وہ۔"

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتی باہر دوڑی۔ زعیم نے صائم کی جانب دیکھا جس نے محض ہاتھ اٹھا کر پانچ انگلیاں اسے دکھائیں پھر سر جھٹکے مردانہ سیکشن کی جانب بڑھ گیا۔ اعلیٰ پائے کا ڈھیٹ پن دکھاتا زعیم بھی فرضی کالر درست کرتا اس کے پیچھے چلا آیا۔

☆☆☆☆☆

صبح کتنی تاریک تھی۔ شاید صبح کبھی آئی ہی نہیں تھی۔ شاید اس رات سے قبل کی صبح اس کی زندگی کی آخری صبح تھی۔ سب ختم ہو چکا تھا اور وہ خود بھی۔ وہ خود میں ہی ٹوٹ چکی تھی۔ اس کی ذات ریزہ، ریزہ ہو چکی تھی۔ نا جانے نصیب و قسمت میں ابھی کتنی ذلتیں باقی تھیں۔

کون اس کا بناؤ سنگھار کر رہا تھا؟ کون اسے زیور پہنا رہا تھا؟ اسے کچھ خبر نا تھی۔ یاد تھا تو بس یہی کہ آج اس کی شادی تھی۔ جو اس رات ہوا وہ اسی رات کی تاریکی میں ختم ہو چکا تھا۔ اسی تاریکی میں مل چکا تھا۔ اس کے گھر والوں کا کہنا تھا جو رات ہوا تھا وہ اسے ہر حال میں بھولنا ہے۔ وہ نا بھولی تو مار دی جائے گی۔ اس کا ہونے والا شوہر بڑے دل جگرے کا آدمی تھا جو سب جانتے ہوئے بھی اسے قبول کرنے والا تھا۔

☆☆☆☆☆

ڈیرے پر خاموشی تھی۔ بخش سر جھکائے روش پر چہل قدمی کرتے سفیر کے ساتھ چل رہا تھا۔ دور، دور تک سبزہ زار پر ملازم بکھرے ہوئے اپنا، اپنا کام کرنے میں مشغول تھے۔ مونچھوں کو تاؤ دیتے سفیر کو اچانک کچھ یاد آیا اور وجہ سامنے لگا درخت اور اس پر چڑھا ملازم تھا۔

"بخشے۔۔۔" وہ جیسے چونکتے لہجے میں بولا تھا بخش ایک دم سیدھا ہوا۔

"حکم سرکار۔۔۔!"

"خبر نکلوائی اس چھوکری کی؟"

وہ کس لڑکی کی بات کر رہا تھا یہ بخش جانتا تھا۔ تبھی ایک زہر خند مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ مرتضیٰ سے بدلہ لینے کا اس سے بہترین کوئی موقع ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"جی سرکار آپ کا حکم ٹال کر بخش نے جان سے تھوڑی جانا تھا۔ چھوکری کا نام نہیں معلوم مگر سب پیار سے زینی کہتے ہیں۔ وہ اپنے والے اسکول جاتی ہے اور دسویں میں پڑھتی ہے۔ دوست ایک ہی ہے۔ اور جی اپنے کھیتوں میں کام کرنے والے گل شیر کی بیٹی ہے۔"

وہ اتنا کہہ کر رک گیا۔ سفیر نے جھٹکے سے گردن موڑے بخش کی جانب دیکھا۔

"گل شیر تو اپنے مرتضیٰ کا باپ ہے تو اس کا مطلب وہ چھوکری۔۔۔"

بخش نے سر جھکا دیا۔ سفیر چند لمحے گردن موڑے دوسری جانب دیکھتا رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ مرتضیٰ اسے عزیز تھا مگر اگر اس کی دل پسند چیز کے حصول کی راہ میں مرتضیٰ بھی آیا تو مارا جائے گا۔

"جیپ تیار کرو۔۔۔ آج اس چھوکری کو ملاقات کا شرف بخشتے ہیں۔"

شال جھٹکتے وہ ڈیرے کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔جب کہ بخش کے چہرے پر زہر خند مسکراہٹ پھیل گئی۔ نفرت کے سفر کا آغاز ہونے کو تھا اور اب نا جانے یہ آغاز کتنے لوگوں کا انجام بننے والا تھا

☆☆☆☆☆

دیدار دید

دیدار جب سے پایا ہے تیرا ہم نے
ناپوچھ کہ کیا، کیا کھویا ہے ہم نے
تیری جھیل سی گہری آنکھوں میں کیا ڈوبے
واللہ مہ کے بغیر ہی پالیا ہے سرور ہم نے
یہ کیسی حالت ہوئی ہے دل کی، عجب سی
طوفان چلا ہے کہیں نقصان اٹھایا ہے ہم نے
از خود

گہرے سیاہ بادل آسمان کا احاطہ کر چکے تھے۔ موسم ایک دم ہی خوشگوار ہونے کے در پر تھا۔ گہرے کالے بادل کیا چھائے معلوم ہونے لگا کے تاریکی چھانے لگی ہے۔ پرندے آسمان پر ادھر، ادھر اڑ رہے تھے۔
موسم کا حال بھانپ کر وہ اپنے مسکن کی جانب گامزن تھے۔ بالآخر پانی سے لدے بادل بوجھ اٹھانے سے قاصر ہو گئے آسمان سے گرنے والے قطرے پیاسی زمین کو سیر اب کرنے لگے۔ آسمان سے گرتے قطرے موسیقی کی وہ دھن بنا رہے تھے جو شاید کوئی موسیقار بھی بنانے سے قاصر تھا۔ کچھ پل بادل زور و شور سے برستے رہے پھر بلا آخر بارش تھم گئی۔

ہر شے گل و گلزار ہو چکی تھی۔ نکھری زمین، روشن آسمان، چمکتے پودے اور گھاس۔ بارش کے قطرے شبنم کی مانند ہر گل پر اور ہر شجر پر ٹھہرے ہوئے تھے۔

جہاں سب خوش تھے وہیں ایک زینی تھی جس کا دل مچل رہا تھا۔ جی کر رہا تھا کہ جماعت کی کھڑکی سے باہر کود جائے اور بس اس بارش میں بھیگتی جائے۔ مگر اس کا خواب، خواب ہی رہ گیا۔

بارش چھٹی سے قبل ہی تھم گئی تھی۔ بوجھل دل لئے خود کو چادر سے ڈھانپے بستہ سنبھالے وہ اسکول کے گیٹ سے باہر نکلی۔

پھر جل تھل راستے دیکھے گہری سانس کھینچی۔

آج سمی کو اسکول سے جلدی لینے آ گئے تھے اس لئے اب اسے گھر اکیلے جانا تھا۔ خدا کا نام لئے اس نے گاؤں کے راستے پر قدم ڈال دیے۔ دل میں پل بھر کو خوف آیا مگر جب خوش گوار موسم دیکھا تو اس کا دل ہلکا ہوتا گیا۔ جب وہ یہ دیکھ لیتی کہ سڑک پر دور، دور تک کوئی نہیں ہے تو دو ایک بار ہوا کے سنگ جھومنے کی کوشش کرتی۔ گول، گول گھومتی وہ ہوا کی نمی محسوس کر رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں کھکھلاتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ دفعتاً اسے پاس کے لہلہاتے کھیتوں میں ایک خوبصورت بلی کا بچہ نظر آیا وہ بہت خوبصورت تھا۔ تھوڑی دیر وہ کھڑی اسے دیکھتی رہی تو وہ کھیتوں سے پگڈنڈی پر چلا آیا تھا۔ وہ اس کے قریب چلی آئی مگر وہ اس سے چونکہ مانوس نہیں تھا تبھی تیزی سے دوسری جانب ہوا۔ دور سے دھواں اڑاتی ایک گاڑی چلی آ رہی تھی۔ زینی جلدی سے اس بلی کے بچے کی جانب بڑھی مگر اس سے پہلے اسے پکڑ پاتی وہ جیپ اسے کچل چکی تھی۔ ہلکی سی کرب ناک آواز اور پھر گہری کان پھاڑ خاموشی ساتھ ہی ٹائروں کے چرچڑانے کی آواز آئی۔ زینی آنکھیں پھاڑے بس خاموشی سے سرخ ہوتی زمین دیکھ رہی تھی۔ سرخ مائع جا بجا پھیل رہا تھا۔ زینی کی آواز گویا حلق میں اٹک گئی تھی۔ نظروں کے سامنے وہ اچھلتا کودتا بلی کا بچہ آیا جبکہ اب سامنے موجود بس ایک بے جان بچہ تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر آ بیٹھی۔ نظریں

جھکائے اس نے آنے والے کو دیکھنا بھی گوارا نا کیا۔ کوئی اس کی جانب چلا آرہا تھا مگر وہ یونہی لب سیئے بیٹھی تھی۔ اس لاش اور اس کی اپنی آنکھوں کے درمیان کھیڑی میں مقید پاؤں حائل ہو گیا اب آنکھیں وہ دردناک منظر دیکھنے سے قاصر تھیں۔ دھیرے سے نظریں اٹھا کر اوپر دیکھا۔ کلف لگے کڑکڑاتے سوٹ میں ملبوس سفیر پوری وجاہت سے مسکرا رہا تھا۔ اس نے سر واپس نیچے کر لیا۔

"السلام علیکم۔۔۔ کیا حال ہیں جناب کے؟ کیا مزاج ہیں؟"

کوئی افسوس، کوئی غم، کوئی دکھ اس کے لہجے میں موجود نہیں تھا۔ اپنی سوچ پر وہ دل ہی دل میں استہزایہ انداز میں ہنسی۔ کس سے رحم کی توقع کر رہی تھی وہ؟ ایک سنگدل، بے رحم انسان سے۔

سفیر چند لمحے یونہی اسے زمین پر بیٹھا دیکھتا رہا۔ وہ اس کی جانب دیکھ کیوں نہیں رہی تھی؟ ایک معمولی بلی کے بچے کی موت کو وہ سر پر کیوں سوار کیے ہوئے تھی۔ اس نے نخوت سے فاصلے پر مرے پڑے بلی کے بچے کو دیکھا۔ پھر سر جھٹکا۔

"اے چھوکری اٹھ۔"

وہ مونچھوں کو تاؤ دیے سخت لہجے میں بولا۔ سن بیٹھی زینی کے وجود میں ہلچل ہوئی۔ سائیں سے پنگا لینے میں بھی اسی کا نقصان تھا اور جواب دینے پر بھی۔ سو خاموشی سے کھڑی ہوئی اور سپاٹ انداز بغیر ادھر ادھر دیکھے چلنے لگی۔ بمشکل دو قدم اٹھائے تھے جب سفیر نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ تھامے اسے اپنی جانب کھینچا۔ وہ کسی کٹی شاخ کی مانند ایک لمحے میں اس سے آ ٹکرائی۔ سنبھل کر فاصلہ قائم کیا۔ اسے اس گرفت میں عجیب سی کراہیت محسوس ہوئی۔ کچھ عجیب تھا۔ وہ گرفت عام ہرگز نہیں تھی۔ اس نے بے چین ہو کر خود کو آزاد کروانا چاہا مگر بے سود۔ پہلی بار کی طرح اب پھر وہ اسے بے بس کر رہا تھا۔

"ایک بلی کا بچہ تھا۔ عام سا، تو کیوں اپنا من ہلکا کر رہی ہے۔"

سفیر کا انداز عام تھا مگر زینی کو لگا طنز کے تیر چلائے جا رہے ہیں شاید وہ اس کی بے بسی سے لطف اٹھا رہا تھا۔ زینی نے ایک بار پھر اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ سفیر کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"شکار کا مزہ تب تک نہیں آتا جب تک شکار بے بس نا ہو جائے۔ خود آئے گی تو میرے پاس۔ آج تو بس تجھے ملنے آیا تھا۔"

جھک کر اس کے کانوں کے پاس بڑبڑایا پھر گرفت ڈھیلی کر دی۔ موقع پاتے ہی وہ بغیر اس پر دوسری نظر ڈالے کچی پگڈنڈی پر دوڑنے لگی۔ وہ بس سفیر کی نظروں سے پیچھا چھڑوانا چاہتی تھی۔ اس کی مکروہ ہنسی سے دور جانا چاہتی تھی۔ کانوں میں اس لہجے کی بازگشت جاری تھی۔ سفیر اسے پل، پل دور جاتا دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے قدموں کی دھول بھی باقی نا رہی۔

☆☆☆☆☆

مرغ کی بانگ نے صبح کا آغاز کر دیا تھا۔ سنہری صبح وادی پر اترنے لگی۔ گاؤں کی گلیوں میں پھوپھوٹنے کے بعد ہی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ کہیں جانوروں کو لئے لوگ نکل چکے تھے تو کہیں واپس لوٹ رہے تھے۔ کسان اپنی فصلوں کو نکل گئے تھے اور محنت کش روزی کے حصول کو جانے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ ہر گھر سے دھواں اٹھتا نظر آ رہا تھا۔ چولہے جلا لئے گئے تھے۔ ایسے میں فضا میں پرندوں کا ایک غول اڑتا وادی کے قریب پہنچا۔ قریب سے دیکھنے پر علم ہوتا کہ وہ کبوتر تھے جو ناک کی سیدھ میں پر پھیلائے سامنے بنے مکان کی جانب گامزن تھے۔ گاؤں کے لوگ اپنے کام میں مصروف رہے، جانتے تھے آج بھی ان کی منزل وہی گھر ہے۔ وہ کبوتروں کا غول پوری شان و شوکت سے جا کر اسی منڈیر پر آ بیٹھا۔ منڈیر پر صبح کی دودھیا روشنی پھیلنے لگی تھی۔ کبوتروں کی گردن بھی حرکت میں آ چکی تھی۔ وجہ صحن میں جھاڑو لگاتی زینی تھی۔ کمر پر دوپٹہ باندھے وہ مصروف سے انداز میں جھاڑو لگانے میں مصروف تھی۔ اٹاری سے دھواں نکل رہا تھا اور صحن میں پراٹھوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ دیسی گھی سے چپکتے

خستہ پر اٹھے۔ کونے کے کمرے سے قمر نکلا وہ یونیفارم پہنے تیار تھا۔ کچھ ثانیے غیر محسوس انداز میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا اس کی جانب دیکھتا رہا جو اس کی نظروں سے انجان اپنے کام میں مصروف تھی۔ لمبی چوٹی کمر پر لہرا رہی تھی۔ کچھ شریر لٹیں چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ اسے یوں مصروف سے انداز میں گھر کے کام کرتا دیکھ کر قمر کے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ وہ سر جھٹک کر مسکرایا جب ساتھ کے کمرے سے مرتضیٰ نکلا۔ وہ ڈیرے جانے کو تیار تھا۔ سفید شلوار قمیض اور خاکی شال کندھوں پر ڈالی گئی تھی۔ آنکھیں سنجیدہ جب کہ ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ قمر کو دیوار کے ساتھ گم سم کھڑا دیکھ کر وہ پہلے تو حیران ہوا پھر اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو مسکراہٹ دبا گیا۔

"میری بہن کو تاڑ رہے ہو بے شرم۔"

وہ ذرا رعب سے بولا تو جھاڑو لگاتی زینی بھی چونکی۔ جھاڑو کونے میں رکھے وہ ہاتھ جھاڑتی سنک کی جانب چل دی۔ قمر نے شرمندہ ہوتے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اسے مرتضیٰ کے آنے کی خبر ہی نا ہو سکی۔

"ننن۔۔۔ نہیں تو میں تو کب۔۔۔ ہاں کبوتر دیکھ رہا تھا۔"

مرتضیٰ نے مسکراہٹ ضبط کی پھر ایک نظر اسے دیکھا اور اٹاری کی جانب چل دیا۔

"پھوپھی۔۔۔ قمر کہتا مجھے بھوک نہیں ہے۔"

وہ جانتا تھا قمر پراٹھے کا کتنا شوقین ہے تبھی جان بوجھ کر اس کا منہ کھلوانا چاہا۔ ساتھ ہی نیچے بچھی چٹائی پر بیٹھ گیا۔

"اچھا نا کھا۔"

رومانہ نے لاپرواہی سے کہا ساتھ ہی ایک بھرپور نظر مرتضیٰ پر ڈالی جو سر جھکائے مسکرا دیا۔ رومانہ بھی شرارت سمجھ گئیں۔

"امی۔۔۔ یہ لالہ جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ لالہ۔۔۔"

اس نے مڑ کر مرتضیٰ کو ٹہوکا دیا۔ تبھی وہ بھی اٹاری میں چلی آئی۔ اسے آتا دیکھ کر قمر نے چپ سادھ لی کیوں کہ پیچھے ہی گل شیر بھی تھے۔ زینی مرتضیٰ کے قریب ہی جا بیٹھی۔ رومانہ نے ہاٹ پاٹ اٹھا کر ان کے درمیان دھرا۔

"زینی چائے نکال پیالوں میں۔"

مڑ کر زینی کو مخاطب کیا تو وہ سر ہلاتی ایک بار پھر اٹھی اور دوسرے چولہے پر پڑی چائے کی پتیلی کپڑے کی مدد سے اٹھا کر نیچے رکھی پھر اسٹینڈ پر پڑے کپ اٹھا کر ترتیب میں چننے لگی۔ گل شیر نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"پتری تو نے اسکول نہیں جانا؟"

زینی نے سر اٹھا کر خاموشی سے ان کی جانب دیکھا پھر سر جھکا گئی۔ وہ کل کے واقع کے بعد سے شدید خوف کے زیرِ اثر تھی وجہ سفیر کا ظالمانہ انداز تھا۔ رومانہ پراٹھا سینک رہی تھی۔ مڑ کر اسے دیکھا جو سر جھکائے چائے کپ میں نکال رہی تھی۔ پھر گل شیر کی جانب دیکھا جس کے ساتھ بیٹھا مرتضیٰ بھی جواب کا منتظر تھا۔

"پتا نہیں کل سے یونہی خاموش ہے۔ کہتی ہے میری طبیعت نہیں ٹھیک اس لئے اسکول نہیں جانا۔"

چائے کپ میں انڈیلتے اس کے ہاتھ لحظہ بھر کو کانپے مگر جلد اس نے لغزش پر قابو پالیا۔

"خیریت ہے زینی؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟"

مرتضیٰ کے سوال پر یک بارگی سے اس کا دل دھڑکا۔ اب کی بار لغزش ایسی تھی کہ گرم چائے ہاتھ پر چھلک گئی۔ وہ بلبلا کر رہ گئی۔ تکلیف حد سے سوا تھی۔ فوراً ہی آنسو عارضوں پر بہہ نکلے۔ رومانہ نے جلدی سے توا چولہے سے اتار کر نیچے رکھا۔

"آئے ہائے۔۔۔ ستیاناس"

وہ تیزی سے اٹھیں ساتھ ہی اس کو اٹھایا۔ قمر کا نوالہ ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ مرتضیٰ جانچتی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا جیسے اس کے ذہن میں چلتی ہر پریشانی کو بھانپنے لگا ہو۔

"ٹھنڈے پانی کے ٹب میں ڈبو دے ہاتھ۔"

گل شیر تیزی سے بولا۔منڈیر پر بیٹھے کبوتر بھی پریشان ہو چکے تھے۔جہاں پریشان تھے وہیں خوش بھی تھے کہ آج سارا دن زینی ان کے سامنے رہے گی۔مرتضیٰ کی جانچتی نظریں ابھی تک اس کی طرف متوجہ تھیں۔

☆☆☆☆☆

یونیورسٹی میں آج خاصی چہل پہل تھی۔وجہ یہ تھی کہ آج نیو ایڈمشن سٹوڈنٹ آنے تھے۔سینئر تو کمر کس کر میدان میں اتر چکے تھے۔بھئی یہ دن روز،روز تھوڑی آتے ہیں؟جونیئر بیچارے بے فکروں کی طرح یونیورسٹی آرہے تھے وہ اپنی بلائی جانے والی شامت سے بے خبر تھے جو کچھ ہی دیر میں بلائی جانی تھی۔زعیم اور صائم آج مکمل تیاری کے ساتھ آئے تھے۔بلاک میں وقفے،وقفے سے کوئی ایک ادھ چیخ سنائی پڑتی۔یہ معصوم اور برداشت نہ کرنے والی سیدھی سادھی عوام تھی جن کی چیخیں چھوٹی،چھوٹی باتوں پر بلاوجہ ہی نکلتی رہتی تھیں۔

زعیم گیٹ کے قریب ہی بینچ پر بیٹھا تھا اور صائم ارد گرد چکر کاٹ رہا تھا انہیں ابھی تک اپنا مطلوبہ شکار نہیں ملا تھا اور تبھی ارد گرد چکر کاٹتے صائم کی بلا ارادہ نظر گیٹ پر پڑی تو وہ چونک کر رکا۔آنکھوں میں شناسائی کی چمک آئی اگلے ہی لمحے اس نے بینچ پر بیٹھے زعیم کو جالیا۔

"زعیم وہی لڑکیاں۔"

زعیم کو موقع پر یاد نا آیا اس نے حیرانی سے صائم کی جانب دیکھا۔

"او بھائی؟کون سی لڑکیاں؟نام بتا مجھے یاد نہیں اتنی تو ہیں۔"

وہ دانت نکالتے ہوئے معصومیت سے بولا۔صائم نے ماتھا پیٹا۔

"ارے وہی مال والی لڑکیاں،وہ جڑواں بہنیں۔۔۔"

جڑواں کہنے کی دیر تھی زعیم ایک لمحے میں بینچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے سر ادھر ادھر گھمایا۔وہ انھیں بھولا نہیں تھا اب وہ بھولنے والی چیز ہی نہیں تھیں۔

"گیٹ کے پاس دیکھ بھائی۔ایک جیسے کپڑوں میں ہیں۔"

صائم نے اس کا سر گھما کر گیٹ کی جانب کیا۔گیٹ کے پاس ہی وہ دونوں کھڑی تھیں۔کچھ نروس،کچھ پر جوش۔تو یعنی وہ ان کی جونیئر تھیں۔زعیم نے پل بھر میں مڑ کر برابر کھڑے صائم کو دیکھا۔دونوں کے چہرے کی مسکراہٹ گہری ہوتی گئی۔اگلے ہی لمحے وہ ان دونوں کے سامنے تھے۔

"السلام علیکم"

شرافت کا عملی مظاہرہ کرتا یہ صائم تھا جب کہ اس کے کندھے پر ہاتھ جمائے کھڑا زعیم شرارتی نظروں سے صفا کی جانب دیکھ رہا تھا۔اس کے مسلسل دیکھنے پر صفا چڑ سی گئی۔

"کیا ہے؟"

صائم سے بات کرتی مروا بھی خاموش ہو گئی اور صفا کی جانب دیکھنے لگی جس کا چہرہ دھواں دار ہو چکا تھا اور اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ بڑے ضبط سے کھڑی ہے۔مسکراہٹ زعیم کے ہونٹوں پر رینگنے لگی۔سر جھکائے اس نے مسکراہٹ ضبط کی،پھر نظریں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا تو آنکھوں میں وہی چمک اور شرارت تھی۔

"یونیورسٹی کا پہلا دن ہے۔"

زعیم نے شرافت سے جھوٹ بولا۔صائم نے گردن موڑے اسے دیکھا اسی پل زعیم نے بھی گردن موڑے اسے دیکھا پھر آنکھوں سے اشارہ کیا جس کا مطلب سمجھتے ہوئے صائم نے مسکراہٹ ضبط کی۔مروا کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

"تو کیا آج آپ لوگوں کا بھی پہلا دن ہے؟"

اس نے چہکتے ہوئے لہجے میں پوچھا جبکہ صفا بازو سینے پر باندھے کھڑی تھی۔ سوالیہ نظریں ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔

"نہیں دنیا میں آئے تو بائیس برس بیت گئے ہیں۔ ہاں مگر یہاں پہلا دن ہے۔ اس اجنبی، بھری دنیا میں ہمیں کوئی اپنا نہیں مل رہا تھا اور تبھی ہماری نظر گیٹ پر پڑی اور ہم نے آپ دونوں کو دیکھا یقین جانیں ایسا لگا جیسے صحرا میں پیاسے کو پانی کا کنواں مل گیا ہو۔"

صائم کی مبالغہ آرائی جاری تھی جبکہ زعیم بھی اس کا بھرپور ساتھ دیتے ہوئے زور و شور سے سر ہلا رہا تھا۔ مروا تو ان کے کہے پر ان کے تاثرات دیکھ کر ایمان لے آئی ہی جب کہ صفا کشمکش میں تھی۔

"ہمیں تو ریگنگ کا خوف کھا رہا ہے۔"

زعیم نے ترچھی نگاہوں سے صفا کی جانب دیکھتے ہوئے پریشانی سے کہا۔

"میں نے سنا ہے یہاں ریگنگ بہت سخت ہوتی ہے۔"

صفا کچھ متاثر ہو کر بول پڑی۔ زعیم نے بڑے ضبط سے مسکراہٹ دبائی۔ شیرنی قابو میں آ رہی تھی۔

"توبہ۔۔۔ توبہ۔۔۔"

صائم نے دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے ایک دم کہا تو صفا اور مروا حیرانی سے اسے دیکھنے لگیں۔

"میرا مطلب ہے کہ سخت نا کہیں جابر یا بہت سخت کہہ لیں۔"

پریشان صورت بنائے اس نے جملہ مکمل کیا۔ صفا اور مروا دونوں کے چہروں کی ہوائیاں اڑ چکی تھیں۔

"حالات بہت خراب ہیں ابھی ایک لڑکی اتنی خوش اندر گئی تھی اور اب جب باہر آئی تو رو رہی تھی اس پر رنگ پھینکے گئے تھے۔"

زعیم نے ٹکڑا لگایا۔ صائم نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور آٹا بھی پھینکا تھا اس کے بال خراب ہو چکے تھے۔"

صائم کے انکشاف پر دونوں کے ہاتھ بیک وقت اپنے بالوں پر جا ٹھہرے۔

"اب؟"

صفا پریشانی سے بولی۔ زعیم کچھ پل سوچنے کی اداکاری کرتا رہا پھر ایک دم ہی خوش ہو کر تالی بجائی۔

"میرا ایک کزن یہاں سینئر ہے۔ وہ ہمیں ایک سیف کمرے میں بند کر دے گا اور جیسے ہی کلاسز کا آغاز ہو گا وہ ہمیں باہر نکال لے گا یوں ہم ریگنگ سے بچ جائیں گے۔"

"ہاں یار توصیف نے کہا تھا میرے ذہن سے یہ بات کیسے نکلی۔ شکر ہے تجھے یاد آ گئی۔"

صائم نے ایسے کہا کہ گویا زعیم نے اس پر احسانِ عظیم کر دیا ہو جس کا قرض وہ اتار ہی نہیں سکتا تھا۔ صفا اور مروا کچھ پل کشمکش میں رہیں۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ جلدی کریں۔"

بلا آخر مروا بول اٹھی۔ زعیم نے فون نکالا جس کے ذریعے اسے ناٹک کرنا تھا۔ پھر بڑی ہی ادا سے ایکسکیوز کرتا ایک جانب چلا گیا چند منٹ تک فون کان کو لگائے سر ہلاتا رہا پھر مسکراتے ہوئے فون بند کیا اور ان کی جانب تیزی سے چلا آیا۔

"جلدی چلیں۔"

ایسے قدموں میں برقی بھری جیسے پیچھے طوفان آ رہا ہو۔ وہ تینوں بھی اس کے ساتھ ہو لیے۔ تین چار چکر کاٹنے اور ادھر، ادھر گھومنے کے بعد وہ یونیورسٹی کے اس حصے کی جانب چلے آئے جو بہت کم استعمال ہوتا تھا۔ وہاں ایک کمرہ بنا ہوا تھا۔ یہ کمرہ پریئر روم کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔ آج کل یہاں کی مرمت چل رہی تھی اس لئے یہ حصہ بند تھا اور آج یونیورسٹی میں نئے آنے والے طالبات کے سبب مزدور بھی چھٹی پر تھے۔ زعیم نے صائم کی طرف

مسکراہٹ اچھالی۔ جس نے ہاتھ سے اشارہ کیا مطلب یہی تھا کہ بھائی سب تیاری مکمل ہے۔ دروازے کے پاس رک کر زعیم ایک جانب ہوا۔ صائم نے کنڈی کھولی۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ چونکہ اندر ضروری سامان نہیں تھا اس لئے یہاں کا لاک نہیں لگایا جاتا تھا۔

"یہاں ہم محفوظ رہیں گے نا؟"

صفا نے اندر جانے سے قبل تصدیق چاہی۔

"میں کہتا ہوں ٹینشن ہی نہیں لینی آپ دونوں نے۔"

زعیم نے انھے مکمل مطمئن کرنا چاہا۔ وہ سر ہلائے اندر داخل ہوئیں۔ ان کے اندر داخل ہونے کی دیر تھی زعیم کے اشارے پر دروازہ تھامے کھڑے صائم نے پل بھر میں ہی دروازہ کھینچ دیا۔ وہ دونوں ابھی تک صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر جو سمجھ آیا وہ بہت خطرناک تھا۔ اگر یہ مذاق تھا تو بے ہودہ تھا۔ ہوش تب آیا جب کنڈی لگنے کی آواز آئی۔

"سلامت رہو جونیئرز۔۔۔"

چہکتے نعروں نے انھے بتایا کہ وہ بہت برا پھنسی ہیں۔ انہوں نے مڑ کر ادھر ادھر دیکھا۔ اندر گپ اندھیرا تھا۔ کچھ روشنی اوپر بنے روشن دان سے اندر آ رہی تھی۔ شاید یہاں کی لائٹ خراب تھیں۔ ہوش میں آتے ہی وہ دونوں چلانے لگیں۔ مگر اب کیا فائدہ تھا وہ دونوں شیطان تو انھیں وہاں بند کیے گیٹ کی جانب جا رہے تھے اس ویرانے میں دور، دور تک کوئی ان کی آواز سننے والا نہیں تھا۔ صفا کے مطابق سب سے بری ریگنگ ان کے ساتھ ہوئی تھی۔

"ان پر یقین تم نے کیا۔ تمہاری وجہ سے یہ ہوا۔"

صفا اپنے بیگ سے مروا کو پیٹنے لگی۔

"میری وجہ سے؟ شاباش مس صفا کیا کہنے۔۔۔؟ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے؟"

مروا نے اس کا بیگ کھینچ کر زمین پر پٹخا۔

"موبائل ہے تمہارے پاس؟"

مروا نے ایک دم چونکتے ہوئے پوچھا ساتھ ہی جھک کر بیگ اٹھایا۔

"کہاں؟ تم نے کہا تھا پہلا دن ہے برا تاثر نہ پڑ جائے اس لئے میں نے گھر ہی چھوڑ دیا۔"

مروا نے اسے گھورا۔ وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ایک دم ہی کسی قہقہے کی آواز سنی یوں لگتا تھا کوئی چڑیل ہنس رہی ہے۔ دونوں کا چہرہ خطرناک حد تک پیلا پڑ گیا۔

"وعدہ کرتی ہوں یہاں سے زندہ نکلی تو ان دونوں بھائیوں کو ایسا سبق سکھاؤں گی کہ ہمیشہ یاد رکھیں گے کہ صفا اور مروا کیا چیز تھیں۔"

یہ صفا تھی جس کا بس نہیں چل رہا تھا ابھی وہ دھوکے باز اور جھوٹے، مکار آدمی اس کے سامنے ہوتے اور وہ ان کے ساتھ نا جانے کیا کر بیٹھتی۔

☆☆☆☆☆

موسم نے انگڑائی لی اور یکایک ہی بادل برسنے چلے آئے۔ خوب بارش کے بعد آسمان دو رنگوں میں ڈھل گیا کچھ سرمئی اور کچھ نیلے رنگ میں۔ پرندے ایک بار پھر پر پھیلائے محو پرواز ہو چکے تھے۔ ہر شے گل و گلزار ہو چکی تھی۔ ٹھنڈی ہواؤں نے روح کو فرحت کا احساس بخشنا شروع کر دیا ایسے میں ڈیرے کا ہر گل، ہر شاخ اور ہر ڈال پر بارش کے قطرے پڑے ایسے معلوم ہوتے گویا کسی سنار نے ہیرے اور موتی جڑ دیے ہوں۔ گھاس کی ہریالی کچھ مزید بڑھ گئی تھی۔

ایک چھجے تلے تپائی ڈالی گئی تھی جس پر خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ ساتھ حقہ پڑا تھا جس میں دہکتے کوئلے چند لمحے پہلے ہی ڈالے گئے تھے۔ تبھی ان کے چٹخنے کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔ تپائی پر نیم دراز سفیر

آنکھیں سکیڑے جانوروں کے پنجرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ پھر نظروں کا زاویہ وہاں سے ہٹ کر روش پر آرکا۔ جہاں گیٹ کھلنے کے پانچ منٹ بعد ایک گاڑی داخل ہوئی تھی۔ گاڑی کا دروازہ کھولے بخش باہر نکلا۔ سر کو ہلکا سا خم دیے سفیر کو سلام کیا۔ پھر گھوم کر دوسری جانب کا دروازہ کھولا اور جھک کر سامان نکالنے لگا وہ ابھی حویلی سے سفیر کا کھانا لے کر آیا تھا۔ کھانے کے شاپر ایک ملازم کو تھما کر وہ سفیر کی جانب چلا آیا۔ سفیر کے پاس آنے پر اسے سفیر کے خراب موڈ کا علم ہوا تھوک نگلے وہ سفیر سے کچھ فاصلے پر پڑی ایک کرسی پر آ بیٹھا۔

"سس۔۔۔ سرکار خیر تو ہے آپ اتنے غصے میں کیوں ہیں؟"

اس نے لاتعلق بنتے ہوئے پوچھا سفیر نے حقے کی نال تھامی گہرا کش بھرا چند ثانیے خاموش رہا پھر دھواں فضا میں خارج کرتے سرخ آنکھوں سے اسے گھورا۔

"میں نے تجھے کیا کہا تھا؟ کیا کام سونپا تھا؟ تجھے بولا تھا کہ اس چھوکری کی ہر خبر دے پھر تو کہاں مرا ہوا تھا دو روز سے کہ مجھے خبر ہی نا دی میری حکم عدولی کی؟"

سفیر کا لہجہ بے لچک اور سخت تھا۔ بخش کو اپنی جان جاتی محسوس ہوئی۔

"معذرت سرکار"

"وہ چھوکری دو دن سے سکول نہیں آ رہی؟ کیوں؟ تو نے مجھے بتانا ضروری سمجھا۔"

اس کی بات کاٹ کر سفیر نے اپنی بات جاری رکھی بخش نے سر جھکا دیا وہ نادم نظر آتا تھا۔

"سرکار معاف کر دیں میں دو روز سے حویلی کے کاموں میں مصروف تھا۔ بڑے سرکار کا حکم تھا کہ زمینوں کے سارے کاغذات ان کے سامنے پیش کیے جائیں بس ان کاغذات کی پیشی میں بہت مصروف تھا۔ مجھے وقت ہی نہ ملا کہ اس چھوکری کی کوئی خبر نکلواتا۔"

وہ سر جھکائے بول رہا تھا۔ سفیر اسے چند لمحے اسے دیکھتا رہا واقعی وہ پچھلے دو دنوں سے بہت مصروف تھا۔ سفیر کچھ نرم پڑا۔

"تم ان کے نہیں تم میرے ملازم ہو، کوشش کیا کرو کہ میرا کام ہمیشہ پہلے کرو۔"

اس کے لہجے میں ہلکی سی تپش تھی جو بخش کو شدت سے محسوس ہوئی۔ ہاتھوں کو باہم مسلتے ہوئے اس نے سر اثبات میں ہلایا۔

"جو حکم سرکار بولیں تو ابھی جا کر خبر نکلواؤں؟"

اس نے مؤدب انداز میں پوچھا۔ سفیر نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"اب اس سے روبرو ملاقات کل ہی ہو گی اور اگر کل بھی نہ ہو پائی تو مجھے دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

اس کے لہجے میں ہلکی، ہلکی تپش اب تک موجود تھی۔ بخش نے اثبات میں سر ہلایا تب تک ملازم کھانا لے آئے تھے جس کی اشتہا انگیز خوشبو نے سفیر کو حقہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

☆☆☆☆☆

یہ آواز کسی چڑیل کی نہیں تھی یہ اس الارم کلاک کی آواز تھی جو وہ دونوں یہاں لگا کر گئے تھے۔ رونے کے سبب مروا کا کاجل بہہ نکلا تھا۔ انھیں یہاں بند ہوئے نہ جانے کتنا وقت ہو گیا تھا۔ نہ جانے وہ کتنی بار دروازہ بجا چکی تھیں، وہ کتنا چیخ، چلا چکی تھیں لیکن کوئی بھی اس جانب نہ آیا۔ صفا تو ہمت سے کام لے رہی تھی جبکہ مروا دل چھوٹا کیے بری طرح رو رہی تھی۔

"مروا میں نے اب دو لگانی۔۔۔"

صفا کی بات تب ادھوری رہ گئی جب کنڈی کھلنے کی آواز آئی اور چند لمحے بعد ہی دروازہ کھلا۔ چوکھٹ کے پار کھڑے صائم نے دانت نکوسے۔

"معذرت مگر میں آپ دونوں کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا تھا تبھی زعیم سے چھپ کر یہاں چلا آیا۔ آپ دونوں باہر آجائیں مگر زعیم کو مت بتایئے گا کہ یہاں سے میں نے آپ کو نکالا ہے۔"

صائم کا ننھا سا دل یہ دکھ برداشت نہیں کر پایا تھا۔ نتیجتاً وہ یہاں تھا۔ صفا کے تنے نقوش ڈھیلے پڑے۔ مروا نے بھی آنسو پونچھے اور فوراً سے بیگ اٹھائے باہر نکل آئی صفا بھی اپنا بیگ اٹھائے اس کے پیچھے ہی آگئی۔

"کچھ دیر پہلے مجھے لگ رہا تھا کہ آپ بہت برے ہیں مگر اب لگتا ہے کہ آپ بہت اچھے ہیں۔"

مروا چہکتے لہجے میں بولی۔ صفا خاموش کھڑی تھی۔ صائم کے مسکراتے لب مزید پھیل گئے مروا اس کے برابر سے ہو کر آگے بڑھ گئی جب کہ صفا نے قریب سے گزرتے ہوئے آہستہ لہجے میں کہا۔

"زعیم کی خیر نہیں اب۔ وہ جانتا نہیں ہے ابھی مجھے"

پھر ایک نظر صائم پر ڈالے خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ صائم خاموشی سے رخ موڑے انہیں پل، پل دور جاتا دیکھ رہا تھا۔ در حقیقت اسے زعیم کے لیے افسوس بھی ہو رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

رات مزید تاریک ہوتی جا رہی تھی۔ آسمان پر تارے ایسے موجود تھے گویا کسی نے کالی چادر پر افشاں الٹ دیا ہو ۔ تا حد نگاہ پھیلے آسمان کی وسعت ناپنا ناممکن تھا۔ رات کی فسوں خیز خاموشی اور تاریکی، دونوں کا ساتھ بہت پرانا تھا۔ رات عاشقوں کے لئے بہت معنی رکھتی ہے کہ جب بستر پر لوٹیں، دن بھر کی سب پریشانیاں ختم ہو جاتی ہیں اور رہ جاتی ہے تو یادِ یار۔۔۔ جو انھیں رلاتی ہے، تڑپاتی ہے تو کسی کو مسکرانے پر مجبور کرتی ہے۔

مگر کشف کے معاملے میں ایسا نہیں تھا کہ وہ تو اس محبت سے ابھی واقف ہوئی تھی۔ ہجر کے لمحے اور لمبی سیاہ راتوں سے اب جا کر واقفیت پا سکی تھی۔ فراق یار کی بارش اور وصالِ یار اس کے نصیب میں تھا یا نہیں وہ اس بات سے ناواقف تھی وہ سب قسمت پر چھوڑے اپنا فرض ادا کر رہی تھی جو اسے ادا کرنا تھا، مرتضیٰ سے محبت۔ یہ محبت اس

پر حق رکھتی تھی اور وہ فرض ادا کرنے پر مجبور تھی۔ یہ اس کے لئے مجبوری ہر گز نا تھی۔ یہ اس کا امتحان تھا جہاں ہجر، عذاب ہر منزل کو پار کیے اسے مرتضیٰ تک پہنچنا تھا۔

دل تیری نظر کرم کو ترستا تو کیا کرتے
تو پاس سے انجان بن کر گزرتا تو کیا کرتے
تو کہنے کو قریب تھا ہمارے مگر
تو پاس ہو کر پاس نہ تھا تو کیا کرتے
تجھے پانے کی جستجو میں مر گئے ہم
تو پھر بھی نا ملا ہمیں تو کیا کرتے؟

از خود

وہ چند لمحے یونہی کروٹیں بدلتی رہی مگر جلد ہی اس کھیل سے اکتا کر بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آج مرتضیٰ یہیں حویلی میں ٹھہرا تھا۔ ایسا کیسے ممکن تھا کہ وہ اس کے اتنے قریب تھا اور نیند اس پر مہربان ہو جاتی۔ کمبل ہٹا کر وہ آہستہ سے بستر سے اتری۔ مومی پاؤں ٹھنڈے فرش پر جمائے تو یک لخت ہی سردی کی شدید لہر اس کے بدن میں سرایت کر گئی۔ وہ کپکپا کر رہ گئی۔ جھرجھری لیے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سفید کھلی شلوار قمیض پہنے اس نے بھورے بالوں کی آبشار کھول رکھی تھی۔ صوفے پر پڑی خاکی چادر اٹھا کر لپیٹی اور آہستگی سے اپنے پیچھے دروازہ بند کیے وہ راہداری میں نکل آئی۔ ہلکے قدم اٹھاتے وہ سیڑھیاں اترتی نیچے چلی آئی۔ سامنے لاؤنج تاریک اور خاموش پڑا تھا ۔لاؤنج کی گھڑی بارہ بجا رہی تھی۔ اس کی نظر گھڑی سے ہٹی اور اس کھڑکی پر آ جمی جو زنان خانے کی واحد کھڑکی تھی جس سے باہر بڑا لان نظر آتا تھا۔ چونکہ حویلی اور لان فاصلہ رکھ کر بنائے گئے تھے اس لئے کھڑکی سے دیکھنے

پریوں معلوم ہوتا گویا لان بہت نیچے ہے۔وہ آہستگی سے وہاں آ کھڑی ہوئی۔ مخروطی انگلیوں نے پردے کو سرکایا تو وہ ایک جانب ہو گئے۔اب باہر کا منظر نظر آ رہا تھا۔لان میں کوئی ذی روح نا تھا۔ مکمل خاموشی اور سکون تھا۔لان میں چلتی روشنیاں اندر تاریک لاؤنج کو بھی روشن کرنے لگی تھیں۔ایسے میں کھڑکی کے پاس کھڑی وہ حسن کی مورت بھی نظر آ رہی تھی۔وہ گہری سوچ میں غرق تھی جب اس کی نظر اچانک لان میں پڑی جہاں مرتضیٰ سرونٹ کوارٹر سے نکلا تھا اور خاموشی سے باہر لان میں چہل قدمی کرنے لگا تھا۔ کشف کی نگاہیں بھی اس کے ساتھ ہی ہر فاصلہ طے کر رہی رہیں۔وہ کسی گہری سوچ میں مگن نظر آتا تھا۔بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔وہ بھوری شال زیادہ استعمال کرتا تھا شاید اسے یہ رنگ بہت پسند تھا۔ مرتضیٰ کی نظر ابھی تک اس پر نہیں پڑی تھی جو دل تھامے اس کی راہ میں کھڑی تھی۔

مرتضیٰ خیالوں سے نکلا تو ایک عجیب سی کشش نے اسے روک دیا۔اسے کسی کی نظروں کی کشش محسوس ہوئی۔ اس نے ایک دم چہرہ موڑے بائیں جانب دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا پھر گردن موڑے حویلی کی جانب دیکھا۔پر شکوہ عمارت پوری آب و تاب سے کھڑی تھی۔وہ یہاں کھلی ہوا لینے آیا تھا۔اسے کل سے زینی کا رویہ پریشان کر رہا تھا۔وہ گھر جانا چاہتا تھا مگر سفیر نے آج اسے حویلی روک لیا تھا کیوں کہ اسے صبح ہی صبح مرتضیٰ کو شہر بھیجنا تھا۔ تھوڑی دیر کی چہل قدمی کے بعد وہ اندر جانے کو مڑنے ہی لگا جب اس کی نگاہ زنان خانے کی واحد کھڑکی پر پڑی۔وہاں رات کے اس پھر کھڑی لڑکی کوئی اور نہیں کشف ہی تھی۔ ہوا کے دوش پر اس کی زلفیں اڑ رہی تھیں۔بلاشبہ وہ حویلی کی اکلوتی لڑکی تھی اور شاید اسی لئے سارا حسن اسے مل گیا تھا۔اس کا دیدار مرتضیٰ پر بھاری پڑا تھا۔پہلی مرتبہ مرتضیٰ نے حویلی کی کسی عورت کو بغیر نقاب کے دیکھا تھا۔شال سے خود کو ڈھانپے وہ موسم سے بے نیاز کھڑی یک ٹک اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔اس کی نظروں میں جو پیام تھا وہ کئی فاصلے پر کھڑے مرتضیٰ کو

بخوبی سمجھ آ گیا تھا۔ جو وہ سمجھ رہا تھا وہ اسے سمجھنا نہیں تھا۔ جس راستے پر کشف چل پڑی تھی وہ راستہ ٹھیک نہیں تھا اسے کشف کو وہاں سے واپس لانا تھا۔ چاہے زبردستی ہی صحیح۔ وہ جانتا تھا یہ ناممکن ہے۔

اس کی خود پر پڑنے والی نظریں کیا تھیں، کشف کو لگا ساری دنیا کی خوشیاں اس کی جھولی میں ڈال دی گئی ہیں۔ وہ ہواؤں میں اڑنے لگی۔ اسے یہ موسم پہلے کبھی اتنا حسین معلوم نہیں ہوا تھا۔ مگر آج جیسے موسم بھی اس کے ساتھ محوِ رقص تھا۔ اسے لگا یہ تارے، یہ رات، یہ زمین، یہ ہوا اور وہ خود محوِ رقص ہیں اور محور مرتضیٰ کی ذات ہے۔ محبت میں یہی تو ہوتا ہے، محبوب کی ذات کو محور بنا لیا جاتا ہے اور اسی کے گرد رقص لازم ہوتا ہے۔

وہ ابھی ان خوشیوں کو ٹھیک سے محسوس بھی نا کر پائی جب وہ سنگدل سب جان کر بھی انجان بننے واپس پلٹ گیا۔ کشف کو لگا کوئی تان ٹوٹی تھی۔ وہ محوِ رقص تھی مگر اب گھومتے، گھومتے زمین پر آ گری تھی۔ یک دم ہی رات اس کے لئے مزید تاریک ہو گئی۔ چاند کی بچی روشنی بھی جیسے مانند ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں جلتی قندیلیں بھی بجھ گئیں۔ ٹھنڈ سے برف ہوئے سرخ و سپید گالوں پر گرم سیال بہہ نکلا۔ ایک کے بعد دوسرا اور پھر جیسے آنسوؤں کو نکلنے کا راستہ مل گیا تھا۔

میری زندگی تو کچھ نہیں
تیری یاد کا کمال ہے
کہ آتی جاتی سانس کو بھی
تیری نظرِ کرم کا سوال ہے
(از خود)

☆☆☆☆☆

کیس مکمل ہو چکا تھا اور وہ گینگ کے سربراہ کو گرفتار بھی کر چکا تھا۔ گرفتار کیا کرنا وہ تو نقلی انکاؤنٹر میں اس کی جان بھی لے چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دو، تین سال یہ کیس چلے گا، اس کا فیصلہ سنایا جائے گا، آٹھ سال کی قید ہو گی اور اس کے بعد وہ آزاد ہو جائے گا۔ ایک بار پھر وہ باہر نکلے گا اور پھر سے وہی کام دوبارہ کرے گا وہ ایک عادی مجرم تھا اور بہرام جانتا تھا کہ عادی مجرم چاہے جو بھی کر لے اپنی عادت چھوڑ نہیں سکتے۔ وہ یہ بھی بخوبی جانتا تھا کہ وہ اپنے پیچھے نہ جانے کتنے لوگوں کو یہ تجربہ سیکھا آیا تھا، اب نہ جانے کتنے لوگوں کو دوبارہ سے اس کا گینگ سنبھالنا تھا مگر وہ یہ جانتا تھا کہ اب یہ سلسلہ کم از کم کچھ سال کے لیے تھم جائے گا۔ وہ یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ کیس چلنے اور سزا ہونے کے بعد وہ دوبارہ سے رہا ہو جائے۔ اس کے نزدیک یہ فرض کے ساتھ غداری تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر اللہ نے انسان کو کچھ بہتر کرنے کا موقع دیا ہے اور عہدے سے نوازا ہے تو وہ اپنا بہترین دینے کی کوشش کرے۔

وہ ایک ہفتے کی لیو لے کر سوات واپس جانا چاہتا تھا۔ وجہ قاسم کی شادی تھی قاسم اس کا جگری دوست تھا۔ بیشک وہ گاؤں کا عام لڑکا تھا مگر اس سے بہرام کی دوستی بہت پرانی تھی۔ پورے گاؤں میں وہ واحد تھا جس سے بہرام کی دوستی تھی اور بہرام کسی صورت اس کی شادی مس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دوسرا یہ کہ اسے پرسوں قاسم کا فون بھی آیا تھا اور قاسم نے یہ بات کہی تھی کہ اسے ہر صورت شادی میں شرکت کرنی ہے اور وہ چاہ کر بھی اس کی شادی چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ اسے اب ہر صورت سوات واپس لوٹنا تھا۔ وہ چھٹی کے لیے درخواست جمع کروا چکا تھا اور اسے امید تھی کہ مثبت نتیجہ نکلے گا کیونکہ وہ کیس جیت چکے تھے اور اب اگر وہ شہر سے باہر بھی جائے گا تب بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کی جگہ تھانہ کوئی انسپکٹر بھی سنبھال سکتا تھا۔ نتیجہ اس کی امید کے مطابق نکلا اور اس کی درخواست قبول کر لی گئی تھی۔ وہاں درخواست قبول ہوئی یہاں اس نے رخت سفر باندھ لیا۔ گاڑی میں دھیمے سروں سے گانا چل رہا تھا۔ فراٹے مارتی گاڑی سڑک پر دھواں چھوڑتی جا رہی تھی۔ دوپہر تک گاڑی سوات کی

حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ حویلی والوں کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ گاؤں کے راستے سے گیا تو اس سے قبل اس کی آمد کی خبر حویلی پہنچ جائے گی۔ اسی لیے اس نے گاؤں کی حدود کے باہر کا راستہ چنا۔ یہ راستہ گاؤں کے اسکول کی راہ میں پڑتا تھا۔ چونکہ یہ چھٹی کا وقت تھا تو کئی طالبات جوق در جوق باہر نکل رہے تھے۔ چھوٹی ،بڑی پندرہ سال کی عمر تک کی ہر قسم کی بچیاں اور بچے۔ چند لمحے اسے گاڑی روکنی پڑی مگر پھر جیسے ہی ہجوم کم ہوا اس نے ایکسلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ اسلام آباد کی حدود کے بعد موسم درمیانہ تھا اور سوات داخل ہوتے ہی موسم سرد ہو گیا تھا۔ وہ اس کے لئے پہلے ہی تیار تھا چنانچہ ساتھ والی سیٹ پر رکھی کالی شال اٹھا کر کندھوں پر ڈال لی اب وہ بہتر محسوس کر رہا تھا سنجیدہ نظریں ونڈ سکرین کے پار جمی ہوئی تھیں۔ مور جان، چھوٹی امی، بی جان، آغا جان، بابا سائیں سب کے تاثرات کے بارے میں سوچ کر وہ مسکرا اٹھا۔ اسے جلد از جلد حویلی پہنچنا تھا۔

☆☆☆☆☆

"سمی میں آج بہت، بہت خوش ہوں۔"

سمی کے ساتھ چلتی وہ خوشی سے بتا رہی تھی۔ سمی سامنے کی جانب دیکھ کر چل رہی تھی جب کہ زینی سمی کی جانب رخ موڑے الٹے قدم اٹھا رہی تھی۔

"میں بھی۔۔۔تجھے پتا ہے جب ہم دونوں ایک جیسے سوٹ پہنیں گی تو سارے جل جائیں گے۔"

سمی معصومیت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات لئے بول رہی تھی۔ زینی نے آنکھیں زور سے میچیں پھر کھولیں یہ عمل شاید خوشی پر قابو پانے کا ایک طریقہ تھا۔

"ہائے کتنا مزہ آئے گا۔"

سمی پرجوش سی بولی۔ زینی اس سے کوئی بات کر رہی تھی جب سمی کی نظریں اس کے عقب میں اٹھیں۔ جہاں ایک جیپ دور سے دھواں اڑاتی ان کی جانب آ رہی تھی۔ جیپ کے ٹائروں کے چڑچڑانے کی آواز پر الٹے قدم

اٹھاتی زینی کے قدم بھی زنجیر ہو گئے تھے۔وہ ان گزرے تین روز میں سفیر خان کو کیسے بھلا بیٹھی۔اس کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا۔سفیر خان کی باتیں ذہن کے پردوں پر لہرایں۔اس کی آر پار جاتی نظریں اور بہکے انداز۔گاڑی کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز پر اس کی رہی سہی ہمت بھی فنا ہونے لگی۔وہ ایڑھیوں پر گھومی تھی۔پیچھے بخش اور ایک بندے کو کھڑا پا کر اس کی جان ہوا ہونے لگی تھی۔اس نے سمی کی جانب دیکھا جس کا چہرہ بھی خوف کے باعث سفید پڑ رہا تھا۔اس نے سمی کی کلائی زور سے دبوچ لی۔

"سمی بھاگ۔۔۔"

اس کی کچھ اکھڑی، کچھ متوازن آواز پر سمی بھی ہوش میں آئی۔وہ دونوں الٹے پاؤں واپس دوڑیں۔دونوں کے ہاتھ بھی چھوٹ چکے تھے۔بخش اور وہ آدمی دوبارہ سے جیپ پر سوار ہوئے اور جیپ ان کے پیچھے دوڑا دی۔بھاگتی ہوئی زینی کا پاؤں پتھر سے ٹکرایا اور وہ اوندھے منہ زمین پر گری۔کچھ دن پہلے کی جلی ہوئی چمڑی ایک بار پھر ادھڑ چکی تھی۔خون بہہ نکلا تھا مگر وہ تیزی سے اٹھی اور ایک بار پھر دوڑنے لگی مگر زیادہ دیر دوڑ نا پائی۔قدم خود با خود لڑکھڑانے لگے تھے شاید پاؤں میں موچ آگئی تھی۔سمی نے بے بسی سے اسے دیکھا پھر دوڑ کر واپس آئی۔

"سمی بھاگ۔۔۔چپڑاسی کو بلا کر لے آ۔اسکول تھوڑے فاصلے پر ہے۔جلدی کر"

زینی درد ضبط کرتی چلائی۔دھواں اڑاتی جیپ پل، پل اس کے قریب آتی جا رہی تھی۔سمی نے ایک بار پھر بے بسی سے اس کی جانب دیکھا پھر اسکول کی جانب دوڑ لگا دی۔جیپ قدرے قریب پہنچ چکی تھی۔

☆☆☆☆☆

سامنے سے چادر میں لپٹی کوئی لڑکی تیزی سے اس کی گاڑی کی جانب دوڑتی آ رہی تھی اگر وہ بروقت بریک پر پاؤں نہ رکھتا تو شاید وہ کچلی جاتی۔کچھ غصے اور کچھ پریشانی کے عالم میں وہ فوراً سے گاڑی سے اترا اور اس کی جانب چلا آیا۔وہ

جو چہرہ نیچے کیے سانس متوازن کرنے کی کوشش کر رہی تھی گاڑی کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز پر جھٹکے سے سر اٹھایا۔ وہ بڑے خان تھے۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا اسے زینی کا مسیحا مل چکا تھا۔

"کون ہو تم اور کیا ہوا ہے تمہیں؟ کیسے دوڑتی آ رہی تھی اگر ابھی گاڑی کے نیچے آ جاتی تو کیا ہوتا؟ مجھے بتاؤ کون ہو تم؟"

اس کا غصہ عود آیا کچھ پریشانی اور کچھ غصے کے عالم میں وہ تیز لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ سمی نے تھوک نگلا۔

"سائیں میں قاسم۔۔۔ لالہ کی چھوٹی۔۔ بہن ہوں"

قاسم کے ذکر پر بہرام کی بھنوؤں کا تناؤ کم ہوا۔ وہ حیران نظر آ رہا تھا۔

"ثمر؟"

وہ سوالیہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔ سمی نے سر ہلایا۔

"لالہ میری۔۔۔ دوست۔۔۔ لالہ اسے۔"

"آرام سے بتاؤ کیا ہوا؟"

سمی نے مختصر اسے سارا واقعہ سنا ڈالا۔ جوں جوں وہ بتاتی جا رہی تھی بہرام کی بھنوئیں خفگی سے اکٹھی ہوتی جا رہی تھیں سفیر ایسا کیسے کر سکتا تھا؟

اگلے ہی لمحے سمی کو گاڑی میں ساتھ والی سیٹ پر بیٹھائے اس کی گاڑی فراٹے بھرتی اس راستے پر جا رہی تھی جس کی نشان دہی ثمر نے کی تھی۔ کچھ فاصلے پر ہی اسے ایک جیپ کھڑی نظر آئی۔ بخش کو وہاں دیکھ کر اس کا شک یقین میں تبدیل ہو گیا بخش بے دردی سے کسی لڑکی کو گھسیٹتے ہوئے جیپ کی جانب لے کر جا رہا تھا۔ وہ لڑکی شدید زخمی تھی۔ اس کے ہاتھوں سے خون رس رہا تھا۔ ساتھ ہی ماتھے پر بھی چوٹ تھی۔ مگر وہ اپنا نقاب زور سے تھامے تھی شاید وہ اسے اتارنا اور مر جانا ایک برابر سمجھتی تھی بہرام نے ایک جھٹکے سے گاڑی روکی۔ گاڑی سے باہر نکلا تو زینی

کو گھسیٹ کر لے جاتے بخش کو بھی ہوش آیا اس نے سر اٹھا کر دیکھا، سامنے ہی بڑے خان کو دیکھ کر اس کی زبان کو تالا لگ گیا وہی زبان جو کچھ دیر قبل زینی کے لیے گالیاں بک رہی تھی۔ بہرام کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں، اس نے ایک نظر بخش کو دیکھا اور دوسری نظر ساتھ کھڑے آدمی پر ڈالی، اس کی نظروں میں ایسا تاثر تھا کہ بخش نے فوراً سے پہلے زینی کا ہاتھ چھوڑا اور اس شخص کو اشارہ کئے جیپ کی جانب بڑھ گیا۔ چند لمحے بعد وہ جیپ فراٹے مارتی سڑک پر دوڑتی جا رہی تھی۔ زینی نے پلٹ کر دیکھا۔ بہرام کو بہت کم لوگ جانتے تھے کیوں کہ ساری زندگی وہ شہر رہا تھا۔

پیچھا کھڑا شخص اس کے لئے انجان تھا وہ نہیں جانتی تھی یہ کون ہے مگر وہ اتنا ضرور جانتی تھی کہ یہ اس کا مسیحا ہے۔ دوسری جانب بہرام بے تاثر انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے اس لڑکی سے ہمدردی تھی۔ سفیر کی حرکت پر اس کا خون کھول رہا تھا۔ وہ لڑکی شاید لڑی تھی بہرام کو یہی لگا اس نے سمی کو اشارہ کیا پھر تقریباً تیزی سے قدم اٹھاتا اس کی جانب چلا آیا اس سے پہلے کہ وہ بے ہوش ہو کر زمین بوس ہوتی ہے بہرام نے فوراً سے پہلے اسے تھام لیا۔ بہرام کی نظریں اٹھیں اور اس کی نقاب سے جھانکتی آنکھوں پر جا رکیں۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ ان آنکھوں کے بند ہونے سے قبل ان کا حسین رنگ دیکھتا بہرام ایک پل کو گڑبڑایا۔ وہ آنکھیں بہت حسین تھیں۔ بہت زیادہ۔ وہ نیم باز آنکھیں قاتل تھیں۔ اس نے سر جھٹکا پل بھر میں وہ دوبارہ سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ چکا تھا۔ پھر سمی کی مدد سے اسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹایا۔ گاڑی کا رخ اب کلینک کی جانب تھا۔ کلینک کے باہر اس نے گاڑی تیزی سے روکی۔ ایک بار پھر سمی کی مدد سے اسے نکالے وہ اندر آیا۔

"طبیبہ ہیں؟"

اس نے کرسی پر بیٹھے آدمی سے پوچھا جو خان کو وہاں دیکھے تیزی سے کھڑا ہوا۔

"سلام خان سرکار۔"

وہ آداب نبھانے کے چکر میں تھا جب بہرام نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

"جلدی سے طیبہ کو بلاؤ۔"

وہ ایک نظر درمیان میں موجود بے ہوش وجود اور دوسری نظر سمی پر ڈالے تیزی سے پردہ ہٹائے کونے کے کمرے میں چلا گیا چند لمحے بعد نقاب میں لپٹی ایک عورت تیزی سے باہر آئی۔ بہرام ایک جانب ہوا تو اس نے زینی کو سہارا دیا۔ سمی اور وہ عورت زینی کو لئے اس کمرے میں چلی گئیں۔ بہرام وہیں ارد گرد چکر کاٹنے لگا۔ وہ پریشان تھا۔ دفعتاً وہ رکا اور سامنے کھڑے شخص کو دیکھا جو بہت غور سے بہرام کی حالت کا معائنہ کر رہا تھا۔ ایک دم ہی بہرام کو خیال گزرا کہ یہ آدمی کہیں اس بات کو گاؤں میں نہ پھیلا دے اسے اپنی پرواہ نہیں تھی اسے سمی اور زینی کی عزت کی پرواہ تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اس شخص کو اپنے قریب بلایا پھر بٹوے سے کئی ہزار، ہزار کے نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھائے۔ اس شخص کی آنکھوں میں حیرت آگئی۔

"نہیں خان سرکار نہیں۔۔۔"

وہ کتراتے ہوئے بولا۔ بہرام نے سر جھٹکا اس کا واسطہ روز ایسے لوگوں سے پڑتا تھا۔

"رکھ لو اور اپنا منہ بند رکھنا۔"

اس کے لہجہ میں ہلکی سی تپش تھی۔ اب کی بار اس شخص نے فوراً سے پیسے تھام لیے۔

"خوش رہیں سرکار۔۔۔"

وہ مزید بھی بول رہا تھا مگر بہرام کے پاس سننے کا وقت نہیں تھا۔ طبیبہ باہر آئی تو بہرام تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

"وہ ٹھیک ہے؟"

انداز سوالیہ تھا۔ طبیبہ نے سر ہلایا۔

"سرکار پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔اب اسے ہوش آگیا ہے۔ماتھے پر ہلکی سی چوٹ تھی۔پاؤں کی موچ ٹھیک کر دی ہے اور پٹی باندھ دی ہے امید ہے کل تک ٹھیک ہو جائے۔دوسرا یہ کہ ہاتھ پہلے ہی جلا ہوا تھا اب اس کی چمڑی مزید ادھڑ گئی تھی مگر میں نے پٹی کر دی ہے۔دودھ میں ہلدی ملا کر دینے پر ہی افاقہ ہو جائے گا۔"

بہرام نے سر ہلایا۔چند لمحے بعد سمی کے سہارے وہ لڑکھڑاتی ہوئی باہر چلی آئی۔بہرام نے نظریں جھکا لیں تھیں۔اسے سفیر کے سبب اس قدر شرمندگی محسوس ہو رہی تھی کہ وہ دوبارہ اس کی جانب نہیں دیکھ پایا۔باقی کا تمام راستہ خاموشی سے کٹا۔ان کے گھر سے کچھ فاصلے پر گاڑی روک کر بہرام نے سمی کی جانب دیکھا۔

"جو تدابیر بتائی ہیں طبیبہ نے اس پر عمل کرنا ہے۔"

"جی ٹھیک۔"

سمی نے سر ہلایا تو پھر سہارا دیکھ کر زینی کو گاڑی سے باہر نکالا زینی نے دوبارہ بہرام کی جانب نہیں دیکھا تھا۔اسے خامخواہ شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔یہ سوچ ہی بہت شرمندہ کر رہی تھی کہ وہ بے ہوشی کے دوران اس کے آسرے پر رہی تھی۔بہرام انھیں جاتا دیکھ رہا تھا وہ ابھی چند قدم کے فاصلے پر ہی پہنچی تھیں جب بہرام کی آواز سنائی دی۔

"کوشش کریئے گا جو آج ہوا وہ راز رہے۔شاید اسی میں بہتری ہے۔باقی میں اپنے طور پر معاملہ سنبھال لوں گا۔"

بہرام کا لہجہ عام سا تھا۔زینی نے آنکھیں میچ کر کھولیں۔وہ کم از کم اب یہ بات مرتضیٰ لالہ سے چھپا نہیں سکتی تھی۔اپنی بات کیے بہرام گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔اگلے ہی لمحے گاڑی ہوا سے باتیں کرتی جا رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

ڈیرے کے ماحول میں سخت تناؤ تھا۔سفیر کا دماغ خراب ہو رہا تھا وہ بالوں میں ہاتھ چلاتے ارد گرد گھوم رہا تھا۔بخش ایک جانب کھڑا اسے ادھر ادھر غصے سے گھومتا دیکھ رہا تھا۔

"سرکار۔۔۔"

اس نے بولنا چاہا جب ہاتھ اٹھا کر اس نے بخش کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"لالہ کیسے آسکتے ہیں؟ انہوں نے تو کسی کو اپنی آمد کی اطلاع بھی نہیں دی پھر یوں اچانک؟ اس طرح؟"

وہ سخت پریشان نظر آرہا تھا۔

"تم لوگوں کا دماغ خراب ہے کیا؟ اس طرح اسے گھسیٹ کر لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

سفیر کو اب کہیں تو غصہ اتارنا تھا۔

"سرکار وہ بھاگ گئی تھی۔ پھر زبردستی کرنا پڑی۔۔۔"

بخش مزید بولنا چاہتا تھا مگر سفیر بول اٹھا۔

"تم لوگ پاگل تھے۔ بہرام کو نہیں دیکھ سکتے تھے؟"

"سرکار ہمیں کون سا بہرام سرکار کی آمد کا خواب آنا تھا۔"

بخش اکھڑے لہجے میں بولا۔ سفیر رک گیا اور اسے آنکھیں دکھائیں۔

"بکواس بند کر جاہل۔ مجھ سے زبان نا چلا۔ جتنی جلدی ہو سکتا ہے پہلی فرصت میں ڈیرے کو خالی کرو۔ سارا سامان اور ساری منشیات ادھر ادھر کرو، کہیں سے بھی لالہ کو شک نہ ہونے پائے۔ باقی معاملہ میں سنبھال لوں گا۔"

اس کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ اسے اب اس معاملے کو کسی بھی طرح حل کرنا تھا۔ بخش سر ہلاتا پلٹ چکا تھا۔ ڈیرے میں افراتفری کا سماں تھا۔ ہر کوئی اپنے کام کو لگ چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

وہ حویلی پہنچا تب تک خود کو قدرے سنبھال چکا تھا۔ اسے یہ معاملہ اپنے طریقے سے حل کرنا تھا اور وہ جانتا تھا اسے کیا کرنا ہے۔ گیٹ کھلنے پر اس کی گاڑی پتھریلی روش پر چلتی دیگر گاڑیوں کے ساتھ آکھڑی ہوئی۔ ملازموں کی دوڑ

لگ چکی تھی کچھ اندر کی جانب بڑھے تو کچھ اس کے استقبال کو۔وہ سب کو سلام کہتا اندر کی جانب بڑھ گیا۔راہداری سے گزر کر مردان خانے پہنچا اس وقت تک ملازم آغا جان، بابا سائیں اور چھوٹے بابا کو اطلاع پہنچا چکے تھے۔ تبھی وہ سب لاؤنج میں پہنچ چکے تھے۔وہ مسکرایا۔سب سے پہلے آغا جان سے ملا پھر باقی سب سے۔

"دو ماہ بعد شکل دکھانے کی بھی کیا ضرورت تھی دو سال بعد آجاتے۔"

یہ سلیمان خان کی خفگی سے بھرپور آواز تھی۔وہ سر جھٹکے ہنسا۔

"دیکھ لیں۔میرے لئے یہ مشکل نہیں ہے۔"

وہ شریر انداز میں ہنسا۔آغا جان کی ناپسندیدگی ایک بار پھر عود آئی۔

"یہ کیا کر سکتا ہے؟نوکری ہی اس قسم کی ہے۔"

وہ تنفر سے بولے۔بہرام نے آنکھیں گھمائیں۔

"کم از کم تعلیم نے مجھے انسان اور جانور کے درمیان کا فرق سکھایا ہے جو بد قسمتی سے سفیر سیکھ نہیں پایا۔"

وہ بھی بہرام تھا۔خود پر ایک آنچ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"لو اب میرے جگر نے کیا کہا ہے تمہیں؟"

آغا جان کے لہجے میں تپش تھی۔

"کچھ نہیں"چند لمحے خاموشی سے انھیں دیکھتے رہنے کے بعد وہ بولا پھر اٹھ کھڑا ہوا تو سلیمان نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کہاں؟"

انداز سوالیہ تھا۔

"بہت تھک چکا ہوں۔پہلے لباس تبدیل کروں گا پھر بی جان سے ملاقات۔"

وہ تھکے، تھکے انداز میں مسکرایا پھر کلائی پر بندھی گھڑی اتارتا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ سلیمان خان نے ملازم کو آواز دے کر بلایا۔ آج کھانے پر مزید اہتمام کروانا تھا۔

☆☆☆☆☆

میٹھی اور ٹھنڈی صبح کی دودھیا روشنی چار سو پھیل گئی تھی۔ آسمان تین رنگوں کے امتزاج میں ڈھل چکا تھا۔ نیچے سے جامنی، اوپر ایک گلابی رنگ کی تہہ اور تاحدِ نگاہ پھیلے نیلگوں آسمان کی خوبصورتی ناقابل بیان تھی۔ یہ کسی مصور کا خاکہ لگتا تھا جہاں سجے آسمان تلے موجود خان حویلی کی فصیل پر سورج کی روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔

لان میں لگائی گئیں کرسیاں آج خالی نہیں تھیں۔ وہاں جاگنگ سوٹ پہنے بیٹھا بہرام اخبار پڑھتے ہوئے ہاتھ میں تھامے گلاس سے جوس پی رہا تھا۔ پسینے سے تر بال ماتھے پر چپکے ہوئے تھے۔ کبھی وہ اخبار پڑھتا تو کبھی گاہے بگاہے آہستہ، آہستہ پھیلتی روشنی کو دیکھتا۔ وہ کل سے سفیر کا منتظر تھا مگر وہ جان بوجھ کر گھر نہیں لوٹا تھا وہ رات ڈیرے پر ہی رہا تھا۔ وہ جانتا تھا اب سفیر کو ہر صورت واپس لوٹنا ہے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ ابھی کچھ دیر تک حویلی ہو گا اور وہی ہوا۔ اگلے پندرہ منٹ بعد گاڑی کا ہارن بجنے پر گارڈ نے گیٹ کھولا تو سفیر کی گاڑی اندر چلی آئی۔ گاڑی میں بیٹھے سفیر نے جب لان میں نظر ڈالی تو وہاں بیٹھے بہرام کو دیکھ کر اس کا دل یک بارگی سے دھڑکا۔ نا جانے اب لالہ اس کا کیا حال کریں گے مگر وہ بھی اپنا سبق یاد کر آیا تو خاصا مطمئن ہو گیا۔ گاڑی پارک کیے وہ باہر نکلا پھر اندر کی جانب بڑھنے کی اداکاری کرتا جان بوجھ کر ٹھٹھک کر رکا۔ آنکھیں سکیڑے سینے پر بازو باندھے کھڑے بہرام کو دیکھا۔ چہرے کے تاثرات ایسے کر لئے جیسے نا جانے کتنا خوش اور حیران ہو۔ پھر تیزی سے اس کی جانب چلا آیا۔

"لالہ آپ؟ کتنا خوش گوار سرپرائز ہے۔"

وہ خوش دلی سے بولا۔ وہ بے شک بہترین اداکار تھا۔ بہرام چونکا پھر حیرانی سے اسے دیکھا۔

"ہمممم۔۔۔"

وہ کچھ بولنے کی حالت میں نہیں تھا۔ سفیر کا نارمل سا انداز اسے حیران کر رہا تھا۔ وہ اتنا نارمل کیسے تھا یہ بات بہرام کو حیران کیے دے رہی تھی۔

"کب آئے آپ؟ بندہ بتا ہی دیتا ہے مگر نہیں جی"

سفیر کی زبان مسلسل چل رہی تھی۔ بہرام خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مگر چاہ کر بھی اس کے لہجے اور آنکھوں سے جھوٹ کا عنصر نا ڈھونڈ پایا۔

"کیا ہوا ہے آپ کو؟"

سفیر نے رک کر اس کی جانب دیکھا۔

"جھوٹ مت بولو۔ یوں انجان کیوں بن رہے ہو تم ہر چیز سے؟"

بہرام سخت لہجے میں بولا۔ سفیر پل بھر کو رکا۔

"کس چیز سے"

انداز سوالیہ اور لہجہ سنجیدہ تھا۔

"جھوٹ مت بولو سفیر کل تمہارے بندے گاؤں کی کسی لڑکی کو اٹھانے آتے ہیں اور تم کہہ رہے ہو کس چیز سے؟"

وہ سخت لہجے میں اس کا اپنے کندھے پر رکھا ہاتھ جھٹک کر بولا۔ سفیر نے بھرپور حیران ہونے کی کوشش کی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میرے بندے؟ کون؟"

انداز سوالیہ تھا۔ اس کے انداز ایسے تھے کہ بہرام چونک گیا تھا۔

"بخش اور علی"

اس نے نام لیا۔ سفیر نے سر جھٹکا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

وہ اٹھ کھڑا ہوا پھر جیب سے فون نکالا اور سکرین پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

"کیا کر رہے ہو؟"

بہرام کا انداز سوالیہ تھا۔ سفیر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر سر نفی میں ہلایا۔

"اگر یہ بات سچ ہے تو ان دونوں کو میرے ہاتھوں سے کوئی نہیں بچا سکتا۔"

وہ قطعی لہجے میں بولا۔

"تو کیا تم نہیں جانتے اس بارے میں؟"

اب کی بار وہ نرم پڑا۔ سمی نے اسے یہی بتایا تھا کہ وہ چھوٹے خان کے آدمی ہیں جو اس کی دوست کو اٹھانے آئے تھے چونکہ سمی بھی اس روز کے واقعے سے انجام تھی اس لیے وہ اس واقعے کا ذکر بہرام کے سامنے نہ کر سکی مگر اب سفیر کے انداز، اس کا لہجہ اور اس کی باتیں بہرام کو یہ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی کہ یہ قدم صرف اور صرف بخش اور علی نے خود اٹھایا تھا اور اس میں سفیر کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ جب کہ سفیر ایک جانب جا کر موبائل کان کو لگائے تیزی سے کوئی بات کر رہا تھا۔ اس کا لہجہ بہت سخت تھا۔ بہرام کو اطمینان ہوا۔ کل سے جو بات اسے پریشان کیے ہوئے تھی اس کا اثر اب ختم ہو چکا تھا۔ پھر وہ اور سفیر ناشتے سے پہلے تک کافی دیر وہیں بیٹھے رہے۔ ناختم ہونے والی باتوں کا سلسلہ تھا۔ سفیر بھی اطمینان میں تھا۔ وہ ایک معمولی دو ٹکے کی لڑکی کے لئے اپنی عزت خراب نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆☆☆

کمرے کا ماحول بہت گھٹن زدہ تھا۔ وہ پرسوں سے یہیں بند تھی۔ نہ باہر گئی نہ کسی کو اندر آنے دیا۔ خرابیِ طبیعت ایسا بہانہ تھا جو اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ بستر پر چت لیٹی ہوئی تھی نظریں اوپر چھت پر جمی ہوئی تھیں۔ بند پنکھے پر

گرد تھی۔ اسے اس روز گھر لوٹنے پر ہونے والی ہر بات یاد آنے لگی۔ وہ گھر لوٹتے ہی پھوپھی کی آغوش میں آچھپی تھی اور ہر بات انھے بتادی تھی رومانہ نے سب سننے کے بعد اسے سختی سے تاکید کی تھی کہ اس بات کی بھنک نہ اس کے ابا کو لگے، نہ قمر کو، نہ مرتضیٰ کو۔ یہ معاملہ نازک تھا اور رومانہ مرتضیٰ اور قمر کی گرم طبیعت سے واقف تھیں۔ خامخواہ اس جنگ میں وہ دونوں لڑکوں کو کھو بیٹھتی۔

رومانہ نے مرتضیٰ، قمر اور شیر گل کو یہی بتایا تھا کہ وہ اسکول سے واپس آتے ہوئے کینو توڑنے درخت پر چڑھ گئی تھی لیکن برا نصیب کہ گر گئی۔ اس بات پر شیر گل خاصے ناراض بھی ہوئے تھے۔ اس کا پاؤں اب ٹھیک ہو چکا تھا سوزش بھی کم ہو گئی تھی اور وہ پہلے سے بہتر محسوس کر رہی تھی۔

مگر کمرے میں رہ کر اس کی طبیعت عجیب سی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بلا آخر اکتا کر اٹھی اور باہر نکل آئی مگر باہر آنے پر چارپائی پر بیٹھی سمی کو دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نا رہی۔ ایک دن بھی اس کے بغیر محال تھا اور تبھی سمی کی نگاہ چوکھٹ پر پڑی وہ دوڑ کر اس کے گلے آلگی۔ زینی بوکھلا گئی۔

"میں تیرے لئے پریشان تھی۔"

اس کی بات پر زینی کو بے اختیار اپنی دوستی پر ناز ہوا۔

"میں ٹھیک ہوں اب۔۔۔ تو پریشان نا ہو۔ چل آجا یہاں بیٹھیں۔"

اس نے چارپائی کی جانب اشارہ کیا۔

"میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی جناب۔۔۔ خالہ سے اجازت لے لی ہے۔ تو بس کپڑے بدل، آج ٹپے گانے ہیں۔"

زینی کا مرجھایا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ سمی کا ہاتھ تھامے تیزی سے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ الماری کھولی اور سوٹ ادھر، ادھر کرنے لگی۔ سمی اس کی پھرتیاں دیکھ کر ہنستی رہی۔

"پیچھے ہٹ، تو نے ساری عمر یہیں گزار دینی ہے، میں دیکھتی ہوں۔"

وہ ایک لمحے میں پیچھے ہوئی۔ سمی الماری کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ کپڑے سلیقے سے تہہ کر رکھے تھے۔ وہ چند لمحے یونہی کھڑی سوچتی رہی پھر نظر کو ایک گلابی جوڑا بھا گیا۔ اس نے فوراً سے وہ جوڑا باہر نکالا۔

"یار تو خود اتنی سادہ لگ رہی ہے اور مجھے یہ پہنا رہی ہے۔"

وہ ناک سکوڑے بولی۔ سوٹ کافی شوخ تھا۔

"تجھے کس نے کہا کہ میں سادی رہوں گی۔ پگلی میں جوڑا نکال کر آئی ہوں اپنا۔ جا کر پہنوں گی۔ ابھی تو تجھے لینے آئی تھی۔"

سمی نے تفصیل سے آگاہ کیا پھر سوٹ اس کے ہاتھ میں تھما کر زبردستی اسے غسل خانے کی جانب بھیجا۔ خود وہ اسی کمرے میں بیٹھ گئی۔ چند لمحے بعد چوکھٹ پر آہٹ ہوئی۔ اس نے احتیاط کے طور پر فوراً سے چہرہ ڈھانپا۔ نظریں اٹھا کر دیکھا تو چوکھٹ میں قمر کھڑا تھا۔ دل یک بارگی سے دھڑکا۔ جسے اس نے ڈپٹ دیا۔ وہ پورے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ بغیر پوچھے بھی سمی جانتی تھی وہ کس کو تلاش کر رہا تھا۔

"جس کو تلاش رہے ہو آپ، وہ یہاں نہیں ہے۔۔۔"

سارے عرصے میں قمر نے اس کی جانب پہلی بار دیکھا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے سمی کا جملہ نامکمل تھا۔ شاید وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر کہتے، کہتے خاموش ہو گئی مگر قمر کے پاس وقت نہیں تھا تبھی سر ہلاتا پلٹ گیا۔ سمی نے ٹھنڈی آہ بھری اور گال پر لڑھکتے آنسو کو بے دردی سے رگڑ ڈالا۔

تیرے دیدار کو اٹھتی نگاہ مایوس رہتی ہے
کیفیت دل آجکل عجیب رہتی ہے
یہ تیرے عشق کی بخشی سوغات ہے

کہ میری آنکھ ہر وقت پر نم رہتی ہے

میں کہوں یا نہ کہوں یہ بول دیتی ہے

خاموشی اندر کی انسان کو توڑ دیتی ہے

جفا کا لطف لے کر آتشِ عشق میں جلتی ہوں

میں ہر روز جی کر روز مرتی ہوں

(از خود)

☆☆☆☆☆

سمی تیار ہو رہی تھی اور وہ بستر پر بے زار سی بیٹھی تھی۔ گلابی سوٹ میں وہ گلابی پھول لگ رہی تھی۔ گہرے سیاہ بال پشت پر پھیلا رکھے تھے اور شیفون کا سادہ سا دوپٹہ سر پر لے رکھا تھا۔ کانوں میں سمی کی فرمائش پر چھوٹے، چھوٹے جھمکے بھی پہن رکھے تھے۔ وہ بلاشبہ بہت خوبصورت تھی۔ چہرہ جو کچھ دیر پہلے پیلا تھا اب اس میں سرخیاں گھلی ہوئی تھیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں رونق لوٹ آئی تھی۔

"سمی جلدی کر۔"

وہ غصے سے بولی۔ چھوٹی سی ناک غصے میں پھول گئی۔ سمی کاجل لگاتی مصروف سے انداز میں اس کی جانب مڑی۔

"چپ کر کے بیٹھ جا اور اگر نہیں بیٹھ سکتی تو باہر چلی جا۔"

زینی چند لمحے مزید بیٹھی رہی مگر پھر مزید انتظار نا ہوا تو اٹھ کر باہر چل دی۔ سمی کندھے اچکائے اپنے کام میں دوبارہ مصروف ہو گئی۔ وہ کمرے سے باہر آئی تو راہداری میں کئی لڑکیاں پھر رہی تھیں۔ یہ وہ رشتہ دار ہوتی ہیں جو شادی سے پانچ روز پہلے ہی آ بیٹھتی ہیں۔ وہ انھیں نظر انداز کرتی باہر جاتے دروازے کے پاس آئی جس کے سامنے کھلا صحن تھا جہاں رشتہ دار عورتیں بیٹھی ٹپے گا رہی تھیں۔ اس نے ایک نظر صحن کی جانب دیکھا۔ وہاں بہت بھیڑ تھی

اس کا جی بھر آیا۔ دوسری نظر اس نے اندر کچھ فاصلے پر موجود سیڑھیوں پر ڈالی۔ اوپر جا کر کچھ دیر اس گھٹن سے دور سانس لینا کتنا دل کش ہو گا۔ یہ سوچ ذہن میں آتے ہی وہ اوپر کی جانب چل دی۔ وہ اوپر پہنچی تو پوری چھت خالی تھی۔ ایک پل کو اسے خوف آیا۔ یوں سمی کو بتائے بغیر تنہائی میں آنا؟ نا جانے یہ ٹھیک تھا یا نہیں مگر اگلے ہی لمحے خود کو مضبوط کیے وہ چھت کے آخری سرے پر چلی آئی جہاں سے نیچے دیکھنے میں آسانی ہو سکتی تھی۔ اس کے لئے اسے نیچے بیٹھ کر دیوار میں موجود چھوٹے، چھوٹے سوراخوں سے جھانکنا تھا تا کہ کسی کی نظر اوپر بھی نا پڑے اور وہ نیچے کا منظر بھی دیکھ سکے۔ وہ چند پل یونہی بیٹھی رہی پھر بلا آخر اکتا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے صحن میں ماری ،ماری پھرتی سمی نظر آئی تو خود کو کوستے وہ نیچے کی جانب چلی آئی۔ ابھی سیڑھیوں کے قریب پہنچی تھی جب سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے شخص سے اس کا زبردست تصادم ہو گیا۔ نتیجتاً وہ پیچھے کی جانب بری طرح گری تھی۔

☆☆☆☆☆

وہ جب سے یہاں آیا تھا گاؤں کے لوگ اور قاسم کے رشتہ دار اس سے ملنے آ رہے تھے۔ وہ سب سے خوش دلی سے مل رہا تھا۔ قاسم اسے بھائیوں کی طرح عزیز تھا۔ تبھی وہ اس کی خوشی میں دل سے شریک ہوا تھا۔ اسے سلیمان خان کا فون آیا تو وہ معذرت کرتا اندر آ گیا۔ مگر راہ داری عورتوں اور لڑکیوں سے بھری پڑی تھی وہ الٹا پچھتایا پھر الٹے قدم باہر جانے کو مڑا جب اسے سیڑھیاں نظر آئی۔ وہ بغیر کوئی لمحہ ضائع کیے تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا نظریں موبائل پر تھیں اور انگلیاں نمبر ملانے میں مصروف تھیں۔ تبھی وہ سامنے سے نیچے اترتی لڑکی کو دیکھ نا پایا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس سے بری طرح ٹکرا کر پیچھے کی جانب گر گئی۔ عورت ذات کا احترام کرتے ہوئے وہ رخ موڑ گیا۔

وہ اس سے بری طرح ٹکرا کر نیچے گر چکی تھی اور اسے گرانے والا شخص جو کوئی بھی تھا مزے سے رخ بدل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ جیسے تیسے وہاں سے اٹھی۔ نقاب کیا اور پھر اس کی زبان جوہر دکھانے میں مصروف ہو گئی۔

"اندھے ہو کیا؟ نظر نہیں آتا؟ آندھی طوفان بنے چلے آرہے ہو؟ شرم نہیں آتی؟"

وہ بولنے پر آئی تو بولتی ہی گئی۔ وہ جو اس سے معذرت کرنے والا تھا ایک دم ہی اس کے اتنے سخت لہجے پر غصے میں آگیا۔ اب چاہے جو بھی ہے وہ بات تو تمیز سے کرتی۔ وہ غصے بھرے تاثرات لئے مڑا۔ مگر مڑنے پر سن رہ گیا۔ یہ آنکھیں، ان سے ملاقات دو روز پہلے ہی ہوئی تھی۔ فرق یہ تھا کہ اس دن یہ کانچ آنکھیں خوف میں ڈوبی ہوئی تھیں اور آج ان میں خوف نہیں تھا۔ دوسری جانب زینی نے اس کا چہرہ جو دیکھا تو خود کو ہزار بار کوسا۔

"تم؟ تم یہاں کیا کر رہی تھی؟"

بہرام نے حیرانی سے پوچھا۔ ساتھ ہی ایک نظر اس کے شفاف ماتھے پر ڈالی جہاں زخم کا نشان اب مندمل ہو رہا تھا۔ ہاتھ پر پٹی ہنوز موجود تھی۔ پاؤں تو ٹھیک تھا۔ غرض وہ ایک نظر میں اس کا معائنہ کر چکا تھا۔

"میں صحن میں جھانک رہی تھی۔"

وہ معصومیت سے سر جھکائے بول رہی تھی۔ مخروطی انگلیوں نے دوپٹے کا ایک کونہ تھام رکھا تھا۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک بار پھر بہرام ان آنکھوں کے سحر میں مبتلا ہوا تھا مگر پھر فوراً سے خیالات کو جھٹکا۔ وہ اس کے برابر سے ہو کر نیچے جانے لگی تھی جب اسے بہرام کی آواز سنائی دی۔

"سنو۔۔۔"

وہ انہی قدموں پر پلٹی۔

"جی؟"

بہرام نے رخ موڑ کر اس کی جانب دیکھا۔

"اس دن وہ دونوں حویلی کے ملازم تھے جو تم سے بدتمیزی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سفیر نے انھیں سمجھا دیا ہے وہ آئندہ ایسا نہیں کریں گے۔"

وہ متوازن لہجے میں بولا۔وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی جو سفیر سائیں کو صرف سفیر کہے کتنے آرام سے بات کر رہا تھا ۔کون تھا وہ؟ کیا حویلی سے ؟یکلخت ہی اسے بہرام سے خوف محسوس ہوا تھا۔وہ مڑی اور اب کی بار نیچے پہنچ کر ہی دم لیا۔ چھت پر کھڑے بہرام کی حیرانی بجا تھی۔

☆☆☆☆☆

اسے سمی نے بتایا کہ وہ حویلی کا سب سے بڑا بیٹا تھا جس نے اس روز اس کی حفاظت کسی مسیحا کی طرح کی تھی۔وہ سن کر جتنا حیران ہوتی کم تھا۔حویلی سے تعلق رکھنے والا مرد اور اتنا رحم دل؟ ساتھ ہی ساتھ اسے حیرانی بھی ہوئی کہ وہ سفیر کا لالہ ہو کر اس سے کتنا مختلف تھا۔دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

دوبارہ بہرام سے اس کا سامنا نہیں ہو سکا تھا اور اس کے نزدیک یہی بہتر تھا۔

☆☆☆☆☆

قاسم کی شادی ہو چکی تھی اور وہ ولیمہ کے فوراً بعد واپس جا چکا تھا۔اب کی بار کچھ انوکھا احساس تھا جو وہ اپنے ساتھ لئے جا رہا تھا۔کوئی عجیب سی بے بسی کی کیفیت،کچھ ادھورا پن،وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ایسا کیا ہے جو اس کا دل اب کی بار سوات رہ جانے کی ہی ضد کر رہا تھا۔مگر ہر بار اسے کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔دل ہر سوال کے جواب میں خالی شیٹ دے دیتا تھا اور وہ اس شیٹ کو دیکھ کر اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا کہ یہ خالی شیٹ کیوں؟ جواب کہاں ہے؟ مگر دل اس کا بھی جواب نہیں دے رہا تھا۔بلا آخر وہ دل کو ایک جانب ڈانٹ ڈپٹ کر بیٹھا چکا تھا جو خامخواہ اس کا وقت ضائع کرنے کے درپر تھا۔

☆☆☆☆☆

سمی کو آج اسکول نہیں جانا تھا وجہ یہ تھی کہ انھیں ساتھ کے گاؤں دعوت پر جانا تھا۔چونکہ قاسم کی نئی،نئی شادی تھی سو آئے روز دعوتوں کا سلسلہ چل رہا تھا۔وہ بوجھل دل سے اسکول گئی تھی۔جانا اس کی مجبوری تھا۔وہ پہلے

چوٹ لگنے کے سبب، پھر قاسم کی شادی کے سبب کئی چھٹیاں کر چکی تھی مزید چھٹیاں اب قابلِ قبول نہ تھیں۔ رومانہ نے اسے قمر کے ہمراہ اسکول بھیجا تھا۔ قمر اسے اسکول چھوڑ تو گیا تھا مگر اب واپسی پر اسے خود گھر واپس آنا تھا۔ دل میں ڈر بھی تھا کہ کہیں آج پھر اس کا راستہ نہ روک لیا جائے۔ اس واقعہ کو ایک ہفتہ بیت گیا تھا سب ٹھیک چل رہا تھا مگر آج اس کا دل جیسے اسے صبح سے خبر دار کر رہا تھا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتی جا رہی تھی۔ مگر گاؤں کی حدود میں داخلے سے قبل اس کے قدم زنجیر ہو گئے۔ جیپ کے بونٹ پر چڑھ کر بیٹھا اور سگریٹ کے کش لیتا وہ کوئی اور نہیں سفیر ہی تھا۔ ساتھ بخش بھی کھڑا تھا۔ سفیر کی نظروں نے اس کے پاؤں سے سر تک کا فاصلہ طے کیا۔

"زہے نصیب"

وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے بولا۔ زینی کا رنگ فق ہو گیا۔ سانس سینے میں اٹکنے لگی۔ یہ غلیظ انسان آخر کیوں اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ یہ کہانی شاید اس کینو کے باغ سے شروع ہوئی تھی اور نا جانے اس کا انجام کیا ہونا تھا۔

☆☆☆☆☆

وہ حویلی کے کام نپٹا کر گاڑی لئے پہلی فرصت میں باہر نکلا تھا۔ اسے زینی کو اسکول سے لینے جانا تھا۔ آج سمی بھی اسکول نہیں گئی تھی۔ حالات خراب تھے اس لئے مرتضیٰ اسے لینے خود نکل پڑا تھا۔ اسکول کے راستے کے پاس گاڑی کے پہنچنے پر جو منظر اس نے دیکھا وہ اس کا خون کھولانے کو کافی تھا۔ اس کا شک درست تھا۔ زینی کی یہ کھوئی ،کھوئی حالت، اس کے پیچھے کوئی نا کوئی وجہ ضرور تھی اور آج اسے وجہ کا اندازہ بھی ہو چکا تھا۔ سفیر خان ہی وہ وجہ تھا جس نے زینی کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ وہ گاڑی کے بونٹ پر چڑھا بیٹھا تھا۔ ساتھ بخش بھی تھا۔

مرتضیٰ نے گاڑی کی سپیڈ بڑھا دی اور ایک جھٹکے میں گاڑی سامنے لے جا کھڑی کی۔ ٹائر چڑ چڑائے، گیٹ کھلا، پھر بند ہوا اور اس کے بعد مرتضیٰ مضبوط قدم زمین پر جمائے ان کی جانب چلا آیا۔ بخش کی ہوا نکل گئی۔ وجہ مرتضیٰ کی آنکھوں کی چنگاریاں تھیں۔ مگر سفیر یونہی بغیر کوئی اثر لئے بیٹھا رہا۔ مرتضیٰ نے کمال ضبط سے خود کو سنبھالا۔

"سرکار میری بہن ہے یہ۔"

لہجہ پر تپش تھا۔ سفیر دلچسپی سے مسکرایا۔

"اوہ۔۔۔یہ تمہاری بہن ہے؟" سفیر نیچے اترا، شال جھٹک کر درست کی اور ان کی جانب چلا آیا۔ زینی کا سر جھکا ہوا تھا۔

"بہنوں کو ایسے نہیں چھوڑتے۔ تمہیں حالات کا تو پتا ہے نا؟ کل کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو؟"

اس کا کندھا تھپتھپایا پھر ایڑھیوں پر گھوما اور جیپ کی جانب بڑھ گیا۔ زینی کا بیگ تھامے اسے سہارا دیے گاڑی تک لے جاتے وہ مسلسل دور جاتی جیپ کو دیکھ رہا تھا جو دھواں اڑاتی جا رہی تھی۔ مٹھیاں زور سے بھینچے وہ ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

اگلے دو روز خاموشی سے بیت گئے۔ منڈیر پر بیٹھنے والے کبوتر آتے خاموشی سے بیٹھتے اور چلے جاتے۔ زینی اس روز مرتضیٰ کو سب سچ، سچ بتا چکی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسے مرتضیٰ کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑا۔

وہ کیسے سب خود برداشت کر رہی تھی۔ وہ کیوں اسے ناآشنا رکھے ہوئے تھی؟ کیسے اتنا درد اور تکلیف برداشت کر رہی تھی؟ سفیر سے اس کا پیچھا کس صورت میں چھڑوایا جا سکتا تھا۔ وہ لاتعداد سوچوں میں غرق تھا جب اسے چارپائی پر کسی کے بیٹھنے کا گمان ہوا۔ رخ موڑے دیکھا تو وہ تھکے، تھکے سے شیر گل تھے۔ جو یہ سب سن کر دو دن میں ہی بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔

"ابا کچھ سوچا تو نے؟ سفیر اب زینی تک پہنچ گیا ہے۔ کوئی تو حل ہو گا پیچھا چھڑوانے کا؟"

وہ سوالیہ انداز میں پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔ شیر گل چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتے رہے۔ پھر کچھ بولنے کے قابل ہوئے۔

"ایک طریقہ ہے۔"

ان کا انداز سرگوشیانہ تھا۔

"کیا؟" مرتضیٰ فوراً سیدھا ہوا۔

"تم اس سے شادی کر لو۔"

☆☆☆☆☆

"کارزارِ دہر"

جب مقابلہ ہوا وقت سے

تو زمانہ سامنے آ کھڑے ہوئے

جو بیتے راز تھے

وہ سامنے آنے لگے

اور کارزارِ دہر میں

انسان کی ہار ہوئی

یہ تو ازل سے چلا آ رہا ہے کہ

وقت اور زمانے، زمانے اور وقت

ان کی جنگ میں ہارتا

ہمیشہ انسان ہی ہے

☆☆☆☆☆

" میں اس سے کیا کر لوں؟"

مرتضیٰ نے ناسمجھی سے ان کی جانب دیکھا۔ گل شیر نظریں ارد گرد گھمانے لگے۔ وہ بھی یہ بات کر کے شرمندہ تھے۔ حالات اگر ساز گار ہوتے تو وہ کبھی ایسا نہ کہتے، مگر اب حالات، وقت اور زمانہ انھیں ایسے موڑ پر لے آیا تھا کہ ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

" اس۔۔۔ اس سے شادی کر لو۔ تم دونوں ایک باپ کی اولاد نہیں ہو تم۔۔۔ اس سے شادی۔۔۔ کر سکتے ہو۔"

وہ سر جھکا گئے۔ مرتضیٰ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ وہ بات تھی جو وہ کبھی سننا نہیں چاہتا تھا۔ مر کر بھی نہیں۔ اور اب یہ بات؟ کیسے؟ کمرے میں خاموشی تھی مگر باہر صحن میں کھیلتی زینی اور سمی کے قہقہے بخوبی سنے جا سکتے تھے۔ سمی کے آنے کے بعد وہ ٹھیک ہو جاتی تھی۔ اب بھی وہ گڈی، گڈا کی شادی کروانے میں مصروف تھیں۔

" یار یہ کیا بات ہوئی ایک بار اسے لالہ بھی بنایا تھا اور اب اسی گڈے سے شادی؟"

یہ زینی کی تیکھی آواز تھی۔ مرتضیٰ پر منوں بوجھ آن پڑا تھا۔

اس نے سر اٹھا کر جتاتی نظروں سے گل شیر کی جانب دیکھا۔ گل شیر بھی نظریں چرا گئے۔ مرتضیٰ بغیر کچھ کہے اٹھ کر باہر نکل گیا۔ گل شیر خاموشی سے خالی چوکھٹ کی جانب دیکھتے رہے۔ چوکھٹ کے باہر زمین پر خشک پتے جا بجا بکھرے ہوئے تھے۔ وہ اس چوکھٹ سے سر پٹخ تو رہے تھے مگر اندر نہیں آپا رہے تھے۔ کمرے میں خاموش بیٹھے گل شیر کو مرتضیٰ کی آواز سنائی دی۔

" زینی۔۔۔ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس گڈے سے شادی نہیں ہو گی۔ میں نیا گڈا لا دوں گا۔"

اور پھر سمی اور زینی کی آوازیں آئیں۔ خوشی سے چہکتی آوازیں، پھر لمبی خاموشی۔ کمرے میں خاموشی مزید بڑھتی چلی گئی۔ گل شیر کو جواب مل چکا تھا۔ انھیں مرتضیٰ کا جواب مل چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

(مرتضیٰ اور زینی کا نکاح شرعیت میں جائز نہیں ہے۔یہ ہم سب جانتے ہیں۔کہ اگر ماں مشترکہ ہو اور باپ مختلف ہوں تو نکاح جائز نہیں ہے۔میں بھی جانتی ہوں مگر یہ ایک ٹویسٹ ہے اس لئے گھبرائیں مت❤)

☆☆☆☆☆

وہ واقعی بڑے دل جگرے کا آدمی نکلا تھا۔نہ صرف اسے قبول کیا تھا بلکہ اس کی کوکھ میں پلتی ناجائز اولاد کو بھی قبول کر لیا تھا۔اس سے زیادہ معتبر شخص کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔صباء کو یہی لگتا تھا کہ اس سے زیادہ معتبر شخص کوئی اور نہیں ہے۔اسی کے سبب تو وہ سارا دن ساس، نند کے طعنے میٹھے گھونٹ سمجھ کر پی جاتی تھی کہ جب بھی وہ لوٹتا تو اس کے رستے زخموں پر اپنے میٹھے بولوں کا مرہم رکھ دیتا تھا۔اس کی بکھری ذات کو اس محبت سے سمیٹ گیا تھا کہ سب کچھ کہیں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔کہیں ماضی کی دھول میں۔مہینے، سال اور سال کئی سال میں بیت گئے تھے۔یہاں تک کہ وہ کسی غیر مرد کے ہاتھوں نوچی اور ریزہ، ریزہ ہوئی لڑکی، وہ لڑکی جسے اس کے محرم نے دوبارہ سے ہمت و محبت سے نوازا اپنا وقت پورا کیے منوں مٹی تلے جا سوئی۔وہ اس بات سے انجان تھی کہ ابھی تو تقدیر کو اس کی اولاد سے بھی کئی امتحان درکار ہیں۔

☆☆☆☆☆

آج اتوار تھا سب سے بہترین دن اور کبوتروں کے لئے بھی سب سے بہترین دن کہ آج سارا دن زینی کو ان کے سامنے رہنا تھا اور آج کبوتروں کو بھی ہر شے سے بے نیاز ہو کر یہیں رہنا تھا۔زینی کمرے سے نکلی تو منڈیر پر بیٹھے کبوتروں کی گردن اوپر نیچے حرکت میں آ گئی۔وہ زینی کا مطالعہ کرنے میں مشغول تھے جو نیلے سوٹ میں گلابی دوپٹہ گردن کے گرد لپیٹے گہرا سانس لئے سکون محسوس کرنے میں مگن تھی۔

آسمان کی نیلی چادر پر آج کوئی بادل نہ تھا مگر دلچسپ بات یہ تھی کہ کوئی سورج بھی نہ تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں، ان ہواؤں کے سنگ جھومتے پھول، پتے، ہر برگ و گل میں تازگی کا انوکھا احساس جاگ اٹھا تھا کہ ان کے ساتھ سوات کی شہزادی بھی محوِ رقص تھی تو ممکن کیسے نہ تھا وہ بھی نہ جھومتے، کبوتروں میں بھی جیسے امید اور خوشی کی نئی امنگ جاگ گئی تھی وہ بھی منڈیر چھوڑے اوپر آسمان پر قلابازیاں لگانے لگے۔ آج خوشی کا دن تھا آج زینی بلکل ٹھیک تھی تو ممکن کیسے تھا وہ چپ بیٹھتے۔ زینی کچھ لمحے یونہی گھومتی رہی یہاں تک کہ اسے پھوپھی کی آواز سنائی دی۔

" پاگل ہو گئی ہے زینی؟ پھر سے موچ پڑ جانی ہے۔"

زینی رکی۔ نامحسوس انداز میں کبوتر بھی منڈیر پر جا بیٹھے۔

" نہیں پھوپھو میں تو بس۔۔۔"

اس کی بات منہ میں رہ گئی جب پھوپھی بول اٹھیں۔

" ٹھیک ہے بہت گھوم لیا اب ادھر آ جا میرے ساتھ کوئی کام کروا لیا کر۔"

زینی منہ بسورے ان کی جانب چلی آئی۔

" کیا پھوپھو؟"

اس کا انداز سوالیہ تھا یا شکوہ کرتا رومانہ سمجھ نہ پائی پھر سر جھٹک کر پیچھے کی جانب اشارہ کیا۔ اس نے ابرو اچکائی جیسے پوچھا ہو کہ کیا؟

رومانہ نے رخ موڑ کر قدرے دھیمی آواز اپنائی۔

" جھلی ساتھ کی چھت پر کھڑی عطیہ تجھے گھور رہی تھی۔ لڑکی پر جوانی چڑھے بعد میں، یہ لوگ گھورنے پہلے آ جاتے ہیں۔ ایسے میں انھے موقع مل جاتا ہے بات کرنے کا۔"

رومانہ کا اشارہ جس جانب تھا وہ سمجھ چکی تھی۔ اسے جی بھر کر غصہ آیا۔ ایک تو یہ لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ بغیر مقصد دوسروں کے کام میں ٹانگ اٹکا لیتے ہیں۔ اب انسان کیا گھر کی حدود میں کھل کر جی بھی نہیں سکتا۔ اس کی بھی اجازت نہیں دیتے یہ لوگ۔ وہ کونڈی میں لہسن کوٹتے سوچ رہی تھی۔ مختلف سوچیں ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ کبوتر اب وہاں پر سکون ہو کر بیٹھ چکے تھے آج اس منڈیر کو چھوڑ جانے کا دل نہیں تھا۔

☆☆☆☆☆

وہ آج حویلی تھا۔ بخش آج بھی سفیر کے ساتھ ہی ڈیرے کو نکلا تھا۔ آج وہ جان بوجھ کر سفیر کے ساتھ نہ جا پایا۔ اس روز کے واقعے کے بعد سے وہ خود جان بوجھ کر سفیر سے ملاقات کرنے سے کترا رہا تھا، سفیر اگر کہیں نظر بھی آجاتا تو وہ بہانے سے اس جگہ سے ہٹ جاتا شاید یہی اس کے لئے اور سفیر کے لئے بھی بہتر تھا۔ ورنہ یا وہ خود کو کچھ کر بیٹھتا یا سفیر کی جان لے لیتا۔ بخش بھی اس کی جانب معنی خیز ہنسی اچھال کر اسے مزید تپاتا رہتا تھا۔

وہ اب کسی صورت رسک نہیں لے سکتا تھا۔ زینی کو اب اسکول چھوڑنے اور لینے وہی جایا کرے گا اس بات کا فیصلہ وہ کل رات ہی کر چکا تھا اور زینی کو وہ اچھے سے سمجھا چکا تھا کہ کہیں باہر نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مرتضیٰ معاملے کو آرام سے حل کرنا چاہتا تھا وہ کسی قسم کا کوئی نقصان یا غلطی نہیں چاہتا تھا۔ وقت پڑنے پر وہ بڑے سرکار کو شکایت بھی لگا سکتا تھا مگر ابھی شاید وہ وقت نہیں تھا۔ ضرورت پڑی تو عزت کی حفاظت کے لئے وہ جان لے بھی سکتا تھا اور دے بھی سکتا تھا کہ ایک عزت ہی ہوتی ہے جو کسی غریب کی کل متاع ہوتی ہے وہ بھی چھین لی جائے تو وہ صحیح معنوں میں فقیر بن جاتا ہے۔

سر جھکائے بیٹھے وہ مختلف سوچوں میں گم تھا جب اسے قریب ہی آہٹ کا احساس ہوا۔ نظریں زنانہ پاؤں پر پڑیں تو جھٹکے سے سر اٹھایا پھر شکر کا سانس بھرا۔ وہ خجستہ تھی اور اسے لگا۔۔۔ اس نے سر جھٹکا۔

"بولیں" متوازن لہجہ۔ خجستہ نے چادر سر پر برابر کی۔

"چھوٹی بی بی کو لائبریری جانا ہے۔وہ ابھی باہر آنے ہی والی ہیں۔بڑی خانم نے کہا ہے کہ آپ کے ساتھ جائیں۔"
خجستہ نے مدعا بیان کیا پھر عجلت میں مڑی غالباً کوئی کام یاد آگیا تھا۔اسے حیرانی ہوئی۔کیا خانزادی اس کے ساتھ اکیلی جائیں گی؟

لاتعداد سوالات اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔تبھی سر اٹھا کر اس نے حویلی کے داخلی دروازہ کی جانب دیکھا۔سہ پہر حویلی پر اتر چکی تھی۔نارنجی دھوپ اس کی راہ میں رکاوٹ بنی اس نے ماتھے پر ہاتھ ٹکا دیا تو منظر واضع ہوتا گیا۔سہج، سہج کر شہزادیوں کی مانند قدم زمین پر رکھتے وہ حویلی کی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔گلابی اور سفید شلوار قمیض میں دور سے وہ حویلی کے باغ کا ایک پھول محسوس ہوئی۔روش پر قدم رکھتے ہی ارد گرد لپٹی چادر کو ایک بار پھر سے برابر کیا۔نقاب سے جھانکتی وہ نیلی آنکھیں جب قریب پہنچیں تو تپش کا احساس کم ہو گیا۔اب سورج کی جانب وہ ایسے پیٹھ کیے کھڑی تھی کہ مزید مرتضیٰ کو ماتھے پر ہاتھ ٹکانا نہ پڑا۔ہاتھ واپس پہلو میں جا گرا۔نیلی آنکھیں ساحرانہ آنکھیں تھیں کہ جب اٹھتیں مقابل کو زیر کر دیتیں۔مگر مرتضیٰ اپنی حدود جانتا تھا تبھی پہلے ہی کے فاصلے کو مزید بڑھا کر نظروں کا زاویہ بدل گیا۔

"بندہِ ناچیز یہ پوچھ سکتا ہے کہ آیا کوئی اور بھی ساتھ جانے والا ہے کہ نہیں؟"

اس کے سوال کرنے کا انداز، کشف کا جی چاہا کہ اسے کہے نہیں آپ بندہِ ناچیز نہیں ہو، کبھی میرے دل سے پوچھو آپ کون ہو؟ آپ کی کیا حیثیت ہے۔پھر دل کو ڈپٹ کر وہ کچھ بولنے کے قابل ہوئی۔

"بس ہمیں ہی جانا ہے۔"

یہ پہلی بار تھا کہ اس نے "ہمیں" کا لفظ اپنے لئے ہی نہیں مرتضی کے لئے بھی بولا تھا۔

"جو حکم خانزادی صاحبہ۔"

وہ مؤدب سا بولا پھر وہاں سے ہٹ گیا اسے گاڑی نکالنا تھی کشف کی بے تاب نظریں بھی گردش میں آ گئیں۔ تبھی نظر حویلی کے داخلی دروازے پر گئی جہاں سے خجستہ بھی چادر سنبھالے چلی آ رہی تھی۔

"چھوٹی بی بی۔۔۔بڑی خانم کا حکم ہے کہ میں بھی ساتھ جاؤں۔"

یہ سن کر جہاں گاڑی سے باہر نکلتے مرتضیٰ کو سکون محسوس ہوا وہیں کشف بے چین ہو گئی۔وہ جانتی تھی بی جان کبھی اسے اکیلا جانا نہیں دیں گی۔ آخری وقت پر ہی صحیح مگر خجستہ کو بھیج ضرور دیں گی۔وہ خاموش ہو گئی وہ بھلا کر بھی کیا سکتی تھی۔تب چونکی جب مرتضی کی آواز سنائی دی۔

"تشریف رکھیں۔"وہ گاڑی کا دروازہ تھامے کھڑا تھا۔خجستہ دوسری جانب سے جا بیٹھی تھی۔

"آ۔۔آپ رہنے دیں۔۔۔ہم خود بیٹھ جائیں گے۔"

اسے یوں مرتضیٰ کا خود کے لئے جھکنا اچھا نہیں لگا۔یہ رکھ رکھاو،یہ غلام،مالک کا فرق۔دوسری جانب مرتضیٰ کی گہری جانچتی نظریں اس کی نیلی آنکھوں پر آ ٹھہریں۔وہ گڑبڑائی۔یہ گہری آنکھیں اسے ورق،ورق پڑھنے لگی تھیں۔وہ اگلے ہی لمحے نظریں چرا گئی۔ہاتھوں کو باہم سختی سے ملا ڈالا۔مرتضیٰ نظریں ہٹا گیا۔یہ جو جذبہ وہ خانزادی کی آنکھوں میں اس رات اور اب دیکھ رہا تھا یہ نہ صرف اس کے لئے نقصان کا سبب بننا تھا بلکہ کشف کے لئے بھی۔وہ اس جذبے کو یہیں کچل دینا چاہتا تھا۔

"خانزادی صاحبہ۔۔۔یہ میرا فرض ہے۔"

سپاٹ انداز۔لہجے کی تپش ایسی تھی کہ اس نے کشف کو مزید کچھ بولنے ہی نہ دیا سو وہ خاموشی سے گاڑی میں سوار ہو گئی اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی مرتضیٰ نے دروازہ بند کیا پھر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔کشف کے بلکل اگلی سیٹ پر۔اس سے دور نہیں تو پاس بھی نہیں،کشف کا دل یک بارگی سے دھڑکا۔اس گاڑی میں اس کی خوشبو رچی بسی تھی۔اس کے کلون کی وہ گہری،اعصاب پر سوار ہو جانے والی خوشبو۔جس کے زیرِ سایہ وہ کتنی ہی لمحے آنکھیں

موندھیں رہی پھر نظریں اٹھائیں تو آنکھیں سیدھی شیشے سے جھانکتی آنکھوں سے جا ٹکرائیں۔ناجانے وہ آنکھیں کب سے اسے تک رہی تھیں۔ اس کے گالوں پر لالی سی اترنے لگی مگر مقابل اس کی نظروں کا خود کی نظروں میں اترنا پا کر فوراً نظروں کا رخ بدل گیا۔وہ گہرا سانس بھرے رہ گئی۔

☆☆☆☆☆

موسم آج درمیانہ سا تھا۔نہ زیادہ گرم،نہ سرد۔ڈیرے پر آج خاصی خاموشی تھی۔جبکہ گودام میں بہرام کے خوف سے رکھا نشہ آور سامان ایک بار پھر باہر نکالا جا رہا تھا۔بخش اپنی نگرانی میں سارا کام کروا رہا تھا۔ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ میلوں دور بیٹھے بہرام کی نظر ان کی ایک،ایک حرکت پر ہے۔وہ اب صحیح وقت کے انتظار میں تھا۔شک تو اسے اول روز سے تھا تبھی سفیر کی تسلی بھی اسے مطمئن نہیں کر پائی تھی مگر کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا تھا اور اب اس کا پلان کامیاب ہوا تھا۔آہستہ،آہستہ سفیر کا پول اس کے سامنے کھلنے لگا تھا۔

سفیر چھجے تلے تپائی ڈالے بیٹھا تھا۔سامنے حساب کتاب کھلا پڑا تھا۔کئی کاپیاں جن پر خاکے اور نشان بنائے گئے تھے اور کچھ پر ترتیب وار نام لکھ گئے تھے۔وہ بس ان پر نظر ثانی کرنے میں مگن تھا۔

"رشیدے۔۔۔"

اس نے مصروف انداز میں قلم چلاتے ہوئے آواز لگائی۔اگلے ہی لمحے رشید ابو تل کے جن کی طرح اس کے سامنے تھا۔

"جی سرکار؟"

وہ مؤدب انداز میں سر جھکائے پوچھ رہا تھا۔

"زمینوں کو جتنا پانی لگایا ہے اس کا حساب کدھر ہے؟اور کل پانی کس کو لگانا تھا؟"

وہ صفحے پر کچھ لکھ رہا تھا۔

"سرکار حساب تو اس نیلی کاپی میں ہے اور کل جی پانی لگانے کی باری میری اور عظیم کی تھی۔"

ساتھ ہی آگے بڑھ کر کاپی اٹھائی اور اس کی جانب بڑھادی۔

"اچھا ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں۔ تو ایک کام کر جانوروں کو کھانا پانی ڈلوا۔"

ابرو اٹھائے اسے جانے کا اشارہ کیا اور ایک بار پھر کاپی پر جھک گیا۔ نیلی سیاہی سفید صفحے کو بھرتی جا رہی تھی۔ کل آغا جان کو حساب کتاب پیش کرنا تھا۔ دور کسی کی نظر اب تک سفیر پر جمی تھی اور پل بھر بعد سفیر سے ہٹا کر اندر کی جانب کھڑے ہدایات دیتے بخش پر آ جمیں۔

☆☆☆☆☆

یونیورسٹی کے کشادہ گراؤنڈ میں جا بجا طالبات بکھرے ہوئے تھے۔ اکثریت صبح، صبح یونیورسٹی حاضری دینے کم اور کیفے ٹیریا میں کھانے پینے زیادہ آتی تھی۔ وہ دونوں بھی اس وقت کیفے ٹیریا میں ہی پائے جاتے تھے کچھ روز تک ان کے چوتھے سمیسٹر کے امتحان شروع ہونے والے تھے۔ یونی کی آدھی عوام تو پڑھاکو اور کتابی کیڑا ابھی سے بن چکی ہی مگر مجال جو وہ اب تک سنجیدہ ہوئے ہوں، وہی روز کا آنا، کسی کو تنگ کرنا، ڈانٹ کھانا کبھی ڈین کے آفس کا چکر لگا لینا اور پھر ہوسٹل۔ شب و روز یونہی گزر رہے تھے۔ اس روز کے بعد سے صفا اور مروا سے سامنا تو ہوا مگر ان کی جانب سے اب تک جوابی کاروائی نہیں ہوئی تھی۔ خود زعیم اور صائم دونوں ہی حیران تھے مگر کیا کرتے اس روز کے بعد سے دوبارہ تنگ کرنے کا ارادہ بھی کیا تو ان کی گھوریاں ہی ایسی ہوتیں کہ چار و ناچار انھیں خاموشی اختیار کرنا پڑتی۔

"یار کوئی کاروائی نہیں ہوئی دشمنوں کی جانب سے؟ اتنی خاموشی مجھے ہضم نہیں ہو رہی کچھ تو گڑبڑ ہے۔"

زعیم شکی انداز میں بولتا جا رہا تھا۔ سامنے بیٹھا صائم پراٹھے سے انصاف کر رہا تھا۔ زعیم کی بات پر رکا پھر رومال سے ہاتھ پونچھے۔

"دیکھ میرے بھائی۔۔۔مجھے نہیں لگتا کہ ایسا کچھ ہو گا۔وہ شریف اور اچھی لڑکیاں ہیں وہ ہمارے ساتھ کچھ کر ہی نہیں سکتیں۔"

وہ نفی میں سر ہلاتا مکمل بے فکرے انداز میں بول رہا تھا۔زعیم مطمئن نظر نہیں آرہا تھا۔صبح سے ہی اس کا ماتھا ٹھنک رہا تھا وجہ کل یونی کے باہر پارکنگ میں کھڑی صفا کے خطرناک اشارے تھے جیسے بول رہی ہو اب بچ کر دکھانا۔اب تک تو سب ٹھیک تھا مگر وہ انجان تھے کہ مصیبت بس دو قدم کے فاصلے پر ہے اور شرماتے ہوئے ان کی جانب چلی آرہی ہے۔صائم بل ادا کرنے گیا تو زعیم نے ٹانگیں پاس کی کرسی پر رکھ دیں۔فرضی کالر جھاڑے اور سن گلاسس اتار کر پاس میز پر رکھ دیے۔وہ بالوں میں ہاتھ چلاتا ارد گرد دیکھنے میں مگن تھا جب اسے اپنے ساتھ کسی کے بیٹھنے کا گمان ہوا۔لمحے کے ہزارویں حصے میں کسی خدشے کے زیرِ اثر اس نے گردن موڑی تھی اور اس کے ساتھ وہ بیٹھی تھی جس کے ساتھ بیٹھنے سے زعیم شروع دن سے پناہ مانگتا آرہا تھا۔"خودکشی کی شوقین" تانیہ حبیب۔جو محبت پر ناکامی ملتے ہی خودکشی کی ناکام کوشش کرنے سے بھی گریز نہیں کرتی تھی۔اسکے بازوؤں پر اتنے کٹ تھے کہ اتنے کسی کٹنگ بورڈ پر بھی نہیں ہوتے ہوں گے۔فرنائیل کی گولی بھی اس پر اثر نہیں کرتی تھی۔یہاں کسی نے ٹھکرایا نہیں وہاں تانیہ ہی کیا جس نے خودکشی کی کوشش نہ کی ہو۔وہ ہر حربہ آزما چکی تھی۔بقول یونی کے لڑکوں کے "تانیہ چلتی پھرتی خودکشی کی کلاس ہے۔"وہ واحد لڑکی تھی جسے زعیم کبھی اپنے پاس بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا اور اب اس کا ساتھ بیٹھنا کسی خطرے کی گھنٹی سے کم نہ تھا۔

"آئی لو یو ٹو۔"

ابھی وہ ایک دھچکے سے نہ سنبھلا تھا کہ ایسی ضرب لگادی گئی کہ وہ بلبلا ہی گیا۔"ٹو" کا کیا مطلب تھا؟اس نے کب ایسا کچھ کہا؟اس نے بالوں میں ہاتھ چلایا۔ٹانگیں نیچے کیں۔گردن گھما کر صائم کو تلاش کرنا چاہا جو کاؤنٹر کے پاس بت بنا کھڑا تھا کہ یہاں زعیم کی آواز سنی نہیں وہاں پاش،پاش ہو جائے۔زعیم نے بے بسی سے اشارہ کیا مگر صائم

سن کھڑا تھا اور تبھی زعیم کی نظر دوسری جانب کھڑی صفا اور مروا پر گئی۔ مروا کی نظروں میں ترحم جبکہ صفا کی نظروں میں تمسخر تھا اور اسی لمحے زعیم کو اندازہ ہوا کہ اس نے کس سے پنگا لیا تھا۔ جس نے جوابی کاروائی بھی بڑی ضرب لگا کر کی تھی۔ ساتھ بیٹھی تانیہ کا شرمانا جاری تھا وہ کہہ رہی تھی۔ "زعیم آپ کو پتا ہے میں آپ کو چھپ ،چھپ کر دیکھتی تھی۔ بس کبھی مجھے چھوڑ کر مت جایئے گا ورنہ اب کی بار خودکشی کی تو شاید مر جاؤں۔" ساتھ ہی کوئی رقعہ اسے تھمایا جس پر زعیم کی جانب سے دھواں دار عشق کا اظہار کیا گیا تھا اور زعیم کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ یہ عشق کب، کہاں، کیسے ہوا۔ نا جانے کیسے وہ تانیہ سے کلاس کا بہانہ کیے جان چھڑوا کر نکلا تھا اور لڑکے اسے ایسے رشک سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ نا جانے کس قید سے رہا ہو کر نکلا ہے۔

☆☆☆☆☆

چہکتی صبح کا آغاز ہو چکا تھا۔ خالی منڈیر پر کبوتر آ بیٹھے تھے۔ گردن بھی حرکت میں تھی کیوں کہ زینی کبھی اٹاری میں جاتی، وہاں سے برتن لاتی اور صحن میں بچھائی چٹائی پر رکھ دیتی۔ یونیفارم پہنے وہ بالوں کی چٹیا بنائے ہوئے تھی۔ قمر ایک جانب چارپائی پر بیٹھا سر جھکائے کتاب دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس کے پرچے شروع ہو چکے تھے اس لئے زیادہ وقت وہ پڑھائی میں ہی مصروف رہتا۔ مرتضیٰ تیار ہوئے باہر نکلا تھا، غالباً پاس کی دکان تک گیا تھا۔ گل شیر دھلے چہرے کے ساتھ غسل خانے سے نکلے تھے۔ سر اٹھا کر موسم کا جائزہ لیا جو کہ درمیانہ تھا۔

"آج لگتا ہے بارش ہو گی۔"

ساتھ ہی پیشن گوئی بھی کر دی۔ پھر اپنی ہلکی سی داڑھی کو ہاتھوں سے سنوارتے چٹائی پر آ بیٹھے۔

"خور (بہن) میری ایک ہی روٹی بنانا۔"

جواباً رومانہ کی آواز سنائی دی جو خفا لگتی تھیں۔

"لالہ خیال نہیں رکھتا تو اپنا۔ صحت گر رہی ہے اور ایک روٹی پر کہاں گزارا کرے گا پورا دن؟"

اسی دوران دروازہ کھولے مرتضیٰ بھی اندر چلا آیا۔وہ سیدھا ہاتھ دھونے چل دیا۔گل شیر نے ٹھنڈی آہ بھری ۔اس روز سے مرتضیٰ نے ان سے زیادہ بات چیت نہیں کی تھی۔وہ خفا تھا اور اس بات سے وہ بھی اچھے سے واقف تھے۔شاید اس بات نے مرتضیٰ کو دکھ پہنچایا تھا۔وہ تو زینی کا بھلا سوچ رہے تھے اس بات سے بے پرواہ ہوئے کہ مرتضیٰ زینی کے بارے میں ایسے جذبات رکھتا ہی نہیں تھا۔مگر وہ کیا کرتے دونوں ہی ان کو ایک برابر تھے۔نظریں چائے کی پیالیاں لاتی زینی پر ٹک گئیں۔ہائے یہ بیٹیاں کتنی جلدی بڑی ہو جاتی ہیں ہمیں پتا بھی نہیں چلتا اور ان کی رخصتی کا وقت بھی چلا آتا ہے۔ہلکی سی نمی نے منظر میں دھندلاہٹ پیدا کی تو انہوں نے فوراً سر جھکائے آنکھوں کو نامحسوس انداز میں پونچھا۔ان کی بیٹی بہت معصوم تھی۔بہت زیادہ اور خان کی نظر کا اس پر پڑنا خطرے کی علامت تھا۔وہ بھی سفیر کی حقیقت سے ناآشنا رہتے اگر جو مرتضیٰ انھیں آگاہ نہ کرتا۔انھیں اس معاملے پر سنجیدگی سے سوچنا تھا۔

☆☆☆☆☆

سینے پر بازو لپیٹے اس کی نظریں اطراف کا جائزہ لینے میں مگن تھیں۔ابھی تھوڑی دیر قبل ہی اس نے ڈیرے کے ایک ملازم کو یہاں ٹہلتے دیکھا تھا۔غالباً وہ سفیر کے حکم پر یہاں آیا تھا مگر مرتضیٰ کو دیکھتے ہی الٹے پاؤں لوٹ گیا تھا ۔مرتضیٰ جانتا تھا اب جلد یا بدیر سفیر کا پیغام مل جائے گا اور اسے سفیر کے سامنے حاضر ہونا ہی پڑے گا۔وہ گیٹ سے باہر نکلی تو مرتضیٰ حویلی کی گاڑی سمیت کھڑا تھا۔وہ چادر مزید سرکا کر سر پر لئے گاڑی کی طرف چلی آئی۔

"سلام لالہ۔۔۔"

اس کی آواز چہک رہی تھی۔ساتھ ہی سمی بھی تھی۔وہ ان دونوں کو ایک ساتھ ہی اسکول چھوڑتا اور لینے آتا تھا۔

"والسلام۔۔۔آج دیر کر دی باہر آنے میں۔"

ان کے لئے گاڑی کا دروازہ کھولا پھر بند کیا اور گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔

"بس تھوڑا سا کام تھا مس کو۔۔۔اس لئے۔"

سمی جلدی سے بولی۔زینی کھکھلائی۔

"اہم۔۔۔"

وہ مصنوعی کھانسی تو سمی نے اس کے پاؤں پر پاؤں دے مارا۔

"آج لگتا ہے کسی کو سبق نہیں آیا۔"مرتضیٰ کا چھوڑا تیر نشانے پر جا بیٹھا۔سمی نے گھما کر ایک تھپڑ زینی کی کمر پر دے مارا جس پر زینی نے اسے گھورا۔مرتضیٰ کو اس کے انداز پر ہنسی آگئی۔

"کسے کھانے ہیں گول گپے؟"

یہ پوچھنا تھا کہ زینی ایک ہی جست میں پیچھے سے چھلانگ لگائے فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھی۔

"نیکی اور پوچھ،پوچھ۔جلدی کریں۔"

آواز خوشی سے چہک رہی تھی۔مرتضیٰ نے مسکراہٹ دبائی اور گاڑی ریڑھی کے قریب جا روکی۔

"تم دونوں بیٹھو میں لے آتا ہوں۔"

انجن بند کرتا وہ انھیں ہدایات دیتا گاڑی سے نکلا۔دس منٹ بعد ہی وہ گول گپوں کی ٹرے لئے واپس آ چکا تھا۔

"یہ پکڑو زینی۔ایسا کرو پیچھے جا کر سمی کے ساتھ بیٹھ کر کھالو۔پیچھے سے کچھ نظر نہیں آتا۔میں باہر انتظار کرتا ہوں۔"

سمی کے پردے کا لحاظ کرتا وہ باہر ہی رہا۔محض دس منٹ سے بھی کم عرصے میں وہ دونوں ٹرے چٹ کر چکی تھیں ۔زینی نے نقاب کیا اور پھر ہاتھ بڑھا کر ہارن بجایا تو کسی سے فون پر بات کرتا مرتضیٰ اختتامی کلمات کہتا گاڑی کی جانب چلا آیا۔فون واپس جیب میں رکھا۔زینی نے خالی ٹرے اس کی جانب بڑھائی آنکھیں دو بار پٹپٹائیں۔مرتضیٰ کو ہنسی آئی۔

"مجھے معلوم تھا۔ دوسری ٹرے بن رہی ہے۔ تب تک املی کا پانی پی لو اور آنکھیں صاف کرو۔ مجھے لڑکیوں کی سمجھ نہیں آتی برا حال ہو جائے گا پھر بھی گول گپے کھانے نہیں چھوڑیں گی۔"

وہ جیب سے واپس فون نکالتا بڑبڑا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

وہی ہوا جس کا اسے یقین تھا۔ وہ ان دونوں کو گھر چھوڑے ابھی حویلی پہنچا ہی تھا جب علی ڈیرے سے پیغام لئے آ گیا۔

"سرکار نے تمہیں یاد کیا ہے۔"

مرتضیٰ جانتا تھا کہ سفیر نے اسے کیوں طلب کیا ہے۔ خود پر جبر کرتا وہ گاڑی لئے ڈیرے کی جانب چل دیا۔

☆☆☆☆☆

ڈیرے کے ماحول میں ہلکا سا تناؤ تھا۔ روش پر تیزی سے ادھر ادھر قدم اٹھاتا سفیر شاید غصہ ضبط کرنے کے چکر میں تھا۔ بھوری قمیض شلوار کے ساتھ خاکی شال کندھوں پر ڈالی ہوئی تھی۔ چہرہ غصے سے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی بخش بھی ہم قدم ہونے کی کوشش میں تھا۔

"سرکار بڑی کوشش کی، کہ وہ چھوکری کہیں تنہا مل جائے مگر نہیں، وہ مرتضیٰ۔۔۔" خاصا زور دیا گیا۔ "ہی اسے صبح چھوڑنے اور واپس لینے جاتا ہے۔ ایک لمحے کو تنہا نہیں چھوڑ رہا اب۔ ساتھ دوسری چھوکری بھی ہوتی ہے۔"

بخش اب باقاعدہ ہانپ رہا تھا مگر مرتضیٰ کے خلاف جانے کا اس سے بہتر کون سا موقع ہو سکتا تھا؟ سفیر کی رنگت میں گلابیاں گھل رہی تھیں۔

"بہرام لالہ کا دھیان بمشکل خود سے ہٹایا تھا اور اب یہ نئی مصیبت۔۔۔"

لہجے میں کوفت بول رہی تھی۔بے زاری ہی بے زاری تھی۔کتنے عرصے سے وہ زینی سے مل نہیں پایا تھا اور اس بات کا اب ملال بھی ہونے لگا تھا۔وہ اب اس سے نہیں ڈرتی ہو گی۔بمشکل اس کے دل میں اپنا خوف پیدا کیا تھا وہ اسے اتنا بے بس بنا دینا چاہتا تھا کہ وہ خود جھک جاتی۔

"سرکار ویسے اگر اس روز آپ اس سے ویسی باتیں نہ کرتے تو شاید وہ اس چھوکری کے لئے اتنا محتاط نہ ہوتا۔"

بخش نے اپنی ذہانت جھاڑنی چاہی مگر وہ کیا جانتا تھا کہ پہلے کا بھرا بیٹھا سفیر اسے ہی سخت سست سنا دے گا۔

"اب تو مجھے سکھائے گا کہ کیا کام کیسے کرنا ہے؟نکما،نکھٹو،دفع ہو جا ابھی کے ابھی۔۔۔"

اس کے لہجے سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔بخش نے وہاں سے ہٹنے میں ہی غنیمت جانی۔وہ مڑا تو پیچھے ہی مرتضیٰ کھڑا تھا وہ کب آیا تھا؟وہ نہیں جانتا تھا مگر اس نے مرتضیٰ کو ایسے دیکھا جیسے سالم نگل جائے گا۔اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ اس شخص کی جان لے لیتا۔ہمیشہ اس کی وجہ سے سرکار اسے ڈانٹتے تھے اور اسی کی وجہ سے وہ سرکار سے دور ہوا تھا۔وہ کلستے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گیا۔مرتضیٰ نے سر جھٹکا پھر سفیر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"سلام سرکار۔"

لہجہ سادہ تھا یا سپاٹ،اس کا اندازہ سفیر نہ کر پایا۔

"کہاں دفع تھے تم؟"

وہ جی اکڑا کر بولا۔اس کے اتنے ہتک آمیز لہجے پر بمشکل مرتضیٰ نے غصے پر قابو پایا۔وہ تنخواہ کام کی لیتا تھا،بے عزتی کروانے کی نہیں۔مگر ہمارے ہاں تو یہ رواج رائج ہو چکا ہے کہ ہم غلام کو اپنی جائیداد سمجھ لیتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کے ساتھ خواہ جیسا بھی سلوک رکھیں یہ بے زبان ہیں کچھ نہیں کہہ پائیں گے۔

"مجھے اپنی بہن کو گھر چھوڑنا تھا۔حالات ٹھیک نہیں ہیں۔"

وہ ارد گرد دیکھتا اب کی بار نہایت خشک لہجے میں بولا تھا۔سفیر چونکا پھر لہجہ بھاری کیا۔

"کتنے کام تھے مجھے تجھ سے ؟بخش کو جانتا ہی ہے تو۔کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔"

وہ بڑبڑایا۔

"سرکار میں ہر کام کر دوں گا بس مجھے یہ پندرہ منٹ دے دیا کریں۔"

اب کی بار اس کے لہجے میں نہ منت تھی نہ لہجہ سپاٹ تھا۔ہاں مگر حد سے زیادہ عام انداز تھا۔سفیر چند لمحے تک کچھ سوچتا رہا پھر بے ساختہ امڈ آنے والی مسکراہٹ پر قابو پایا۔

"تو تم اس چھوکری کو۔۔۔"رکا پھر تصیح کی۔"مطلب اپنی بہن کو لینے پیدل جائے گا۔حویلی کی گاڑی اس کام کے لئے استعمال نہیں ہو گی۔"

"جی بہتر۔"

مرتضیٰ نے سر ہلایا۔نظریں اس کی نظروں میں گاڑ رکھی تھیں۔یہی کافی تھا کہ اجازت مل گئی تھی۔پھر چاہے پیدل ہی آنے جانے کی اجازت کیوں نہ تھی۔

☆☆☆☆☆

اسے پورا یقین تھا کہ آج وہ تانیہ نامی عذاب سے بچ سکتا ہے جو پچھلے دس دنوں سے اس پر مسلط تھا۔شروع میں تو وہ انسانیت کے تقاضے نبھاتا رہا مگر وہ عجیب پاگل اور سر پھری لڑکی تھی جو آئے روز نت نئی فرمائشیں کرنے لگی تھی ۔بقول اس کے زعیم کو محبت ثابت کرنے کے لئے اپنے بازو پر کٹ لگانا ہو گا۔اور اگر اس نے ایسا نہ کیا تو وہ ابھی نبض کاٹ ڈالے گی۔یہ سننا تھا زعیم کا دماغ ہی گھوم گیا۔وہ اس لمحے کو کوسنے لگا جب اس نے صفا اور مروا کو کمرے میں بند کیا تھا۔شروع، شروع میں اس بات نے اسے خاصا حیران کیا کہ ان کا ٹارگٹ وہی کیوں بنا۔حالاں کہ صائم بھی برابر کا شریک تھا مگر جلد یہ حقیقت بھی کھل گئی جب شریف مروا سب بول گئی۔اس روز زعیم نے صائم کی ایسی طبیعت صاف کی تھی کہ الامان اور معافی پیز اکھلانے کے بعد ملی تھی۔

وہ مفلر سے چہرہ ڈھانپے یونیورسٹی میں داخل ہوا۔صائم کو اس نے بعد میں آنے کا حکم دیا تھا۔یونیورسٹی کی عوام اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے کوئی عجوبہ ہو۔وہ واقع عجوبہ معلوم ہو رہا تھا اب گرمیوں میں کون مفلر پہنتا ہے۔وہ یہ تو دیکھ رہے تھے کہ کوئی لڑکا مفلر پہنے اعتماد سے چلتا آرہا ہے مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ آخر اس مفلر تلے کون ہے؟

پیپر دینے کے بعد وہ اپنی سیٹ سے اٹھا مڑ کر پیچھے بیٹھے صائم کو دیکھا۔صائم نے اشارہ کر دیا تھا جس کا مطلب تھا"تو نکل بھائی میں تیرے پیچھے آرہا ہوں۔"وہ شیٹ وہیں رکھے باہر نکل آیا۔ارد گرد دیکھا۔وہ بلا کہیں نہ تھی۔شاید پیپر دے رہی تھی۔اس نے سکھ کا سانس لیا پھر مفلر اتار کے سانس لیا۔ابھی وہ آنکھیں موندھیں سکون کی سانس بھر ہی رہا تھا جب اسے پاس سے ہنسنے کی آواز آئی۔آنکھیں کھولیں تو سامنے سینے پر بازو باندھے صفا کھڑی تھی۔وہ اس وقت زعیم کو زہر محسوس ہو رہی تھی اور اس کی ہنسی بھی۔زعیم نے کڑواہٹ اندر اتاری۔کیونکہ اب صفا نے بھی کڑواہٹ نکالنی تھی۔

"چچ۔۔۔افسوس۔لڑکیاں منہ چھپاتی تھیں آج کل کیا دور آگیا ہے لڑکے بھی؟چچ۔۔۔"

وہ سر دائیں،بائیں ہلاتے اس کی حالت سے حظ اٹھا رہی تھی۔زعیم کے سر پر لگی تلووں پر بجھی۔اس نے تنک کر مفلر گلے سے اتار ڈالا۔صفا کی مسکراہٹ گہری ہوتی گئی جو اگلے ہی لمحے زعیم کی بات پر ختم ہو گئی۔

"پینڈو عورت یہ فیشن ہے۔مگر تم جیسے لوگوں کو فیشن کی کیا قدر۔"

سر جھٹک کر اس کے سامنے ہی دوبارہ مفلر پہنا۔صفا کے سفید چہرے پر سرخیاں گھلنے لگیں۔

"جاہل آدمی تم ہو گے پینڈو۔۔۔"

وہ مزید بولتی جا رہی تھی مگر زعیم اسے خوب تپانے کے بعد کانوں میں انگلیاں دیے مزے سے گیٹ کی جانب چل دیا۔صفا نے پاؤں پٹخا۔یہ آدمی اسے ہی ڈبل کراس کر جاتا تھا۔

☆☆☆☆☆

پچھلے دس روز سے وہ پیدل ہی انھیں لینے جاتا تھا اور پیدل آنے جانے کا یہ تجربہ بہت مزے کا تھا۔ زینی اس کے روکنے کے باوجود بھی کبھی کبھار درخت پر چڑھ جاتی اور وہ ان کے ساتھ ہی بچہ بن جاتا۔ وہ کینو توڑتے پھر راستے بھر وہی کھاتے رہتے تھے۔

آج واپسی پر وہ کینو کے باغ میں گھس گئے۔ مرتضیٰ باہر کھڑا پہرا دے رہا تھا جبکہ زینی اور سمی پچھلی دیوار پھلانگ اندر گئی تھیں۔

"جلدی کرو مالی آرہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ڈنڈا بھی ہے۔"

مرتضیٰ کی آواز پر زینی کے ہاتھوں میں تیزی آئی۔ فوراً سے دو کینو مزید اتارے اور سمی کے ہاتھ میں پکڑے دوپٹے میں اچھالے۔

"تو نکل۔"

درخت سے اترتے ہوئے وہ تیزی سے بولی۔ سمی نے کینو اسے تھمائے اور پھلانگی۔ ساتھ ہی ہاتھ بڑھایا تو زینی نے اس دوپٹے کی بنائی گٹھی اسے پکڑائی اور فوراً دیوار پھلانگی۔ وہ تینوں تیزی سے وہاں سے نکلے سڑک پر آتے ہی لب سی لئے اور پر سکون انداز میں چلنے لگے۔ مالی ان کے قریب سے گزرا مگر ان کے پر سکون انداز پر اسے بھنک تک نہ پڑی۔

"ویسے شرم کرلو یہ بری بات ہے۔"

مرتضیٰ سامنے سڑک کی جانب دیکھتے آج انھیں سمجھانے کی ٹھان چکا تھا۔

"کیا غلط ہے؟ ہاں بولیں؟"

زینی تیز لہجے میں بولتی الٹے قدم اٹھانے لگی۔ ساتھ ہی چادر تلے کینو کھانے میں مصروف تھی۔

"یہ چوری تھی۔ تین دن تو میں خاموش رہا کچھ نہیں کہا مگر اب یہ بہت ہو گیا ہے۔ دیکھو میری بات سنو۔۔۔ اگر یہ درخت سڑک کنارے لگا ہوتا اور اس پر کوئی پہرا نہ ہوتا تو کینو توڑنے میں کوئی قباحت نہیں تھی مگر اب چونکہ یہ باغ میں لگے ہوئے تھے اور ان پر پہرا دینے کو چوکی دار بھی ہے تو یہ چوری تھی۔"

وہ متوازن لہجے میں بولا۔ تین دن سڑک کنارے لگے درخت سے کینو توڑے تھے مگر آج وہ باغ کی طرف چلی آئی تھیں۔ مجبوراً اسے بھی ان کا ساتھ دینا پڑا۔

"پر یہ مزے کے ہیں۔"

زینی بے بسی سے بولی۔

"جھلی حرام کب مزے کا نہیں ہوتا؟"

اس کی گہری بات پر وہ سناٹوں کی زد میں آگئی۔ ہاتھ میں تھامے کینو کی کاش یونہی رہ گئی۔ سمی نے بھی حسرت سے کینوں کو دیکھا۔

"مگر یہ تو امیر لوگوں کا باغ ہے اگر ہم یہاں سے کینو توڑ بھی لیں گے تو کچھ نہیں ہو گا۔"

ایک خیال جب ذہن میں لپکا تو وہ تیزی سے بولی۔ مرتضی نے نفی میں سر ہلایا۔

"بیشک یہ باغ امیر لوگوں کا ہے مگر یہاں کام کرتا مالی غریب آدمی ہے اسے ان کا حساب دینا ہو گا اور تم لوگوں کو روز قیامت۔"

زینی نے بغیر کچھ کہے خاموشی سے کینو اس گٹھی میں ڈال دیا۔

"یہ واپس کرنے ہوں گے؟"

زینی نے گٹھی مرتضیٰ کی جانب بڑھاتے سوالیہ انداز اپنایا۔ مرتضی جی جان سے مسکرایا زینی کی یہی بات سب سے منفرد تھی کہ وہ سمجھانے پر سمجھ جاتی تھی اور دوبارہ اس کام کے لئے ضد نہیں کرتی تھی۔

"ظاہری بات ہے،ہاں۔۔۔اسے مجھے دو میں واپس کر آتا ہوں تب تک یہیں کھڑی رہو ہلنا مت۔"

انہیں تنبیہ کرتا وہ دوبارہ باغ کی جانب بڑھ گیا۔اسے گئے ابھی تین منٹ ہی گزرے تھے جب سڑک پر دور سے دھول اڑاتی جیپ نظر آنے لگی۔ سمی کی زبان تالو سے چمٹ چکی تھی۔اس میں بولنے کی سکت بھی باقی نہ بچی تھی بمشکل اس نے ٹھوکا دیے ارد گرد دیکھتی زینی کو ہلایا۔زینی نے اس کی سفید پڑتی شکل دیکھی پھر اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو اس کی حالت سمی سے بھی زیادہ بری ہونے لگی۔یہ جیپ صرف ایک شخص کی ہو سکتی تھی اور جس کی یہ جیپ تھی اس کے بارے میں سمی سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔وہ بس آنکھیں موندھیں اپنے انجام کا سوچنے لگی جب زن سے جیپ ان کے پاس سے گزر گئی۔چادر کو تھامے سفید پڑتے اس کے ہاتھ اور چہرے کا سارا خون نچڑ چکا تھا۔زینی نے جھٹکے سے آنکھیں کھولیں اور ہلکا سا رخ موڑے اس راستے کی جانب دیکھا جہاں جیپ دھواں چھوڑتی جا رہی تھی۔اس نے غور کیا تو اسے مرتضی واپس آتا نظر آیا شاید یہی وجہ تھی کہ جیپ ان کے پاس نہیں رکی تھی۔مرتضی کے چہرے کے نقوش میں بھی سختی آچکی تھی۔زینی اور سمی جنھے مرتضیٰ کے قریب آتے ہی سانس آنے لگا تھا پھر سے جیپ کو واپس مڑتا دیکھ کر وہ سانس وہیں اٹکا رہ گیا۔مرتضیٰ بھی چونک کر رکا اور رخ موڑے دیکھا جہاں سفیر جیپ انہی کی جانب لئے آرہا تھا۔ان کے پاس لا کر خاصا دھواں چھوڑنے کے بعد بریک لگائی گئی پھر دروازہ کھلا اور مسکراتا ہوا سفیر باہر نکلا۔کھیڑی میں مقید پاؤں زمین پر چھاپ چھوڑتے جا رہے تھے وہ مونچھوں کو تاؤ دیے،مرتضی کا لحاظ کئے بغیر زینی کی جانب دیکھ رہا تھا۔جوڑنے کے باوجود بھی اس پر یہ ڈر واضع نہیں ہونے دے رہی تھی۔

"سرکار آپ"

مرتضیٰ کی اچانک آواز پر وہ چونکا اور مرتضی کی جانب ابرو اٹھائے دیکھا۔

"ہاں میں یہاں سے گزر رہا تھا تبھی نظر تم پر پڑی تو سوچا یہیں رک کر بات کرتا جاؤں۔"

نظریں زینی پر تھیں جب کہ مخاطب وہ مرتضی سے تھا۔ مرتضی نے مٹھیاں بھینچے ضبط کیا۔

"سرکار میں ادھر کھڑا ہوں۔"

اس کے لطیف سے طنز پر سفیر کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ اس کی مکروہ ہنسی جس پر زینی کا دل دھڑکا۔ یہ ہنسی جب اسے رات گئے یاد آتی تو خوف سے وہ پہروں سو نہ پاتی۔ جبکہ وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے مرتضیٰ کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"مجھے نظر آرہا ہے میں تو بس ویسے ہی ادھر دیکھ رہا تھا۔"

وہ سپاٹ انداز میں بولا۔ مرتضیٰ نے دانت کچکچائے۔

"تم دونوں جاؤ۔ سرکار کو مجھ سے کوئی بہت ضروری کام آن پڑا ہے۔ اسی لئے مجھ غریب کو اتنی عزت بخش دی کہ گاڑی ہی موڑ ڈالی۔"

سفیر ہنستے ہوئے سر جھکا گیا۔ پھر نظریں اٹھا کر زینی کی جانب دیکھا تو اس کی آنکھوں کے سرد پن سے زینی کو اپنی دھڑکن رکتی محسوس ہوئی۔ کچھ عجیب، کچھ غیر ارادی اور کچھ انجانہ تاثر جو مقابل کو کپکپانے پر مجبور کر دے۔ ایک بھی لمحے ضائع کیے بغیر وہ تیزی سے سمی کا ہاتھ تھامے سڑک پر چلنے لگی۔ لمحے بعد ہی وہ دونوں نظروں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ سفیر نے گردن موڑی اور مرتضیٰ کی جانب دیکھ ہلکے سے مسکرایا۔

"واللہ قیامت۔۔۔" رکا پھر آنکھ دبائی۔ "کا سماں ہے۔"

فقرہ مکمل کیے بے نیازی سے جیپ کی جانب بڑھ گیا۔ ضبط کی آخری منازل طے کرتا مرتضی بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ وہ جانتا تھا کہ سفیر کو اس سے کوئی خاص کام نہیں ہے مگر پھر بھی وہ اس کی راہ میں کیوں آیا تھا۔ محض اسے اور زینی کو ذلیل کرنے۔ اسے بے تحاشا غصہ آرہا تھا، بس نہیں چل رہا تھا ورنہ اس انسان کا قتل کر دیتا۔

☆☆☆☆☆

زنان خانے میں خاموشی تھی۔بی جان دوپہر گئے اپنے کمرے میں آرام فرماہوتیں تھیں جبکہ صلہ خانم اور صبور خانم اس وقت یاتو رسوئی میں ہوتیں یاباغ میں ہوتیں۔زیادہ تر وہ دونوں لاؤنج میں پائی جاتی تھیں۔حویلی کے کاموں سے فراغت کے بعد یاتو وہ کسی کتاب کا مطالعہ کر لیتی تھیں یاسلائی، کڑھائی کر لیتیں۔صلہ خانم کو یہ سلائی کڑھائی کا فن آغاز سے آتا تھا۔جبکہ صبور خانم نے شادی کے بعد سیکھا تھا۔دونوں میں جیٹھانی، درانی والا کوئی مقابلہ نہ ہوتا،نہ شروع سے بی جان نے ان کے چونچلے اٹھائے تھے سو خود ہی ہر کام کرنے کی عادت تھی۔

بی جان تو بیٹوں کی شادی کرتے ہی ہر فرض سے سبکدوش ہوگئی تھیں۔صبور کو حویلی کے راشن خانے کی چابیاں تھما دیں اور صلہ کو باقی کے کام سونپ دیے تو جیسے ہر فرض سے آزاد ہو گئیں۔اب ان کا زیادہ وقت آرام کرتے ،پوتوں سے بات کرتے اور ٹہلتے گزرتا تھا۔

کشف باغ کے داخلی دروازے کے قریب کرسی ڈالے بیٹھی تھی۔نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر مسلسل جمائے وہ مرتضیٰ کی بے رخی کے بارے میں سوچ رہی تھی جو ہر بار اس کا دل نئے انداز سے توڑ دیتا تھا۔مرتضیٰ سے اسے محبت جب ہوئی تو کتنے ہی عرصے وہ خود کو جھٹلاتی رہی تھی۔ایسا بھلا کیسے ہو سکتا تھا؟وہ خانزادی تھی اور وہ ان کے ہاں کام کرنے والا ایک معمولی سا نوکر،دن بیتتے گئے اور مرتضیٰ سے محبت ایک اٹل حقیقت بنتی رہی جسے وہ اب جھٹلا بھی نہ پاتی تھی۔وہ پہروں اس کے خیالات میں کھوئی رہتی۔خود سے سوال کیے ان جوابات کی تلاش میں پوری،پوری رات جاگ کر گزار دیتی مگر کوئی سرے ہاتھ آنے ہی نہ پارہا تھا۔وہ جتنا دل کو سنبھالتی وہ اتنا بے قابو ہو جاتا تھا۔اسے اب لگتا تھا کہ محبت ایسا جذبہ ہے جس میں دل پر بس چلتا ہی نہیں ہے الٹا اس کمبخت کو تھاموتو اچھل کر محبوب کے قدموں میں جا گرتا ہے،کہتا ہے کہ میرا جینا مرنا بس اب یہیں ہے۔یہ محبوب اجازت دے گا تو دھڑکوں گا،نہ دے گا تو مر جاؤں گا پر دھڑکنا چھوڑ دوں گا۔وہ اس کے قدموں میں بچھ جانے کو تیار تھی،حالت یہ تھی کہ محبت کی بھیک مانگنے کو بھی تیار تھی۔آغاز پر خانزادی ہونے کا جو گھمنڈ تھا وہ کہیں دور ماضی میں ہی رہ گیا تھا

اب تو وہ اسے مرشد سمجھے خود کو اس کی مریدنی سمجھتی تھی۔اس کا سرد رویہ اس کی سوچ سے باہر تھا۔جب وہ قدم ،قدم اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہی تھی تو کیوں وہ نظریں چرا رہا تھا۔

وہ مختلف سوچوں میں گم خود کو تکلیف سے دوچار کیے ہوئے تھی۔میٹھا درد اگرچہ کہنے کو ہی میٹھا تھا مگر در حقیقت اس کی حقیقت اور تلخی سے وہی آشنا تھی۔اسے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا تو چونکی پھر اٹھ کھڑی ہوئی ۔وہ خجستہ تھی۔اس کی ہم راز اور مرتضیٰ کی ہر خبر اس تک پہنچانے والی۔

"بی بی سرکار۔۔۔خود کو سوچوں میں مت گھیرے رکھا کریں۔اس سب میں بس تکلیف ہی تکلیف ہے جو آپ کے رگ وپے میں سرایت کرے گی۔مرتضیٰ صاحب کی محبت آپ کے لئے عذاب نا بن جائے بی بی جی۔مجھے تو اس دن کا خوف رلاتا ہے جس دن یہ بات آغا جان یا حویلی کے کسی فرد کے کان میں پڑی۔آپ تو بے جا محبت کی اس جنگ میں ماری جائیں گی اور ساتھ ہی وہ۔۔۔"

خجستہ مزید بولتی جب اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے کشف نے اسے روکا۔

"نہیں ایسا مت کہیں۔۔۔ہمیں انجام کی فکر سے بے پرواہ ہو کر محبت کرنے دیں۔ہمیں مرتضیٰ کی محبت میں دیوانگی کی حد کو چھونے دیں۔ابھی تو آغاز ہے،ابھی سے ہمیں مت روکیں۔ابھی تو اجازت دے دیں۔۔۔ہمیں یقین ہے خجستہ کہ ایک روز انھیں ہماری محبت کا یقین آجائے گا اور پھر اس کا ثبوت دینے کو چاہے ہمیں جان سے ہی جانا پڑ جائے،ہم جائیں گے۔"

وہ اٹل انداز میں بول رہی تھی اور خجستہ سن سی اس کی دیوانگی کی حدوں کو چھوتی محبت کی سچائی کو محسوس کر رہی تھی۔ایک خانزادی کی نوکر سے محبت کیا انجام لانے والی تھی اس بات سے وہ انجان تھیں۔تقدیر ہولے سے مسکرائی تھی۔

زندگی تجھ سے تجھ تک ہے

تو میری یادوں میری باتوں میں ہے

تو چلا گیا، وقت بدل گیا تو کیا ہوا؟

دل آج بھی وہیں ہے وقت بدلا تو کیا ہوا؟

(از خود)

☆☆☆☆☆

کشادہ کمرے کی دائیں اور بائیں دونوں دیواروں کے ساتھ لکڑی کے شیلف پڑے تھے جن میں ڈھیروں، ڈھیر فائلوں کے پلندے پڑے تھے۔ شیلف سے جھانکتی ان فائلوں میں کئی داستانیں چھپی ہوئی تھیں کچھ کیفرِ کردار تک پہنچ گئی تھیں اور کچھ یونہی ادھوری رہ گئی تھیں۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی نظر آتی دیوار کے سامنے رکھی کرسی پر اس وقت ایس ایس پی بہرام خان بیٹھا تھا۔ سر جھکائے وہ قلم تھامے کسی فائل کے مطالعے میں مشغول تھا۔ ساتھ ہی دو فائل کھلی پڑی تھیں۔ دفعتاً ایک نقطے پر وہ چونکا پھر اس پر نشان لگانے ہی والا تھا جب فون بجنے لگا۔ فائل کو یونہی کھلا چھوڑے اس نے فون اٹھایا۔ سکرین پر نظر آتا نام پڑھ کر وہ چونکا تھا پھر سکرین پر انگلی پھیرے کال اٹھائی اور فون کان سے لگایا۔

"السلام علیکم۔۔۔ آج اس وقت فون؟ تم تو اس وقت ڈیرے ہوتے ہو۔"

اس کے لہجے میں حیرت بول رہی تھی تبھی ایک ہی سانس میں بولتا گیا۔

"وعلیکم السلام سرکار۔۔۔ ایک ضروری بات بتانا تھی تبھی اس وقت فون کرنا پڑا۔"

مقابل محتاط انداز میں بول رہا تھا۔ اسکا لہجہ کسی کو چونکا دینے کو کافی تھا تبھی بہرام سیدھا ہو کر بیٹھا۔ دل نے شدت سے دعا کی کہ سفیر کے حق میں مزید کچھ برا، اسے سننے کو نہ ملے۔

"تم کہاں ہو اس وقت؟"

اس سے پہلے وہ کچھ بولتا بہرام نے سوال داغ دیا۔

"سرکار مجھے سفیر سرکار نے حویلی بھیج دیا ہے۔ میں یہیں ہوں۔"

"پاس کوئی ہے تو نہیں؟" بہرام نے خود کو نارمل کرتے پوچھا۔

"نہیں سرکار۔"

"ہاں تو اب بولو؟ کیا بات ہے؟"

بہرام نے قلم اٹھایا۔ فون کندھے اور کان کے درمیان باہم پھنسائے وہ قلم کا ڈھکن لگا رہا تھا۔ مقابل تمہید باندھ رہا تھا۔ بہرام نے قلم، قلم دان میں رکھا اور ٹیک لگائی۔

"سرکار بات ایسے ہے کہ سفیر سرکار کی کوئی دوست آئی ہیں شہر سے اور وہ دونوں اس وقت ڈیرے پر ہیں۔"

اسے لگا کسی نے اس کے کانوں میں شیشہ پگھلا کر انڈیل دیا ہے۔ سفیر شراب نوشی کے ساتھ زنا میں بھی ملوث تھا اس بات نے حقیقی معنوں میں بہرام کا دل دکھایا تھا اسے عطااللہ خان کے بے جا لاڈ نے حد سے زیادہ برباد کر دیا تھا ۔اس کا بھائی کس راستے پر آنکلا تھا۔ مقابل اب تک بول رہا تھا۔

"سرکار میں تصویر بھیجتا ہوں۔ حالانکہ بہت رسکی کام تھا مگر۔۔۔"

بہرام اس کی بات کاٹے درشت لہجے میں بول اٹھا۔

"رقم مل جائے گی تمہیں۔"

پھر بغیر کچھ کہے فون ٹیبل پر دے مارا اور سر ہاتھوں میں گرا لیا۔

"یااللہ" اس کا سر جھکتا جا رہا تھا۔ فون پر نوٹیفکیشن ٹون بج رہی تھی۔ گول، گول چلتے پنکھے کے ساتھ اس کا سر بھی چکرا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

وہ لڑکی جس کی تصویر اس خبری نے اسے بھیجی تھی اس کی ڈیٹیل نکلوانے فوراً سے کانسٹیبل شفیق کو روانہ کر دیا گیا تھا۔ امید تھی کہ شام تک اس کی تمام تر رپورٹ مل جائے گی۔ اس دوپہر اس نے شدت سے شام کے نہ آنے کی دعا کی تھی مگر شام عام دنوں کی نسبت جلد چھانے لگی تھی۔ گھڑی کی ٹک، ٹک اس کا دل دہلا رہی تھی۔ دستک ہوئی تو اس نے ہاتھوں میں دیا سر جھٹکے سے اٹھایا۔

"یس۔۔۔"

یہ کہتے ہوئے اس کی آواز میں ہزاروں فکر اور اندیشے پنہاں تھے۔ شفیق مسکراتے ہوئے اندر آیا۔ ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا پھر ایک فائل میز پر رکھی اور اس کی جانب سرکا دی۔ مسکاتے لہجے میں وہ بولنے لگا۔

"سر اس لڑکی کی خبر نکلوانا تو کوئی مشکل کام تھا ہی نہیں، یہ کام تو میں نے محض دو گھنٹے میں کر لیا۔ یہ لڑکی تو جی طوائف تھی۔"

بہرام نے سر اٹھا کر سن کیفیت میں اسے دیکھا۔ گھڑی کی ٹک، ٹک جاری تھی۔ اور وہ شفیق کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے شفیق دوسری دنیا کی مخلوق ہو۔ وہ شفیق کو بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔ شفیق کھنکھارا۔

"سر؟؟"

انداز سوالیہ تھا۔

"ہوں۔۔۔" بہرام کسی گہرے خواب سے جاگا۔ درحقیقت وہ ابھی تو اس خواب سے جاگا تھا۔ اس نے سر جھٹکا پھر شفیق کی جانب دیکھا۔ "کیا کہا آپ نے؟"

بہرام کے سوال پر شفیق نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ایک دفعہ پھر بولنے کو لب کھولے۔

"سر جی وہ لڑکی ایک طوائف ہے۔"

اس نے دوبارہ سے دہرایا۔ بہرام کو یوں لگا گویا تابوت میں آخری کیل ٹھونک دیا گیا ہو۔ اس نے ہاتھ جھلا کر شفیق کو جانے کا اشارہ کیا، شفیق ایک دفعہ پھر ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کرتے باہر کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے جانے کی دیر تھی بہرام نے سینہ مسلا۔

"سر وہ لڑکی۔۔۔ طوائف۔۔۔ طوائف۔۔۔ طوائف"

طوائف لفظ کی بازگشت جاری تھی۔ اس کے سینے میں جلن ہونے لگی۔ ایک جانب پڑا پانی کا گلاس اٹھا کر وہ ایک ہی سانس میں خالی کر گیا پھر بھی سکون حاصل نہ ہوا اس نے جلدی سے شرٹ کے اوپری بٹن کھول دئے۔ پھر سینہ مسلتے فائل اپنی جانب سرکائی، فائل کو ہاتھ لگاتے اسے یوں لگ رہا تھا جیسے بچھو اسے ڈنگ مار رہا ہو۔ جتنی دیر تک وہ فائل کا مطالعہ کرتا رہا اتنی دیر تک اس کا ماتھا پسینے سے شرابور ہوتا رہا۔ اتنا پریشان وہ آج تک نہیں ہوا تھا جتنا پریشان آج ہو چکا تھا۔ ڈیوٹی ختم ہونے سے پہلے ہی اپنا سامان اور وہ فائل اٹھائے وہ اپنے کیبن سے نکلا۔ بغیر کسی سے نظر ملائے خاموشی سے تھانے سے باہر نکل گیا عادت سے مجبور اس کے اعزاز میں کھڑے تمام پولیس والے حیران رہ گئے، آج وہ انہیں کوئی ہدایت نہیں دے کر گیا تھا، آج اس نے کسی پر اپنا قہر بھی نہ برسایا تھا۔ وہ اس بات سے انجان تھے کہ وہ کس کرب سے گزر رہا ہے گناہ اس کا بھائی کر رہا تھا اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے سزا وہ پا رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

آج پھر خجستہ یہ پیغام لائی تھی کہ اسے کشف کو اس کی دوست کے ہاں لے کر جانا ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ضبط کیے خاموش ہو گیا۔ اب بھلا وہ کیا کہہ سکتا تھا۔ گاڑی نکالے وہ روش پر لے آیا۔ حویلی کے داخلی دروازے سے باہر نکلی تو خجستہ بھی اس کے ہمراہ تھی وہ گاڑی سے باہر نکل آیا۔

سیڑھیاں اترتی کشف کی دھڑکنوں میں تلاطم برپا ہو گیا۔ اس کی نظریں خود پر جمی دیکھ کر وہ لرزتی پلکیں جھکا گئی۔ محبوب کی نظروں کی تاب لانا بھی کتنا کھٹن کام ہے۔ روش پر قدم رکھا تو مرتضیٰ اپنی نظریں ہٹا گیا۔ اب کی بار کشف نے اس کی جانب نظریں اٹھائیں تھیں۔ کالے کرتا شلوار میں سنجیدہ صورت لئے اطمینان سے کھڑا وہ شخص اس کی دل کی سلطنت کا اکلوتا وارث تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ دونوں کالے لباس میں تھے۔ خجستہ نے دور سے ہی اُنہیں ساتھ کھڑا دیکھے ان کی بلائیں لے ڈالیں۔ گاڑی میں سوار ہونے سے قبل اس نے نیلے نین اٹھائے تھے جو سنجیدگی سے تکتی گہری آنکھوں میں ڈوبتے گئے، گہری آنکھیں چند ثانیے اسے سنجیدگی سے تکتی رہیں۔ اس نے گاڑی کا دروازہ پکڑنا چاہا تو بے خودی کے عالم میں اپنا مومی ہاتھ اس کے دروازہ تھامے ہاتھ پر دھر بیٹھی۔ لمحے کا کھیل تھا مرتضیٰ نے سرعت سے ہاتھ ہٹایا تھا۔ کشف نے دل کی دھڑکن پر قابو پایا اور اب کی بار خاموشی سے بغیر کچھ کہے اس کے دروازے کھولنے پر گاڑی میں سوار ہو گئی۔ مرتضیٰ خود کو سنبھال چکا تھا اس مومی ہاتھ کی نزاکت کا اثر زائل کر دیا گیا تھا۔ خجستہ کے بیٹھتے ہی اپنی سیٹ سنبھالی۔ اگلے ہی لمحے گاڑی روش سے گزرتی حویلی سے باہر نکلتی گئی۔ مرتضیٰ کے اندر بے چینی نے سر اٹھایا۔ اس نے سر جھٹکا مگر یہ اثر ختم ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس نے اب تک شیشے سے جھانکتی ان آنکھوں کو نہ دیکھا تھا۔ مگر اندر کی بے چینی دبانے کو ایکسلیٹر پر دباو بڑھا دیا۔ گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ کشف چونکی، گاڑی بہت تیز رفتار سے چل رہی تھی کشف کو ہمیشہ تیز رفتاری سے گھٹن ہونے لگتی تھی اس نے کچھ لمحے تک تو خود پر قابو پانے کی کوشش کی مگر جب اختیار سے باہر ہو گیا تو یکدم ہی چلانے لگی۔ اس کے چلانے پر مرتضیٰ ہوش میں آیا اور گاڑی کی رفتار کم کر دی۔ بریک لگایا اور شیشے سے جھانکا تو نیلے نین پانی سے لبریز تھے۔ وہ باقاعدہ کانپ رہی تھی۔ مرتضیٰ کو شرمندگی ہوئی۔ اپنی بے چینی کم کرنے کو اس نے خانزادی صاحبہ کی بے چینی بڑھا دی تھی۔ اس نے مڑ کر سوالیہ انداز میں خجستہ کو دیکھا جو کشف کا بازو سہلا رہی تھی۔

"بی بی جی تیز رفتار پر گھبرا جاتی ہیں۔کافی دیر سے ضبط کر رہی تھیں مگر جب مزید برداشت نہ ہو پایا تو چلانے لگیں۔"

مرتضیٰ نے واپس چہرہ موڑا۔اب کی بار شیشے سے جھانکا تو نیلے نین خفگی اور شکایت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"معذرت خانزادی صاحبہ۔۔۔!مجھے اندازہ نہیں تھا۔"

وہ واقع شرمندہ تھا اور کشف اسے شرمندہ ہی تو نہیں دیکھنا چاہتی تھی اس نے پہلے بھی خود پر اسی لئے قابو پانا چاہا تھا کہ اسے شرمندگی سے بچا لے مگر وہ اپنے خوف کا کیا کرتی اسی لئے چلا اٹھی تھی۔

"ککک۔۔۔کوئی بات نہیں ہم۔۔۔ہم ٹھیک ہیں۔"

اسے جھوٹی تسلی دیے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔کسی حد تک وہ مطمئن بھی ہو گیا۔مگر کانپتا،مدھر لہجہ ساری داستان سنا رہا تھا۔

"آپ لوگ بیٹھیں میں اسٹور سے پانی کی بوتل لاتا ہوں۔"

اس نے کونے میں بنے اسٹور کی جانب اشارہ کیا۔وہ نکلنے ہی والا تھا جب خجستہ کشف کی جانب دیکھتی بول اٹھی۔

"مرتضیٰ صاحب آپ بیٹھیں۔۔۔مم۔۔۔میں لے آتی ہوں۔بی بی کے لئے کچھ کھانے کو بھی لے آوں گی۔"

خجستہ تیزی سے بولی تو ہینڈل پر ہاتھ رکھے بیٹھا مرتضیٰ چونک کر مڑا۔

"آپ مجھے بتا دیں میں۔۔۔"

وہ بولنے لگا جب خجستہ نے ہاتھ اٹھا کر روکا۔

"میری دوست بھی کھڑی ہے وہاں اسی بہانے اس سے بات چیت ہو جائے گی۔"

مرتضیٰ نے اثبات میں سر ہلایا۔وہ دروازہ کھولتی باہر نکلی۔پھر سر اندر دیے مرتضی کو باور کرانا نہ بھولی۔

"بی بی جی کو اکیلا مت چھوڑیئے گا وہ ابھی سہمی ہوئی ہیں۔"

مرتضیٰ نے سر ہلایا تو وہ دروازہ بند کرتی اسٹور کی جانب چل دی۔

گاڑی میں چھائی خاموشی مزید گہری ہوتی جا رہی تھی۔ کشف ہاتھوں کی انگلیاں باہم پھنسائے بیٹھی تھی۔ سانس بھی روک رکھا تھا جبکہ نظریں جھکا رکھی تھیں۔ چند ثانیے خاموشی رہی۔ پھر اس خاموشی کو مرتضی کی آواز نے توڑا۔

"مجھے سچ میں اندازہ نہیں تھا ورنہ میں کبھی بھی گاڑی اس رفتار سے نہ چلاتا خانزادی۔ مع۔۔"

اس سے پہلے کہ وہ معذرت کا لفظ بولتا کشف بول اٹھی۔

"بار، بار معذرت کر کے ہمیں مزید شرمندہ مت کیجئے ہم آپ کو۔۔۔ ہم۔۔۔ آپکو شرمندہ نہیں دیکھ سکتے۔"

بات کے اختتام پر اس کی آواز ہلکی ہوتی گئی۔ مرتضیٰ نے سر اٹھایا تو گہری آنکھیں ان نیلے نین کٹوروں سے جا ملیں۔ اسی لمحے سے وہ خوف کھاتا تھا۔

"مرتضیٰ آپ ہمیں کب عزیز ہوئے ہم نہیں جانتے مگر آپ ہماری دھڑکن بنتے گئے اور آپ کے بغیر جینا ہمارے لئے محال بنتا گیا۔۔۔"

آخر وہ سر جھکائے ہر اعتراف کرتی گئی۔ اس سے زیادہ واضع الفاظ کا استعمال وہ نہیں کر سکتی تھی۔ چہرے پر حد سے بڑھ کر گلابیاں اترنے لگیں۔ گل و گلنار چہرہ لئے وہ اپنے تاثرات کا اظہار کر رہی تھی۔ مرتضیٰ کی دھڑکن تھم چکی تھی۔ یہ کیا ہو رہا تھا اور کیوں؟ وہ حقیقت سے آگاہ تھا اور اگر کشف حقیقت سے آگاہ نہ تھی تو اس میں بھی شاید اسی کا قصور تھا اسے بہت پہلے ہی صحیح مگر کشف کو یہاں سے کھینچ لانا چاہیے تھا۔ وہ کس راہ کی مسافر بن گئی تھی۔ وہ سر ہاتھوں میں گرا گیا۔ اسی لمحے کا خوف اسے ڈستا تھا۔ کتنے لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے جب گہری خاموشی سے گھبرا کر کشف نے شیشے میں دیکھا۔ مگر وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"مرتضی ہم آپ سے۔۔۔"

اس سے قبل وہ مزید کچھ بول پاتی مرتضیٰ چلا اٹھا۔ لہجہ کاٹ دار اور درشت تھا۔ بہتر یہی تھا اسے حقیقت کا آئینہ دکھا دیا جاتا۔

"بکواس بند کریں اپنی۔۔۔ میں نے کہا ایک لفظ اور نہیں"

اسے بولنے کو پر تولتا دیکھ کر وہ پھر سے چلایا۔

"مرتضیٰ ہم۔۔۔"

اپنے ریزہ، ریزہ ہوتے دل کو سنبھالے اس نے پھر سے ہمت یکجا کی۔

"آپ میری بہن ہیں۔ سنا آپ نے خانزادی صاحبہ؟ میں زمان خان کی ناجائز اولاد ہوں۔ یہ رشتہ کبھی، کبھی نہیں جڑ سکتا۔ نہ میں آپ کے لئے ہوں، نہ آپ میرے لئے ہیں۔ آئندہ میں ایسی کوئی خرافات نہ سنوں، جتنی جلدی ہو سکے اس سب کو بھولنے کی کوشش کریں۔۔۔ حویلی میں کسی کو بھنک نہ پڑے کہ میں کون ہوں ورنہ آپ کی جان اپنے ہاتھوں سے لوں گا۔"

وہ بولتا جا رہا تھا۔ پھر مڑ کر اسے دیکھا جو سن سی بیٹھی تھی۔ ہاتھ لگانے پر ڈھ جانے کو تیار۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت تھیں۔ وہ کسی خدشے کے زیرِ اثر اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے شبہ ہوا کہ وہ پاگل ہو چکی ہے۔ وہ بغیر کچھ کہے گاڑی سے نکل گیا۔ بونٹ سے ٹیک لگائے وہ گہرا سانس کھینچنے لگا۔ آج اس نے مدت بعد اس راز کا ذکر کر دیا تھا جس کے ذکر سے ہمیشہ اسے تکلیف ہی پہنچتی تھی۔ حویلی کا لڑکا ہونے کے باوجود بھی ملازموں سی زندگی بسر کرنا کہاں کا انصاف تھا۔ وہ جب بھی سوالات کا جواب ڈھونڈھنے نکلتا تو ماضی کے بھول بھلیوں میں ایسا الجھتا کہ فرار کی راہ نہ ڈھونڈھ پاتا۔

ناجانے خجستہ کہاں رہ گئی تھی۔ سڑک خالی تھی اور کونے میں بنے جنرل اسٹور کے باہر وہ کہیں نہ تھی۔ دس منٹ تک وہ یونہی کھڑا جوتے کی نوک سے زمین کھرچتا غصہ ضبط کرتا رہا۔ دفعتاً گاڑی کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر

چند لمحے بعد ہی اس کے سامنے کشف آ کھڑی ہوئی۔اس کی آنکھیں رونے کے سبب متورم ہو چکی تھیں۔مرتضیٰ نے نظریں چرائیں۔کشف میں نا جانے کہاں سے ہمت آئی۔اس نے مرتضیٰ کا کالر دبوچا مرتضیٰ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں مگر وہ اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑے ہوئے تھی۔پھر اس کی آواز سنائی دی۔رونے کے سبب بھاری ہوئی آواز۔

"مرتضیٰ ہمیں بتائیں کیا یہی وجہ ہے ہمیں ٹھکرانے کی؟"

"خانزادی۔۔۔"

مرتضیٰ نے اپنا کالر چھڑوانا چاہا جب اس نے مزید سختی سے کالر دبوچ لیا۔

"ہماری بات کا جواب دیں۔۔۔؟"

سوالیہ انداز اور سخت لہجے میں وہ اس سے جواب کی طلب گار تھی۔

"یہی اٹل حقیقت ہے۔اور اس سے بڑھ کر کوئی اور وجہ کیا ہو سکتی ہے۔"

مرتضیٰ سپاٹ انداز میں بولا۔وہ جیسے مسکرائی تھی پھر خاموشی سے اس کا کالر چھوڑے گاڑی میں جا بیٹھی تھی۔

"میں زمان خان کی ناجائز اولاد ہوں۔"

اس کے لہجے کی بازگشت جاری تھی۔وہ جتنا حیران ہوتی کم تھا۔وہ اس سے حقیقت جاننا چاہتی تھی۔یہ کیسی حقیقت تھی؟یہ کیسا راز تھا؟

دور سے اب خجستہ چلی آ رہی تھی۔گھنٹہ بیت چکا تھا اور اب انھیں ہر صورت حویلی لوٹنا تھا۔واپسی کے راستے وہ دونوں اپنی، پانی جگہ خاموش، حیران بیٹھے تھے۔وہ مرتضیٰ کی حقیقت پر اور مرتضیٰ اس کی اندیکھی مسکراہٹ پر ،ادھورے سوال ان کے درمیان آ ٹھہرے تھے جن کے جوابات ڈھونڈھنے کو وقت درکار تھا۔کتنا؟شاید قسمت جانے۔۔۔!

☆☆☆☆☆

اس نے اپنی ماں سے بڑھ کر صابر کسی کو نہیں پایا تھا۔اس کی ماں اتنی صابر تھی کہ اس کی مثال اسے کہیں نہ ملی۔ اس نے اپنی دادی کو دیکھا تھا پھر پھوپھی کو، مگر ماں سے بڑھ کر کسی کو صابر نہ پایا۔اکثر دادی اس کی ماں کو برا بھلا کہتیں۔ کبھی کبھار انھیں مار بھی دیتیں مگر وہ پھر بھی ان کی خدمات کرنے سے باز نہ آتیں۔وہ اکثر دادی کے رویہ پر کڑتا تو ماں سے پوچھ لیتا۔

"آپ کیوں ان کی مار کھا کر بھی ان کے کام کرتی ہیں؟"

صباء زخمی سا مسکراتیں۔

"ان کی اچھائی ہے بیٹا جو مجھے قبول کر لیا۔ورنہ میں تو زمانے کی ٹھوکروں پر رہتی۔ان کی کھا لیتی ہوں تو احساس ہوتا ہے نا جانے زمانے کی ٹھوکریں کتنی تکلیف دیتیں۔اس لئے بیٹا ان کی ٹھوکر میں محبت ہے اور میں ان کی اس محبت کے جواب میں بھی اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔"

اس کی ماں کتنی صابر تھی۔وہ کیوں ایسا کہتی تھیں۔کیوں زمانے کی ٹھوکروں سے پناہ مانگتی تھیں۔اس کا جواب اسے جلد مل گیا تھا جب وہ سولہ برس کا ہوا تب ان کے گھر ننھی پری کی آمد ہوئی۔اس سے پہلے بھی صباء کے تین بچے پیدا ہو کر مر چکے تھے۔ڈاکٹر تو جواب دے چکے تھے کہ اب وہ دوبارہ ماں نہیں بن سکتی مگر اللہ نے کرم کیا اور ان کے گھر زینی پری بن کر اتری۔مرتضیٰ اسے بازوؤں میں بھرنا چاہتا تھا،اسے اٹھانا چاہتا تھا مگر اس کی بڑی پھوپھی صفیہ جن کی طلاق ہو گئی تھی اور اس کے بعد انہوں نے کبھی شادی ہی نہ کی تھی، درشتی سے بول اٹھیں۔

"دفع ہو جاؤ۔۔۔ تمہیں اسے اٹھانے کا حق نہیں ہے۔تم تو گند اخون ہو اسے بھی پلید کر دو گے۔"

گند اخون، یہ وہ واحد لفظ تھا جو وہ بچپن سے سنتا آرہا تھا مگر اب جانے کیوں ضبط نہ ہوا تو اندر کمرے میں بستر پر لیٹی ماں کے پاس چلا آیا۔

"امی میں گندا خون ہوں؟"

انداز سوالیہ تھا۔ آنکھوں پر ہاتھ دھرے لیٹی صباء نے بازو ہٹا کر اسے دیکھا۔ پھر اٹھ بیٹھیں۔ آنکھوں میں حیرت تھی۔ اسے لگا جیسے ان آنکھوں میں کرچیاں چبی تھیں تبھی آنسو رخسار پر بہہ نکلے تھے۔

"کک۔۔ کس نے کہا ایسا؟"

وہ ہلکی آواز میں اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر بولیں۔

"سب کہتے ہیں۔"

وہ ہاتھوں سے کچی زمین کھرچتے ہوئے بولا۔ صباء نے دوبارہ سے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں تھاما اور چہرہ اونچا کیا۔

"بابا بھی کہتے ہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"باقی سب تو کہتے ہیں۔ پھوپھی کہہ رہی تھی میں حویلی والوں کا بیٹا ہوں۔ امی میں تو آپ کا بیٹا ہوں۔"

اس نے صباء کی جانب دیکھتے ہوئے یقین چاہا۔ صباء نے مسکرا کر سر ہلایا۔

"ہاں تم میرے ہی بیٹے ہو۔ دوسروں کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ تم حویلی سے تعلق رکھتے بھی ہو تب بھی ہمیں حویلی والوں سے کوئی لین دین نہیں ہے۔ سب کچھ پیچھے رہ گیا ہے۔ اب تم ذکر کرو گے تو مجھے تکلیف ہو گی۔ تم ذکر نہ کرنا ۔میں تمہارے ابا اور ننھی پری تم کو کافی ہیں۔"

صباء نے اس کے ماتھے پر بوسہ لئے اسے گلے سے لگایا۔ اس نے بھی جواباً ان کے گرد بازوؤں کا گھیرا بنا لیا۔ وہ ماں کو دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنی جنت کو تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا۔ صباء کی آنکھوں سے چند بے نام سے آنسو نکلے جو اس کے بالوں میں جذب ہوتے گئے۔

☆☆☆☆☆

دو روز تک وہ بخار کے زیرِ اثر رہا مگر پھر بھی ڈیوٹی پر جاتا رہا۔ اسے گاؤں جانا تھا مگر اس کی درخواست اب کی بار منظور ہی نہ ہو پائی تھی۔ کیونکہ اس نے تاحال ہی چھٹیاں لی تھیں۔ وہ خود کو شدید بے بس محسوس کر رہا تھا۔ یہ ایسا معاملہ تھا جو ملاقات سے ہی حل ہو سکتا تھا اس کے لئے فون پر رابطہ کرنا مناسب نہ تھا۔

وہ بے صبری سے اس مہینے کے گزرنے کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ مہینہ ختم ہوتا تبھی وہ چھٹی لے سکتا تھا اس سے قبل یہ سب بھی ناممکن تھا۔ ان دنوں اسے وہ کانچ سی ہرنی جیسی آنکھیں بھی شدت سے یاد آئی تھیں۔ اسے اس لڑکی کی بھی فکر تھی۔ اب اسے یقین ہو چکا تھا کہ اس کے پیچھے، بخش یا علی نہیں، سفیر ہی تھا۔

---*---

وہ تقدیر کے فیصلوں پر حیران تھی۔ یہ کیسی حقیقت تھی۔ ایسا کیسے ممکن تھا کہ نوکر بنا وہ شخص بھی حویلی کا ہی فرد تھا۔ کیسے؟

زمان خان کی ناجائز اولاد سے اس کا کیا مطلب تھا؟ وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟ کل تک محبت کا انجام کچھ تھا اور آج پل بھر میں تقدیر کیسا کھیل، کھیل گئی تھی؟ شاید یہی وجہ تھی کہ شروع دن سے اب تک مرتضیٰ نے اپنا نام صرف مرتضیٰ ہی بتایا تھا۔ وہ پورا نام بتا ہی نہیں سکتا تھا۔

مگر وہ جہاں اب حویلی والوں کے تاثرات کو لئے پریشان تھی وہیں اس بات پر خوش تھی کہ اس کی محبت محفوظ رہی اور اس پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ اسے جلد مرتضیٰ کو بھی اس حقیقت سے آگاہ کرنا تھا تاکہ وہ بھی ہر قسم کی غلط فہمی سے نکل آئے۔ یہی ان دونوں کے لئے بہتر تھا۔

☆☆☆☆☆

منڈیر پر صبح کی دودھیا روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔ کبوتر بھی اپنی جگہ سنبھال چکے تھے۔ اٹاری میں ہانڈی چولہے پر چڑھا دی گئی تھی۔ لہسن کے تڑکے کی خوشبو پورے صحن میں پھیل رہی تھی۔ آج اتوار تھا مگر پھر بھی سب کچھ معمول کے مطابق ہو رہا تھا۔

صحن کے بیچ و بیچ پڑا تازہ چارہ سونو اور لالی دونوں ہی کھانے میں مصروف تھے۔ یہ چارہ ابھی قمر کاٹ کر لایا تھا۔ زینی اور سمی کا باہر جانا جب سے بند ہوا تھا ان کا ہر کام قمر کی ذمہ داری بن گیا تھا۔ اب بھی وہ کافی سارا چارہ توڑ لایا تھا اور اب باقاعدہ طور پر کھڑا اسے مشین میں کاٹ رہا تھا۔ نظریں جھکائے وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔

وہ زینی کے ساتھ کمرے کی بیرونی دیوار سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھی تھی۔ نظریں چوری، چوری قمر کا دیدار کر رہی تھیں۔ زینی کے ہاتھ میں پتا پکڑا ہوا تھا جسے وہ وقفے، وقفے سے توڑ کر پھینک رہی تھی۔ نظریں بظاہر پتے اور تھیں مگر در حقیقت وہ سمی کے ایک، ایک انداز پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ وہ کچھ عرصے سے قمر کو دیکھ کر سمی کا بوکھلانا، شرمانا محسوس کر رہی تھی۔ مگر کچھ کہنے سے قاصر تھی۔ ایک جانب اس کی دوست تھی تو دوسری جانب اسے چاہنے والا قمر۔

"تو قمر کو چاہتی ہے۔"

یکدم ہی وہ بولی تو سمی کو لگا اس کا دل رک گیا ہو۔ یہ سوال نہیں تھا پورے یقین سے کی گئی بات تھی۔

"ککک۔۔۔ کس نے کہا؟"

اس نے ارد گرد نظریں دوڑاتے ہوئے شرمندگی چھپانا چاہی۔

"تیری آنکھوں نے۔" زینی کے جواب پر سمی ایک بار پھر نظریں چرا گئی۔ ایک جانب دوست تو دوسری جانب محبت۔

اس نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا۔

"ایسا کچھ نہیں تجھے وہم ہو رہا ہے۔"

"ہمممم۔۔۔"

زینی نے ہنکارہ بھرا۔ سمی چند لمحے فرش گھورتی رہی پھر یک دم اٹھی۔

"تو کدھر؟"

پتا ختم ہو چکا تھا۔ زمین پر دور، دور تک چھوٹے، چھوٹے کئی ٹکرے بکھرے ہوئے تھے۔

"گھر جا رہی ہوں۔ سمی کا پیٹ بھر گیا ہے۔ امی کہہ رہی تھی جلد لوٹ آنا۔"

وہ زینی کو نظر انداز کرتی تیزی سے اٹھی۔ کہیں زینی اس کا بھید نا پا جائے۔ وہ اپنی دوست کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جبکہ زینی کی نظریں اب تک لکڑی کے ہلتے دروازے پر تھیں۔ سمی اس سے لاکھ چھپا لے مگر وہ پھر بھی سمی کا بھید پا چکی تھی۔

☆☆☆☆☆

صبح سے موسم خاصا خوش گوار تھا۔ آسمان پر پرندے آج ایسے محوِ پرواز تھے جیسے آسمان پر ان کا کوئی تہوار ہو۔ ہوا میں ایسا سرور تھا جیسے وہ رقص میں ہوں۔ ٹھنڈی ہوا رگ و جان کو سکون بخش رہی تھیں۔

حویلی کے مرد آج ڈیرے گئے ہوئے تھے۔ جانے سے قبل

مرتضیٰ کو عطا اللہ خان ایک کیس کی فائل ڈھونڈھنے کا کام سونپ گئے تھے۔ یہ زمینوں کا کیس تھا جس کی پیشی چند روز تک ہونا تھی۔ مرتضیٰ باہر کے کام نپٹا کر مردان خانے کی جانب بڑھا جہاں خاموشی کا ڈیرا تھا۔ اس کی منزل کونے میں بنا کمرہ تھا۔ وہ کف کہنیوں تک موڑنے میں مصروف تھا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر باہر لٹکتی چابی سے دروازہ کھولا اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے اندر جاتے ہی زنان خانے سے مردان خانے کی جانب کھلنے والا جالی

کا دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھلا تھا۔ خجستہ کو سب سنبھالنے کا حکم دیئے خود وہ یہ رسکی قدم اٹھا چکی تھی مگر اب ضروری تھا کہ مرتضیٰ کی بھی آنکھیں کھولی جاتیں اور اسے بھی حقیقت سے آگاہ کیا جاتا۔ وہ دبے پاؤں چلتی اس کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ پاس پہنچ کر اس نے جی کڑا کیا پھر گہری سانس کھینچی اور ہینڈل پر ہاتھ رکھ دیا ہلکی سی آواز کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ شیلف کھنگالتا مرتضیٰ آہٹ پر چونکا پھر مڑا۔

☆☆☆☆☆

ضربِ کربناک

یہ ضرب کربناک ہوتی ہے
صورتِ عذاب ہوتی ہے
کسی کو برباد کرتی ہے
کسی کو بیدار کرتی ہے
کسی کو دکھاتی ہے آئینہ اسکا
کسی کا ملا کر سب خاک کرتی ہے
یہ ضرب کربناک ہوتی ہے
صورتِ عذاب ہوتی ہے

☆☆☆☆☆

گاؤں کا وہ اکلوتا ہسپتال، جو گاؤں کے پرانے چودھری کی مہربانی سے تعمیر ہوا تھا، زیادہ بڑا نہ تھا، یہی کوئی دو کنال۔ سرکاری ہسپتال کے وارڈ کھچا، کھچ مریضوں سے بھرے ہوئے تھے۔ تل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی۔ لمبی راہداری کے کونے میں بنے میٹرنٹی وارڈ کے باہر چکر لگاتا وہ عمر سے قبل ہی بوڑھا نظر آنے والا شخص پریشان لگتا تھا۔ سر سے صافہ اتار کر ہاتھ میں تھاما ہوا تھا اور ارد گرد بار، بار چکر لگانا اس کے اضطراب کی گواہی تھا۔ آنکھیں

وارڈ کے دروازے پر تھیں اور ان میں کہیں نہ کہیں چمک تھی اور کان شاید اچھی خبر ہی سننے کو بے چین تھے۔ انتظار کی گھڑیاں تمام ہوئیں تو لیڈی ڈاکٹر باہر نکلی۔ یہ شہر سے آنے والی ڈاکٹر تھی جو ہفتے میں ایک روز یہاں کا چکر لگاتی تھی۔

گل شیر نے امید سے اس کے چہرے کو تکا شاید اس بار خوشی کی خبر سننے کو مل ہی جائے۔ وہ چہرے پر لگا جراحی ماسک اتار رہی تھی۔ گل شیر نے غور کیا کہ اس بار بھی باہر آنے والے ڈاکٹر کے چہرے پر مایوسی ہی تھی۔

"ہمیں معاف کر دیں گل صاحب۔۔۔ ہم آپ کی بچی کو بچا نہیں پائے، اس بار بھی۔۔۔"

آخری بات دھیمے لہجے میں کہی گئی تھی۔ گل شیر کا دل سکڑا۔ پھر یکدم

ٹھنڈی پھوار برسی۔ اس نے آنکھوں کے کنارے پر موجود آنسو سختی سے پونچھ ڈالا۔

"مالک جو تیری رضا وہی اس ناچیز کی رضا۔"

اس کا لہجہ متوازن نہ تھا مگر پھر بھی وہ کوشش کر رہا تھا کہ مایوس نہ ہو۔ یہ سولہ برس میں ملنے والی چوتھی خوشی تھی جو دروازے پر دستک دے کر پلٹ گئی تھی۔ شاید اسے گل شیر کی دہلیز پسند نہ تھی۔ اندر سے آنے والی نرس بھی مایوسی سے اسے دیکھتی چلی گئی۔ ڈاکٹر اب تک گل شیر کی جانب دیکھ رہی تھی پھر سنجیدگی سے بول پڑیں۔

"گل صاحب آپ میرے ساتھ تشریف لائیں۔"

گل شیر ایک نظر وارڈ کے دروازے پر ڈالتا ڈاکٹر کے پیچھے چلا آیا۔ ارد گرد پردے لگائے کمرہ سا بنایا گیا تھا۔ ڈاکٹر اپنی کرسی پر بیٹھی پھر اسے سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ صافحہ گود میں رکھتا بیٹھ گیا۔

چند لمحے خاموشی سے سرکے، وہ گود میں دھرے اپنے ہاتھوں کی خالی لکیریں دیکھ رہا تھا اور ڈاکٹر اس کا چہرہ۔ ڈاکٹر نے گہرا سانس بھرا پھر میز پر قدرے آگے ہو کر بیٹھی۔

"گل شیر آپ اپنی بیوی کی حالت جانتے ہیں؟"

سنجیدہ لہجے میں کی بات پر اس نے سر اٹھایا۔

"کیا ہے اس کی حالت؟"

وہ بے تابی سے پوچھ رہا تھا۔ڈاکٹر شہناز نے اپنی عینک اتار کر میز پر رکھی پھر سنجیدگی سے خود کو دیکھتے گل شیر کو دیکھا۔

"مجھے ہسپتال کے عملے سے معلوم ہوا کہ آپ کے پہلے بھی تین بچے یا
تو پیدائش کے دوران یا پھر آپ کی بیوی کی کوکھ میں ہی مر گئے ہیں۔مجھے افسوس ہے اس بات پر کہ میں کچھ نہ کر سکی،ان بچوں کا بار،بار مر جانا یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی بیوی سخت صدمے میں رہتی ہیں۔کوئی پریشانی انھیں ہمیشہ گھیرے رکھتی ہے۔میں نہیں جانتی کیا،یہ آپ کا آپس کا معاملہ ہے جانتے ہیں ابھی آپریشن سے قبل بھی میں اس کی آنکھوں میں امید دیکھ چکی ہوں۔جب وہ ٹوٹے گی تو نہ صرف اسے تکلیف ہو گی بلکہ وہ ٹوٹ جائے گی۔یقین کریں۔"

ڈاکٹر کا لہجہ تنبیہ کرتا تھا۔گل شیر کو بے چینی نے آگھیرا۔

"مم۔۔۔میں اپنی بیوی سے محبت کرتا ہوں جی بہت۔اسے ایسے نہیں دیکھ سکتا اور میں بے بس بھی ہوں۔اللہ کا فیصلے کے آگے بھی کچھ نہیں کر سکتا۔"

وہ بہت ہمت یکجا کیے بول رہا تھا۔اس کا اندازہ سامنے بیٹھی شہناز کو باخوبی ہو رہا تھا۔وہ چند لمحے سر جھکائے رہی پھر ایک دم ہی سر اٹھایا۔

"ایک حل ہے ہمارے پاس۔"

گل شیر نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا مگر وہ گھنٹی بجائے نرس کی آمد کی منتظر تھی۔چند لمحے بعد ہی کوئی نرس پردے سرکاتی اندر آئی۔شہناز ایک پل کو معذرت کرتی اٹھی اور نرس کو لئے باہر چلی گئی۔گل شیر سر گھمائے

اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایسا کیا حل تھا۔ دماغ کئی نہج پر سوچ رہا تھا۔ دس منٹ بعد ہی شہناز واپس آ گئیں۔ گلا کھنکھارے اس نے اپنی جانب متوجہ گل شیر کو دیکھا۔

"دیکھیں گل شیر اللہ کسی کو دے کر آزماتے ہیں تو کسی سے لے کر اسے آزماتے ہیں۔ آزمائش تو اللہ کی جانب سے آتی ہے۔ جو جتنا آزمائش پر پورا اترتا ہے اسے اتنا نواز دیا جاتا ہے۔ ہمارے وارڈ میں ایک وقت پر دو آپریشن ہوئے ہیں، دو بچیاں ہوئیں ہیں۔ ایک مر گئی اور دوسری زندہ ہے۔ مگر جانتے ہیں۔۔۔" ذرا آگے ہو کر بیٹھی۔ "کچھ لوگ بہت ناشکرے ہوتے ہیں اور دوسری عورت کا خاوند بہت ناشکرا ہے اور خود وہ عورت بھی۔ شاید وہ عورت رضامند ہو جاتی مگر اس کا شوہر نہیں تو وہ بھی نہیں، بھلا طلاق کی آرزو کسے ہوتی ہے؟ انھیں بیٹے کی تمنا تھی مگر۔۔۔ خیر بات یہ ہے کہ وہ دونوں خاوند بیوی اس بچی کو رکھنے کو تیار ہی نہیں ہیں۔ ہسپتال سر پر اٹھا لیا ہے۔ وہ آدمی بیوی کے ٹھیک ہونے کا منتظر ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ بچی یہیں چھوڑ جائیں گے۔ جسے اٹھا کر نہیں دیکھا اسے کیسے سنبھالیں گے۔ امید ہے آپ میری بات سمجھ رہے ہیں اگر آپ ان سے بات کر لیں۔۔۔"

گل شیر نے گہرا سانس کھینچا۔ اسے افسوس ہوا تھا ان لوگوں پر جنھے اللہ نوازتا ہے پر وہ قدر نہیں کرتے، کتنے ناشکرے ہوتے ہیں ایسے لوگ۔ کوئی گل شیر سے پوچھتا تو وہ کہہ دیتا کہ اولاد تو تحفہ ہے ہم سے پوچھو جنھے اب تک اس کا سکھ نصیب نہیں ہوا۔ کیا ہوا جو بیٹی تھی؟ نصیب تو رب لکھتا ہے نا؟ انسان تو بس کوشش کرتا ہے کہ اولاد کو بہترین سے نواز سکے۔ وہ لاتعداد سوچوں میں گم تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں گل صاحب؟ آپ کو ان سے بات تو کر لینی چاہیے۔ آپ چاہتے ہیں ایک بے قصور بچی یونہی در ،در کی ٹھوکریں کھائے؟ اگر نہیں تو اٹھیں میں آپ کو لے جاتی ہوں ان کے پاس۔"

گل شیر چند لمحے ہونٹ چباتا رہا پھر صافہ سنبھالے اٹھا۔

"چلیں مجھے لے جائیں ان کے پاس، میں بچی کے ساتھ ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتا، میں صباء کو بھی ہمت ہارتا نہیں دیکھ سکتا۔"

چند لمحے بعد وہ ڈاکٹر شہناز کے پیچھے سر جھکائے جھکے کندھوں سمیت چلتا جا رہا تھا۔ دل دعا گو تھا کہ یہاں سے کوئی وسیلہ نکل آئے۔

وہ ایک وارڈ میں داخل ہوئے جہاں کئی بستر ایک قطار میں لگے ہوئے تھے۔ اس کی نظریں پورے وارڈ میں گھومنے لگیں۔ طرح، طرح کے مریض وہاں تھے۔ سب خود میں مگن تھے۔ اسے اسی جوڑے کی تلاش تھی۔ بلا آخر تلاش ختم ہوئی اور ڈاکٹر اسے لئے کونے میں پردہ لگا کر بنائے چھوٹے سے کمرے میں لے آئی۔ ڈاکٹر ابھی اطلاع دینے ہی والی تھی کہ اندر سے کسی مرد کی تیز آواز آئی۔

"جنم جلی تو لڑکا پیدا نہیں کر سکتی تھی؟ میں اپنے گھر والوں کو کیا منہ

دکھاؤں گا؟ کس منہ سے گھر جاؤں گا؟ تجھے طلاق ہی دے دیتا ہوں تا کہ جان ہی چھوٹ جائے۔ تجھ سے بھی اور اس مصیبت سے بھی۔"

پھر کسی عورت کی سہمی آواز آئی۔

"قیصر آپ کو رب سونپنے کا واسطہ یہ ظلم نہ کریں میں مر جاؤں گی۔ اس بچی کو۔۔۔" باہر کھڑے گل شیر نے بچی لفظ پر اس عورت کا بھیگتا لہجہ محسوس کیا تھا۔ پھر اسی لہجے کو سخت ہوتا محسوس کیا۔ "ہم یہیں چھوڑ جاتے ہیں اسے ۔ہماری بلا سے۔"

وہ آخر میں رو پڑی۔ اس کے شوہر کو لگا وہ طلاق کے خوف سے رو رہی ہے مگر گل شیر اور ڈاکٹر شہناز حقیقت سے واقف تھے کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ ڈاکٹر شہناز نے با آواز بلند اجازت مانگی۔ چند لمحے بعد اجازت مل گئی۔ وہ پردے سرکاتے اندر آ گئے۔

☆☆☆☆☆

دروازے پر وہ کھڑی تھی۔ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی ہے مگر نقاب کے سبب وہ مسکراہٹ دیکھنے سے قاصر رہا۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ چہرہ سپاٹ تھا۔ اور آنکھیں منتظر۔ اس روز کے بعد اب ملاقات ہوئی تھی۔ کشف قدم، قدم چلتی اس کے پاس آ رہی تھی۔ چار قدموں کے فاصلے پر رک گئی۔ مرتضیٰ نے دیکھا اس کی آنکھوں میں مرتضیٰ کے لئے کوئی کراہیت نہ تھی۔ وہ اس کے ناجائز ہونے کے بارے میں جان کر بھی سامنے کھڑی تھی پر کیوں؟ اب تو وہ حقیقت اس پر واضع کر چکا تھا تو آخر کیوں؟

"خانزادی آپ یہاں؟"

وہ خود کچھ نہ بولی تو تنگ آ کر مرتضیٰ ہی بول پڑا۔ لہجہ نہ سخت تھا، نہ سپاٹ۔

"ہم آپ کو بتانے آئے ہیں کہ آپ ہمارے بھائی نہیں ہیں۔ ہم آپ کی بہن نہیں ہیں۔ اس دن آپ اٹل حقیقت سنا کر چلے آئے تھے آج ہم سنانے آئے ہیں۔"

وہ کیا کہہ رہی تھی؟ کیا بول رہی ہی؟ کیسی حقیقت؟

☆☆☆☆☆

عورت نے اپنا چہرہ ڈھک لیا تھا جب کہ قیصر نامی وہ آدمی اشتعال سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ڈاکٹرنی صاحبہ آپ ہماری عورت کے سامنے کسی غیر کو کیوں لائیں۔"

وہ تیز لہجے میں بول رہا تھا۔

"قیصر صاحب اطمینان رکھیں۔ انہیں آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔"

قیصر چند لمحے اچنبھے سے اسے دیکھتا رہا پھر سر اثبات میں ہلائے اجازت دے دی۔ جبکہ شیر گل کی نظر تو ایک جانب کپڑے میں لپیٹی پڑی اس بچی پر تھیں۔

"میرا نام گل شیر ہے۔میری بھی آج بیٹی ہوئی تھی۔تم کو مبارک ہو تمہاری بیٹی۔۔۔"

وہ جملہ مکمل کرتا اس سے قبل قیصر بھڑک اٹھا۔

"بکواس بند کر،مبارک باد بیٹے کی پیدائش پر دیتے اچھے لگتے ہیں۔"

گل شیر نے مصالحتی انداز میں ہاتھ اٹھائے اسے روکا۔

"تم لوگ بچی نہیں رکھنا چاہتے؟"

اس نے ڈاکٹر شہناز کے اشارے پر بات کا آغاز کیا۔عورت کچھ بے چین نظر آئی۔مرد سمجھے نہ سمجھے کوکھ سے پیدا کرنے والی ماں سب سمجھتی ہے۔

"نہیں ہم اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔تمہیں چاہیے تو لے جاؤ۔"

وہ نخوت سے بولا اور اس کا ذکر یوں کیا جیسے وہ سیل پر لگا کوئی کپڑا ہے جسے اٹھاؤ اور لے جاؤ۔گل شیر کو صحیح معنوں میں افسوس نے آگھیرا۔اس نے آگے بڑھ کر اس بچی کو اٹھایا۔وہ اٹھانا کیا تھا اسے لگا اسے تمام جہانوں کی خوشیاں مل گئی ہیں۔وہ اسے سینے سے لگائے پہلی بار ضبط کھو گیا تھا۔وہ پہلی بار تھا کہ اتنی آزمائشوں کے بعد وہ پہلی رحمت پر رو پڑا تھا۔کیا رب یوں نہیں نواز دیتا ہے؟اس نے سر جھٹکا۔بے شک وہی تو نواز سکتا ہے۔ڈاکٹر شہناز کے ہمراہ جب وہاں سے نکلا تو اس کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو بہہ رہے تھے،نکلنے سے قبل اس نے محض ایک مرتبہ اس عورت کی جانب دیکھا تھا جس نے سختی سے اپنا چہرہ موڑا تھا۔وہ ہلکی سی آواز میں بولنے لگا۔

"میری ان کو دی دعائیں ان خاتون کو ہمت نہیں دے سکتیں آپ انھیں یقین دلا دیجیئے گا کہ گل شیر اور صباء زینش کو اپنی جان سے بڑھ کر محبت دیں گے۔قیصر قدر نہیں کر سکا لیکن مجھے کرنا آتی ہے۔یہ میری زینی ہے۔میرے جگر کا ٹکڑا،میری آنکھوں کا نور۔بس یہ سمجھیں کہ آج زینش ہی پیدا ہوئی تھی اور یہی بات صباء تک پہنچے۔"

وہ نام دے چکا تھا۔ڈاکٹر شہناز نے اثبات میں سر ہلایا۔وہ گل شیر کی بات کو سمجھ رہی تھیں۔گود میں تھامی زینی کو پیار کرتے پل، پل دور جاتے گل شیر کی پشت تکتے ڈاکٹر شہناز سوچ رہی تھیں کہ بے شک رب کے بھلے بندوں سے بھی دنیا بھری پڑی ہے۔

☆☆☆☆☆

کمرے میں گہری دبیز خاموشی تھی۔دونوں نفوس کے مابین اب لمبی، گہری بولتی خاموشی تھی۔

"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ کھل کر بتایئے میں سمجھ نہیں پا رہا۔"

چند ثانیے بعد وہ بول پڑا۔وہ واقعی نہیں سمجھ پا رہا تھا کشف کیا کہہ رہی ہے؟ کیا وہ جھوٹ بول رہی تھی؟ ہاں شاید۔

"ہم سفر سے کیوں ڈرتی ہیں؟ آپ کو معلوم ہے اس روز ہماری طبیعت کیوں خراب ہوئی۔کیوں کہ۔۔۔ہم نے ۔۔۔ہم نے ایک حادثے میں اپنے۔۔۔والدین کو کھویا تھا۔ہم وہ حادثہ بھول نہیں سکتے، کبھی نہیں، وہ حادثہ۔۔۔ وہ ہمارے ذہن میں گھر کر چکا ہے۔وہ کسی آسیب کی طرح" مرتضیٰ سن کھڑا تھا۔کیا کشف خانزادی نہیں تھی؟ وہ کس کی بیٹی تھی؟ حویلی والوں نے کیسے اسے قبول کیا تھا؟ اس کا لہجہ بھیگ رہا تھا۔"وہ آسیب کی طرح ہمیں اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے۔ہم اسے یاد کیے پل، پل مرتے ہیں مرتضیٰ، ہم۔۔۔"

باہر کوئی آہٹ ہوئی پھر زور دار چھناکے سے گلدان ٹوٹنے کی آواز آئی۔شاید باہر کوئی تھا جو سب سن چکا تھا مگر کون؟ مرتضیٰ نے خالی نظروں سے کشف کو دیکھا اور یہی حال کشف کا تھا۔چہرے کا سارا خون نچوڑا گیا تھا۔

"مرتضیٰ۔۔۔"

اس کی آواز آہٹ سے کم نہ تھی۔اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا اور نووارد کو دیکھتے ہی مرتضیٰ نے جھٹ سے کشف کی جانب دیکھا تھا۔

☆☆☆☆☆

انھیں گھر لوٹے دس دن بیت گئے تھے۔اس روز سے اب تک ملنے ملانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ایک جاتا تو دوسرا چلا آتا۔برسوں بعد ہی صحیح بیٹی ہونے پر بھی گل شیر کی ماں خوش تھیں حالانکہ وہ پوتا چاہتی تھیں مگر پوتی پر بھی صبر کر لیا تھا۔یہ الگ بات تھی کہ وقفے،وقفے سے صباء کو طعنے دیے جا رہے تھے صبا بیٹی کی خوشی پر پھولے نہ سما رہی تھی۔اللہ نے اسے اتنے برس بعد اولاد کی نعمت سے نوازا تھا۔کچھ مرتضیٰ کے سوال اسے پریشان کیے رکھتے تھے۔مگر گل شیر ہر ممکن کوشش کرتا کہ اس کے غموں پر مرہم رکھ سکے اور یہ وہ

کرتا بھی تھا۔

زینش کی پیدائش کو دو ماہ بیت گئے تھے۔سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا تھا۔مگر بخش نے محسوس کیا کہ آج کل صباء کسی گہری سوچ میں ہمہ وقت مگن رہتی ہے۔

اس وقت بھی وہ چٹیا کے بل کھولتی سنگھار میز کے سامنے بیٹھی تھی۔بستر پر لیٹا گل شیر تکیے پر سر رکھے مسلسل اس کی جانب دیکھ رہا تھا مگر وہ پھر بھی نہیں چونکی۔یونہی بیٹھی رہی۔

"صباء۔۔۔"

جب وہ سونے کو لیٹے تو گل شیر نے اشارے سے صباء کو پاس بلایا وہ گل شیر کے برابر میں آ لیٹی۔گل شیر نے کہنی تکیہ پر رکھی اور دھیرے سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔وہ آنکھیں موند گئی۔روز سونے سے پہلے وہ یونہی اس کے بالوں میں ہاتھ چلاتا اس سے دن بھر کی باتیں کرتا اپنے نرم لہجے سے اسے تسلی دیتا تھا۔

"میں دیکھ رہا ہوں تو پریشان ہے کچھ دنوں سے خیر ہے نا؟"

وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا سنجیدگی سے بولا صباء نے پل بھر کو اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر انگلیاں چٹخاتے نظر جھکا گئی۔

"گل مجھے ایک بات پریشان کر رہی ہے۔"

وہ عجیب انداز میں بولنے لگی۔ گل شیر چونکا۔

"تو میں یہاں کس لئے ہوں؟ مجھے بتاؤ؟"

اس نے اپنا بازو پھیلایا اور اس کا سر اٹھا کر اپنے بازو پر رکھ لیا۔

"جانتے ہیں نو ماہ کوکھ میں رکھنے والی ماں اپنی اولاد کی ہر کیفیت سے واقف ہوتی ہے اس دوران اولاد اور ماں کے مابین ایسا رشتہ استوار ہوتا ہے کہ اسی پر پوری زندگی محیط ہوتی ہے۔ اس عرصے میں کوکھ میں پلنے والی اولاد سے ماں کی وابستگی گہری ہو جاتی ہے۔ اسے دنیا میں لائے بغیر بھی ماں جانتی ہے کہ اولاد کیسی ہے۔۔۔" رکی پھر گہرا سانس لیا اور اٹھ بیٹھی۔ گل شیر کے پاس کھسک کر اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھامے سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگی۔ گل شیر خاموش نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "یہ میری بیٹی نہیں ہے۔ میں یہ بات اول روز سے جانتی ہوں اس وقت سے جب اسے میرے ہاتھوں میں تھمایا گیا تھا۔ میں کچھ محسوس نہیں کر پائی تھی گل کچھ نہیں۔۔۔ ایسا تو نہیں ہونا چاہیے تھا مجھے کچھ تو محسوس کرنا چاہیے تھا۔ مجھے لگا تھا میرا دل دھڑکے گا کہ میں اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں میں اٹھاؤں گی مگر جانتے ہیں کوئی خوشی کا احساس مجھ میں نہ جاگا۔ آپ کا مسکراتا چہرہ، نرس کی جبری مسکراہٹ سب کچھ مجھ پر تبھی واضح ہو گیا تھا۔ سب کچھ۔۔۔ مگر میں خاموش رہی۔ میں یہ کوشش کرتی رہی کہ کہیں کوئی جذبہ محسوس کر لوں مگر یقین جانیں آج میں بہت پریشان ہوں۔ میں۔۔۔ میں کوئی جذبہ خود میں ڈھونڈھ نہیں پائی، دو ماہ گزرنے کے بعد بھی نہیں، آپ نے یہ بات مجھ سے کیوں چھپائی؟ کیوں؟"

اس کے لہجے میں ٹوٹے کانچ کی کرچیوں سی چبھن تھی۔ گل شیر کی جھکی نظریں جھکتی گئیں۔ آنکھوں کے کنارے پانی جمع ہونے لگا۔

"میں بہت مجبور تھا۔۔۔بہت زیادہ، میں تجھے دکھ میں نہیں دیکھ سکتا تھا میرا دل روتا تھا، میں کیسے تجھے بتا دیتا کہ اس بار بھی ہماری اولاد نہیں بچی۔۔۔ مگر" وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا اور پلنگ کی پشت سے ٹیک لگائی۔ "تو اتنی کٹھور تو نہیں ہے کہ اس سے محبت ہی نہ کر پائے؟"

سوالیہ انداز میں اس کی آنکھوں میں جھانکا تو ایک پل کو اس کی آنکھوں میں خفگی اتر آئی، اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"اللہ سوہنے کا لاکھ، لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہمیں یہ دن دکھایا۔۔۔بے شک ہماری۔۔۔" لہجہ کانپا۔ "ہماری اولاد اس دنیا میں نہ آپائی مگر اس نے ہمیں زینی سے نوازا۔ یہ اس رب کی کرم نوازی ہے کہ اس نے میری کوکھ کو خالی نہ رہنے دیا۔ بس آپ مجھ پر ایک اور احسان کرنا کہ یہ بات یہیں دفن ہو جائے، یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو کہ ۔۔۔اس روز بھی میں نے اپنا بچہ کھو دیا تھا۔"

بات کی آخر میں اس کا لہجہ بھیگتا گیا اور پھر وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہچکیوں سمیت بری طرح رونے لگی گل شیر بوکھلا گیا اور آگے بڑھ کر اس کے گرد بازوں کا گھیرا بنایا۔ اس کی پیٹھ تھپتھپاتے وہ ہولے، ہولے کہہ رہا تھا۔

"جھلی ہے بھلا؟ اس میں احسان کی کیا بات ہے۔۔۔ تیرا، میرا رشتہ کسی احسان کا محتاج نہیں ہے۔ یہ بات یہیں ختم ہو گئی ہے۔ ایویں تو نہیں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا۔""

وہ بولتا جا رہا تھا اور اسے تسلی دیتا جا رہا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ بے غرض چاہنے والا، بے انتہا اور ہر حال میں چاہنے اور قدر کرنے والا۔

☆☆☆☆☆

دودھیا صبح کی روشنی منڈیر کو منور کرتی جا رہی تھی۔ منڈیر پر بیٹھے کبوتر دانہ چگنے میں مصروف نظر آتے تھے جو زینی ابھی انھیں ڈال کر گئی تھی۔ باڑے کے قریب جھکی وہ جانوروں کے لئے رکھے پانی کے ٹب سے مٹی کے برتن میں پانی نکال رہی تھی۔ اسے یہ پانی بھی کبوتروں کو

پیش کرنا تھا۔ وہ کبوتروں کی دیوانی تھی اور کبوتر اس کے۔

صحن میں برگد تلے بیٹھا قمر کتابوں سے سر کھپا رہا تھا۔ سامنے کے کمرے کا دروازہ دس منٹ سے بند تھا اندر ابا تھے جنھے مرتضیٰ سے کوئی بات کرنا تھی۔ اسی لئے سب کو کمرے سے نکالے وہ مرتضیٰ سے بات کرنے میں مصروف تھے۔

اس بند لکڑی کے دروازے کے پار جائیں تو آمنے سامنے بچھی دو چارپائیوں پر سلیقے سے سفید چادر ڈالی ہوئی تھی۔ بائیں چارپائی پر مرتضی سر جھکائے بیٹھا تھا جبکہ دائیں چارپائی پر گل شیر بیٹھا تھا جس کی سنجیدہ نظریں اسی پر مرکوز تھیں۔

"تم جانتے ہو مرتضیٰ روز بروز خطرہ بڑھتا جا رہا ہے۔ کیا، کیا جا سکتا ہے اب؟"

وہ یہی سوال بار، بار کر رہے تھے۔ مرتضیٰ نے نظریں اٹھا کر ان کی جانب دیکھا۔

"ایک حل ہے میرے پاس۔۔۔"

"کیا حل ہے تمہارے پاس میں بھی سنوں؟"

گل شیر نے سنجیدگی سے پوچھا تو مرتضی قدرے آگے ہو کر بیٹھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پھنسائے اس نے گلا کھنکھارا۔

"یہ آپ بھی جانتے ہیں اور یہ بات میں بھی جانتا ہوں کہ پھوپھی زینی کو اپنی بہو بنانے پر دل و جان سے آمادہ ہیں تو کیوں نہ ہم زینی اور قمر کا نکاح پڑھا دیں۔"

جتنی تیزی سے اس نے بات مکمل کی تھی اس سے بھی زیادہ تیزی سے ہاتھ اٹھا کر گل شیر نے اسے ٹوکا۔

"اگر مجھے زینی کا رشتہ قمر سے ہی کرنا ہوتا، تو میں کبھی تمہیں اس سے شادی کا نہ بولتا، قمر ابھی چھوٹا ہے۔ اس کا قد کاٹھ بھی مناسب نہیں۔ نہ اس میں کوئی زور بازو ہے اور نہ ہمت کہ وہ زینی کو بچا سکے اور اس کے ساتھ ڈٹ کر کھڑا رہے۔ یہ تم کر سکتے تھے تبھی میں نے تمہیں کہا اور کسی کو نہیں۔"

بات کے آخر میں ان کا لہجہ سپاٹ ہوا تھا۔ مرتضیٰ نے اب کی بار سخت لہجہ اپنایا۔

"آپ کیوں ایک ہی بات کو بار، بار دوہرا رہے ہیں۔ جب میں ایک بار انکار کر چکا ہوں تو آخر بار، بار اس بات کا ذکر کرنے سے کیا حاصل ہو گا؟"

اس کا لہجہ اور انداز دونوں ہی خشک تھے۔ گل شیر نے لمبا سانس کھینچا۔ وہ چاہے کچھ بھی کر لیں اس کی نہ، ہاں میں تبدیل نہیں ہو سکتی تھی۔

"میں مانتا ہوں کہ زینی میری حقیقی بہن نہیں، آپ یہ جانتے ہیں، مور جان جانتی تھیں مگر اور یہاں کوئی یہ بات نہیں جانتا اور اس سے انجان رہنا ہی بہتر ہے۔ کسی کے سامنے یہ بات نہ ہی کھلے تو ہی بہتر ہے۔ میں نے زینی کو ہمیشہ اپنی بہن مانا ہے اب خدارا مجھے شرمندہ نہ کریں۔ مجھ میں ابھی اتنی ہمت و طاقت ہے کہ میں اپنی بہن کا خیال رکھ سکوں اور میں رکھوں گا۔"

وہ مضبوط لہجے میں بولتا اٹھ کھڑا ہوا اور دروازہ کھولے باہر چل دیا۔ گل شیر لکڑی کے ہلتے دروازے کو دیکھتے رہے۔ خاموشی سے ماضی ان کے سامنے پھر سے آ کھڑا ہوا۔

☆☆☆☆☆

زندگی ایک ڈگر پر چل نکلی تھی۔ ماضی دور جا سویا تھا۔ شب و روز پر سکون گزر رہے تھے۔ گل شیر صبح کام کو جاتا رات گئے لوٹ آتا۔ مرتضیٰ شام کو گاؤں کے ایک رئیس کے ہاں کام کرتا اور دن میں بسیں بدل، بدل کر کالج جاتا

تھا۔رات واپسی پر ننھی پری اس کی منتظر ہوتی۔یکے بعد دیگرے اس کی بڑی پھوپھی اور پھر دادی کا انتقال ہو گیا تھا۔

دن پر لگائے گزر رہے تھے اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ کالج سے لوٹنے پر مرتضیٰ کو علم ہوا کہ اس کی ماں کی حالت بہت خراب ہے۔اسے سرکاری ہسپتال لے جایا گیا تھا۔اس کی چھوٹی بیوہ پھوپھی اپنے بیٹے کو لئے آگئی تھی۔بارہ سالہ زینی کو ان کے سہارے چھوڑ تا وہ بسیں بدل،بدل کر خوار ہوتا ہسپتال پہنچا تھا جہاں وارڈ کے باہر اس کا باپ ڈھلکے کندھوں سمیت ارد گرد چکر کاٹ رہا تھا۔وہ ایک ہی سانس میں ان کی طرف دوڑا آیا۔بکھرے بال،بے ترتیب حلیہ اور آنکھوں میں بے تحاشہ آنسو۔گل شیر کا دل کٹ کر رہ گیا انہوں نے اسے خود میں بھینچ ڈالا۔

"مور جان کو کیا ہوا؟"

وہ بہت کم انھیں مور جان کہتا تھا۔مگر جب کہتا تو لہجے میں بڑی شدت ہوتی تھی۔گل شیر نے نفی میں سر ہلایا۔

"اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔۔۔شریان۔۔۔پھٹ گئی ہے۔"

آخر میں بوڑھا لہجہ کپکپایا۔شریکِ حیات کا غم دیمک بنا چاٹ رہا تھا۔مرتضیٰ بھی ڈبڈبائی نظروں سے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

کئی دن گزر گئے تھے۔بے کیف سے دن،مگر ان بے کیف سے دنوں میں ایک بات بھلی تھی اور وہ یہ کہ دوبارہ سفیر نامی بلا ان کے راستے میں نہیں آئی تھی۔اب وہ گھر سے کینو توڑ لے جاتی تھیں اور دن بھر کینو کھانے کو چھٹی کا انتظار کرتی تھیں۔آج وہ عام دنوں کی نسبت زیادہ کینو توڑ کر لائی تھیں اور آج ارادہ بھی دیر سے گھر جانے کا

تھا۔ آج مرتضیٰ کو انھیں لینے نہیں آنا تھا کیوں کہ اسے بڑے سرکار کے کام سے گاؤں سے باہر جانا پڑا تھا۔ اس نے زینی اور سمی کو نہر کے راستے آنے کا کہا تھا کیوں کہ وہ راستہ زیادہ محفوظ تھا۔

وہ اسکول سے نکلیں تو خوش گوار ہواؤں نے ان کا استقبال کیا۔ وہ کھکھلاتے ہوئے پگڈنڈی پر اتر آئیں اور وہاں سے نہر کو جاتا راستہ اختیار کیا۔

"سمی کینو نکال۔"

اپنے بستے سے نمک کا لفافہ نکالتے ہوئے مصروف سے انداز میں زینی نے سمی سے کہا۔ اس نے جھٹ سے اثبات میں سر ہلایا اور بستہ کھولے تین سے چار کینو نکالے۔ فی الحال اتنے ہی کافی تھے مزید وہ انہیں کھانے کے بعد نکال لیتیں۔ وہ نہر کے کنارے کچی پگڈنڈی پر چلنے لگی تھیں۔ نہر کے دونوں اطراف میں ڈھیروں سایہ دار درخت قطار میں لگے ہوئے تھے جن کی شاخیں نہر پر جھکی ہوئی تھیں۔ کئی شاخوں پر لگے پتے جب جھڑتے تو نہر کے پانی سے جا ملتے اور پھر اسی کے سنگ بہتے رہتے۔ وہاں پر سکون اور لطیف ہوا ایسا سرور بخش رہی تھی کہ رگ و جان میں سکون سرایت کرتا جا رہا تھا۔ اس رگ و جان میں سکون سرایت کر دینے والے موسم کو دیکھتے ہوئے زینی کے دماغ میں جھٹ سے ایک خیال لپکا۔ وہ رکی تو پیدل چلتی سمی نے بھی رک کر اسے دیکھا۔

"کیا ہوا؟ تو رک کیوں گئی؟"

سمی نے کینو کی کاش منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا، زینی نے ارد گرد دیکھا۔ کتنا دل فریب سماں تھا۔

"سمی یہاں کوئی نہیں ہے کیوں نہ ہم کچھ دیر یہیں نہر کنارے بیٹھ کر کینو کھائیں۔ دیکھ نہر کا پانی کتنا ٹھنڈا اور مزے دار ہے۔ آجا پیر ڈبو کر بیٹھتے ہیں اور کینو کھاتے ہیں بڑا مزہ آئے گا۔"

وہ لالچ دیتے لہجے میں بولی تو پل بھر میں ہی سمی بھی لالچ میں آگئی دونوں نے اپنے بستے اتار کر ایک تناور درخت کے پاس رکھے اور ٹخنوں سے شلوار اونچی کرتیں پاؤں نہر میں ڈبو کر بیٹھ گئیں۔کتنے لمحے یونہی بیت گئے وہ نہر میں پاؤں زور، زور سے مارتیں تو چھینٹے انہی پر پڑنے لگتے۔

"زینی تمہیں کبھی قمر سے محبت ہوئی؟"

سمی کے اچانک سوال پر کینو کھاتی زینی رکی پھر مشکوک انداز میں اسے دیکھا۔

"نہیں مجھے اس سے محبت تو نہیں ہے، وہ اچھا بھی نہیں لگتا کچھ خاص لیکن جب وہ میرا خیال رکھتا ہے تو اس سے اچھا کوئی اور لگتا بھی نہیں ہے۔"

"ہمممم۔۔۔"وہ بدوقت پھیکا سا مسکرائی۔زینی نے چہرے موڑے اسے دیکھا جس نے پل بھر میں اپنے تاثرات چھپا لیے۔

"مجھ سے بھی زیادہ اچھا لگتا ہے؟"

اندازہ سوالیہ اور شکوہ کرتا تھا۔زینی کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔سمی نے خفگی سے منہ پھلائے اسے دیکھا جو پیٹ پکڑے ہنس رہی تھی۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں پوچھی تجھ سے جو اتنا ہنس رہی ہے۔"

وہ ناراضگی سے بولی۔زینی نے ہنسی پر قابو پایا۔

"ایک تیرا جھوٹ چھپانے کا طریقہ۔۔۔کیا بات ہے؟اوپر سے جیسا منہ بنایا تھا تو نے، الامان۔۔۔"

اس نے سر جھٹکا پھر آخری کاش منہ میں ڈالتی ہاتھ جھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئی۔سمی بھی بوکھلاہٹ پر قابو پاتی اٹھی۔وہ گڑبڑا گئی تھی۔خود سے وعدہ کر چکی تھی کہ اب دوبارہ قمر کا ذکر نہیں کرے گی مگر ہائے یہ کمبخت دل کہاں سنتا ہے کسی کی؟

پل بھر بعد ہی وہ دوبارہ پگڈنڈی پر ایک ساتھ نہر کنارے چلتی جا رہی تھیں، نہر کا پانی ہنوز بہتا جا رہا تھا جیسے موجوں میں رواں زندگی۔

☆☆☆☆☆

اسی لمحے کشف نے بھی مرتضیٰ کی جانب دیکھا۔ دوسری نظر دروازے پر کھڑی ہانپتی کانپتی خجستہ پر پڑی۔

"بی بی بڑے سرکار اور باقی سب لوٹ آئے ہیں جی۔ جلدی نکلیں، ورنہ ہم دونوں مار دی جائیں گی۔ اور ساتھ ہی مرتضیٰ۔۔۔"

وہ اپنی بات مکمل کر پاتی اس سے قبل ہی کشف بول اٹھی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ ہمیں نکلنا ہے۔ ہم پرسوں رات حویلی کے بڑے لان میں کھلتی زنان خانے کی کھڑکی کے پاس آپ کا انتظار کریں گے۔

ہم آپ کو اس بات سے آگاہ کریں گے۔ آپکا آنا ہمارے لئے باعثِ

خوشی ہو گا۔"

وہ تیزی سے بولتی خجستہ کا ہاتھ تھامے باہر نکلی۔ مرتضیٰ دروازے کے ہلتے کواڑ دیکھتا رہا اور اس کے پار چادر میں لپٹا وہ وجود جو پل، پل دور جا رہا تھا۔ وہ کس راز سے پردہ اٹھا گئی تھی؟ کیا جاننے کو باقی رہتا تھا؟ وہ ادھورا سچ کیا تھا؟ حقیقت کیا تھی؟ کیا اسے پرسوں شب اسے ملنے آنا چاہیے؟ لاتعداد سوچیں ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ تبھی دروازے سے نظر آتے لاؤنج میں کھڑے آغا جان نظر آئے جن کی نظر لاؤنج کے بیچ و بیچ رکھے میز پر پڑے اس گلدان پر تھی جو اب ٹوٹ چکا تھا۔ مرتضیٰ فوراً سے باہر نکلا۔ بات نہ سنبھالی تو بگڑتی جاتی۔

"سلام سائیں"

اس نے مودب لہجے میں کہا۔ عطا اللہ خان نے چونک کر اسے دیکھا۔

"والسلام۔۔۔یہاں کیا ہوا؟ یہ گلدان کیسے ٹوٹا؟"

ان کی نظریں اطراف کے جائزے میں مصروف ہو چکی تھیں۔داخلی دروازے سے زمان خان اور سلیمان خان داخل ہوئے۔مرتضیٰ نے ایک نظر فرش پر ٹوٹے بکھرے پڑے گلدان کو دیکھا۔

"سرکار بندہِ ناچیز سے غلطی ہو گئی۔معاف کر دیں۔میں تیزی میں تھا، ٹکرا گیا۔"

وہ سارا الزام اپنے سر لے گیا۔عطا اللہ خان کی بھنوؤں کا تناؤ ختم ہوا۔

"ٹھیک ہے آئندہ دھیان رکھنا۔اب جاؤ اور فائل لے آؤ۔میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔"

انہوں نے سخت لہجے میں کہا پھر بازو پشت پر باندھے تمکنت سے چلتے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔مرتضیٰ سر اثبات میں ہلاتا مڑا تو نظریں زمان خان کی جانب گئیں جو آج پھر اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔شاید شناسائی کی کوئی رمق؟ مرتضیٰ نے انھیں سخت نظروں سے گھورا پھر سر جھٹکتا اندر کی جانب بڑھ گیا۔

زمان خان نے سر جھٹکا۔یہ انھیں کیا ہو جاتا تھا؟ شاید یہ کسی کی یاد دلاتا تھا اور بڑی شدت سے یاد دلاتا تھا۔ہاں ۔۔۔ان کی جوانی کا دور، یہ ان کی جوانی ہی معلوم ہوتا تھا۔

☆☆☆☆☆

آسمان پر موجود سورج نے آج سوات کو منور کر رکھا تھا۔منڈیر پر چھاتی صبح کی دودھیا روشنی پھیلتی جا رہی تھی اور کبوتر اپنی جگہ پر موجود تھے۔دیوار کے ساتھ لگی کیاری میں مختلف رنگا رنگ پھول کھلے ہوئے تھے جو بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔آج اتوار کا دن تھا۔مرتضیٰ عام دنوں کی نسبت آج گھر موجود تھا۔کل صبح اسے بڑے سرکار کے کام سے پھوپھو ٹنے سے قبل ہی گھر سے نکلنا تھا۔کل کا سفر بہت تھکا دینے والا ثابت ہونے والا تھا تب ہی مرتضی کو گھر رہنے کی ہدایت کی گئی تھی کیونکہ علی الصبح نکلنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ بھرپور آرام کرتا اور اس کے بعد نکلتا۔

ٹھک۔۔۔ ٹھک۔۔۔ ٹھک

سادہ حلیے میں بکھرے بال لئے وہ لکڑی کے موٹے تنے پر لکڑی کے بڑے ٹکڑے رکھتا اور آری سے انھیں ضرب لگا دیتا۔ ایک ہی وار میں لکڑی کے دو ٹکڑے ہو جاتے۔ وہ بظاہر کام کرنے میں مصروف تھا مگر نظریں زینی پر تھیں جو کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ ہاتھ میں پکڑے تھال میں چاول یونہی پڑے تھے شاید وہ انھیں صاف کر رہی تھی یا شاید انھیں تھامے کسی اور دنیا میں پہنچی ہوئی تھی۔

ٹھک۔۔۔ ٹھک۔۔۔ ٹھک

آواز بڑھتی جا رہی تھی۔ کل پھر اسے مرتضیٰ کے بغیر اسکول جانا ہو گا۔ یہ آزمائش تو ہر گزرتے روز بڑھتی ہی چلی جا رہی تھیں۔ اگر کل اس کا سامنا سفیر سے ہو گیا تو وہ کیا کرے گی؟ وہ کس طریقے سے خود کو بچائے گی۔

ٹھک۔۔۔ ٹھک۔۔۔ ٹھک۔۔۔

آواز کم ہوتے ہوتے بلا آخر ختم ہو گئی اور چند ثانیے بعد اسے تولیے سے ہاتھ پونچھتا مرتضی اپنی جانب آتا نظر آیا۔ وہ کسی گہرے خواب سے چونکی اور سر اٹھا کر مرتضی کی جانب دیکھا جو اس سے چار قدم کے فاصلے پر رکا تھا۔ سنجیدہ نظریں اسی پر مرکوز تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھ پاتی مرتضی اس کے ساتھ ہی دیوار سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھ گیا۔

"کس بات نے ہماری شہزادی کو پریشان کر رکھا ہے؟"

اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔ زینی چند لمحے خاموشی سے اس کی جانب دیکھتی رہی پھر دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" وہ گھبرا کر بولی۔ ہاتھ میں تھاما تھال برابر میں رکھ دیا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کافی دیر سے تم یوں ہی گم سم بیٹھی ہو۔ بتاؤ مجھے کیا مسئلہ ہے؟"

زینی نے تھوک نگلا پھر ہمت جمع کی۔ گہرا سانس بھرا اور مرتضیٰ کی طرف دیکھا۔

"لالہ مجھے چھوٹے خان کا۔۔۔"

اس سے پہلے وہ بات مکمل کر پاتی مرتضیٰ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

"یہ مت کہنا تمہیں۔۔۔یعنی کہ زینی تمہیں اس انسان سے خوف محسوس ہو رہا ہے۔"

وہ نفی میں سر ہلاتا خفگی سے بولا۔زینی نے خفت سے چہرہ موڑ لیا۔وہ باقی کسی سے ڈرتی نہ تھی مگر اس انسان کا معاملہ الگ تھا۔اس سے نا جانے کیوں خوف محسوس ہوتا تھا۔شاید اس کی باتیں یا اس کے دیکھنے کا انداز جو بے ساختہ مقابل کو کپکپانے پر مجبور کر دیتا تھا۔اس کی آنکھوں میں کوئی انجانا سا تاثر ہوتا جسے دیکھ کر ہر لمحہ زینی کو خوف محسوس ہوتا تھا کوئی خوف اسے اپنے شکنجے میں جکڑ لیتا تھا اور اس خوف کا آغاز اسی میدان سے ہو گیا تھا،اسی لمحے ہو گیا تھا جب اس کا پہلی بار سفیر خان سے سامنا ہوا تھا۔وہ دن اور آج کا دن وہ کبھی اس خوف سے خود کو آزاد ہی نہ کروا پائی تھی۔

"تم ڈرنے لگی ہو نا اس سے؟"

مرتضیٰ نے اس کی خاموشی سے سب بھانپ لیا۔زینی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

مرتضیٰ نے ارد گرد دیکھا پھر مڑ کر سختی سے اسے گھورا۔

"آنسو صاف کرو۔۔۔تم کمزور نہیں ہو۔"

لہجہ سخت تھا۔زینی نے آنسو پونچھ ڈالے۔اگلے ہی پل اس کا لہجہ سپاٹ ہو چکا تھا۔

"تمہیں اس سے ڈرنا نہیں ہے، تمہیں اب اس بات کی عادت ڈالنی ہو گی، یہ بات تمہیں اسی روز سوچنی چاہیے تھی کہ جب تم ہماری اجازت کے بغیر اس میدان میں گئی تھی جب اس داستان کا آغاز ہوا تھا اور نا جانے اس کا انجام کیا ہو گا؟ مگر میں وعدہ کرتا ہوں میں اپنی بہن کی عزت پر کوئی حرف نہیں آنے دوں گا۔پھر چاہے مجھے حویلی سے ہی بغاوت کیوں نہ کرنی پڑے۔"

اس کی بات کے ختم ہوتے ہی زینی کے آنسو رواں ہو گئے۔ کب کے رکے آنسو عارضوں پر بہہ نکلے۔ اس نے اپنی وجہ سے سب کو مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ بھلا سفیر خان کی نظر کسی پر پڑ جائے اور وہ اسے بخش دے؟ ایسا تو ممکن ہی نہ تھا۔ اسے رہ، رہ کر اپنی کم عقلی پر افسوس ہو رہا تھا۔ مرتضیٰ کی بات یاد کیے اس نے سختی سے آنسو پونچھ ڈالے۔

"میں کمزور نہیں ہوں لالہ۔۔۔ نہیں ہوں میں کمزور۔"

بڑبڑاہٹ بہت مدھم تھی۔ کبوتر افسردہ نظر آتے تھے۔ گردن جھکائے وہ اس کے غم میں ماتم کناں تھے۔

☆☆☆☆☆

خالی نظریں بند دروازے پر مرکوز تھیں۔ اس بند دروازے کے پار پڑی عورت زندگی و موت کی کشمکش میں تھی۔ ابھی چند ثانیے قبل ہی ڈاکٹر نے انہیں بتایا تھا کہ وہ ہوش میں آچکی ہیں اس بات نے جہاں خوشی دی وہاں ہی ڈاکٹر کی اگلی بات نے ان کے دلوں پر جیسے کوئی پتھر لا کھڑا کیا تھا، کوئی ایسا پتھر جو دکھتا نہیں تھا مگر اس کا وزن بہت زیادہ تھا، جو نہ چین سے بیٹھنے دے رہا تھا نہ رونے۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کے اگلے چوبیس گھنٹے اس کے لیے نہایت اہم ہیں۔ دس منٹ کی مختصر ملاقات کی اجازت مل گئی تھی۔ وہ گل شیر کو سہارا دیے دروازہ کھیلتا اندر چلا آیا سامنے بستر پر پڑا الاغر وجود آنکھیں موندیں لیٹا تھا۔ آہٹ پر اس کی پلکوں میں جنبش ہوئی۔ اگلے ہی لمحے کچھ دقت سے صبا نے اپنی آنکھیں کھولیں تو نظریں سیدھی آنسو بہاتے مرتضیٰ پر جا ٹھہریں اور پھر اس کے ساتھ کھڑے ایک ہی دن میں بوڑھے نظر آنے والے گل شیر پر گئیں۔ وہ دھیرے سے مسکرائی ایسی مسکراہٹ جس میں ہونٹ آنکھوں کا ساتھ نہیں دے رہے تھے گل شیر کو پھر سے رونا آیا انہوں نے پل بھر میں رخ موڑ کر آنسو چھپائے اور اپنا بھرم رکھ لیا جبکہ مرتضیٰ اپنے آنسو نہ چھپا پایا اور اگلے ہی لمحے وہ دوڑتا ہوا اس کے گلے آلگا۔ وہ زار و قطار ہچکیوں سے نہ صرف خود رو رہا تھا بلکہ دونوں کو رلائے دے رہا تھا۔

"میں ٹھیک ہو جاؤں گی پریشان مت ہو۔"

گل شیر کو لگا وہ بدوقت پھیکا سا مسکرا کر انہیں تسلی دے رہی ہے۔

"مرتضیٰ میری جان۔"

وہ دھیمے لہجے میں مسکائی۔ مرتضیٰ یونہی ان کے سینے سے لگا آنسو بہا رہا تھا۔ اس کی مدھر پکار پر ایک لمحہ کو خاموش ہوا تھا۔

"میری جان۔۔۔ میرے بہادر بیٹا۔ روتے نہیں ہیں، بزدل لوگ روتے ہیں۔ میں بھی پہلے بہت روتی تھی مگر تمہارے ابا نے مجھے سکھایا کہ رونا بزدلوں کو ہی شیوہ دیتا ہے بہادر لوگ تو غم کو کڑوا جام سمجھ کر پی لیتے ہیں۔"

وہ اس کے بالوں میں ہاتھ چلاتیں آہستہ آواز میں بولتی جا رہی تھیں۔ یوں جیسے ماحول پر کوئی طلسم کوئی جادو کر رہی تھی اور مرتضیٰ اس قید میں قید ہوتا جا رہا تھا۔ اس قفس میں اسیر ہونے سے قبل ہی اسے صباء نے اس راز سے آشنائی سونپی جو اس کی رگ و جان پر عذاب بننے والی تھی۔ ایسی تلخ حقیقت جو اس کی زندگی کا بچا سویرا چھینے اسے بھی سیاہ کرنے والی تھی۔ اس آگہی کا لمحہ، عذاب سا تھا۔ وہ ایسی ضرب تھی جس نے مرتضیٰ کو بیک وقت برباد ، بیدار، اور حقیقت سے آشنا کر دیا تھا۔

"مرتضیٰ تم حویلی کے ہی بیٹے ہو مگر ناجائز۔۔۔"

گل شیر پہلے کا موڑ ارخ مزید موڑ گئے۔ وہ کیسے اپنی شریک حیات سے نظریں ملا لیتے؟ جانتے تھے کہ آج اسے روکیں گے تب بھی وہ بولیں گی مگر انھیں اندازہ نہ تھا کہ جب مرتضیٰ کو اس بات سے آگہی سونپیں گے تو ان کے اپنے دل کی حالت کیا ہو گی؟

"ککک۔۔۔ کیا کہہ رہی ہیں مور جان؟ ہوش میں ہیں آپ؟ میں حویلی والوں کی؟"

اب تو عمر کا وہ دور آن پہنچا تھا کہ سب سمجھ آنے لگا تھا۔اب تو ناجائز و جائز کا فرق بھی معلوم ہونے لگا تھا۔اس نے بچپن کے واقعات کو آسیب اور برا خواب سمجھے جھٹلا دیا تھا مگر آج دوبارہ لفظ ناجائز ایک چابک بنے اس کی پیٹھ کو لہو لہان کر رہا تھا اور جو صباء بول رہی تھی۔۔۔جو بتا رہی تھیں۔۔۔وہ تو عذاب پر عذاب تھا۔ہر حقیقت پہلی حقیقت سے بڑھ کر چابک مار رہی تھی۔ساری زندگی اس سے سب چھپا کر رکھنے والی ماں آج اسے سب کیوں بتا رہی تھی۔شاید وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس کی موت کے بعد اسے جب یہ سب معلوم ہو تو وہ بدلے کی آگ میں جلستا رہے۔وہ اسے معاف کرنے والوں کی صف میں دیکھنا چاہتی تھیں۔وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ چاہتی ہیں،وہ کبھی عیش و عشرت کی زندگی کو اس سادی مگر پر سکون زندگی پر ترجیح نہ دے۔وہ اسے کہہ رہی تھیں کہ ہمیشہ زینی کو اپنی بہن سمجھنا۔وہ حویلی والوں کو معاف کرنے کا کہہ رہی تھیں۔وہ کہاں سے لا تا صباء جتنا ظرف؟ کتنے لمحے بیت گئے، کتنی گھڑیاں سرک گئیں مگر وہ یونہی اپنی جگہ پر بیٹھا تھا۔منجمد،برف بنا۔

"میرے بیٹے۔۔۔تم صباء کے بیٹے ہو۔۔۔جس پر بہت ظلم ہوا۔"لہجہ کانپا۔پھر ہموار ہو گیا۔"مگر اس نے صبر کا دامن نہ چھوڑا۔میں نے ہر حال میں صبر کرنا سیکھا۔چاہے خوش ہوں یا نہیں۔میں بس یہ سوچتی تھی کہ میرا مالک مجھے آزما رہا ہے وہ مجھے اس حال میں دیکھنا چاہتا ہے وہ مجھے اپنے قریب دیکھنا چاہتا ہے۔یہ باتیں مجھے ثابت قدم رکھتیں اور دیکھو مجھے آج میں سب کچھ اپنے اللہ پر چھوڑے یہ دنیا چھوڑ۔۔۔"

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے تڑپ کر گل شیر سامنے آیا۔ہاتھ

جوڑے اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگتا جا رہا تھا۔وہ سر جھکائے بس رو رہا تھا۔

"میرے۔۔۔میرے جڑے ہاتھوں کی لاج رکھ لو۔مجھ میں مزید غم سہنے کی ہمت نہیں ہے اب۔"

مرتضیٰ اٹھ کر ایک جانب ہو گیا وہ بس دھندلی نگاہوں سے ہر منظر دیکھ رہا تھا۔اس کا باپ جو اس حقیقی باپ نہ تھا مگر اسے حقیقی سے بڑھ کر محبت دیتا رہا اس کی ماں کا ہاتھ تھامے رو رہا تھا۔وہ اپنا بھرم قائم نہ رکھ پایا تھا اور خود وہ کیا تھا ایک ناجائز بچہ ؟مرتضیٰ زمان خان ہو کر بھی بس مرتضیٰ ؟

☆☆☆☆☆

آج یونیورسٹی میں زعیم اور صائم دونوں کا دن کچھ خاص نہ گزرا تھا۔ آج صفا اور مروا کے نا آنے سے صائم کو یونیورسٹی خالی، خالی جبکہ زعیم کو پھر سے حسین محسوس ہو رہی تھی۔صفا کی طنزیہ ہنسی اور شکل کو کہیں نہ پا کر اس نے شکر کا سانس بھرا تھا ورنہ وہ انسان کا جینا محال کر دیتی ہے۔ مفلر کا ڈرامہ دو دن سے زائد چل ہی نہ پایا اور اس بات کا تمام سہرا صفا کے سر جاتا تھا جو تانیہ کو مفلر کے پیچھے چھپی حقیقت سے آگاہ کر آئی تھی۔

"یار کتنی خالی، بے رنگ سی یونیورسٹی ہے۔"

صائم کے منہ سے نکلنے والے الفاظ پر بمشکل زعیم نے قہقہے پر قابو پایا۔یہ بات آج صائم نے پہلی بار کہی تھی۔ورنہ اسے تو یونی سے ایسا عشق تھا کہ الامان۔

"خیر تو ہے ؟"

زعیم انداز میں اسے گھورنے لگا۔صائم نے نظریں چرائیں۔

"ہاں نا۔بس ویسے ہی آج۔۔۔"

اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی زعیم بول اٹھا۔

"تمہیں ان دونوں چڑیلوں کے نہ آنے کا غم ستا رہا ہے ؟"

اس کا انداز سوالیہ تھا۔ابرو اچکائے وہ مشکوک انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔

"استغفر اللہ۔"

اس نے با قاعدہ کانوں کو ہاتھ لگاتے خفگی سے کہا۔زعیم پھر بھی مطمئن نہیں تھا۔دفعتاً سامنے دیکھا تو دور سے ہی وہ تانیہ نامی بلا چلی آرہی تھی۔زعیم نے برا منہ بنایا۔پھر رخ موڑ کر ارد گرد دیکھتے صائم کو۔اگلے ہی لمحے لجاجت سے اس کا بازو تھام لیا۔

"میرا راجہ۔۔۔"

وہ اسے مسکے لگانے لگا۔صائم چونک سا گیا۔

"خیر ہے؟"

اب اس کا انداز سوالیہ تھا۔زعیم نے روتی صورت بنا کر نفی میں سر ہلایا۔

"وہی تو نہیں ہے۔سامنے مت دیکھنا،وہ تانیہ آرہی ہے۔"

مگر وہ صائم ہی کیا جو اشارے کرنے سے باز آجائے۔ہاتھ اٹھا کر با قاعدہ اشارہ کر دیا۔زعیم نے اس لمحے کو کوسا جب اس نے صائم کو یہ بات بتائی مگر اب کیا ہو سکتا۔پانی سر پر سے نکل گیا تھا۔اس نے صائم کا بازو اس قدر زور سے مڑوڑا کہ اس کی چیخ نکلتے،نکلتے رہ گئی۔

"بھگتو اب اسے اکیلے۔پہلے تو میں مدد کر ہی دیتا پر اب یہ لے لو۔"

ساتھ ہی با قاعدہ انگوٹھا دکھا دیا۔زعیم فوراً لائن پر آیا۔

"آج کے لئے تو سنبھال لے اسے۔قسم سے شام میں پیزا میری طرف سے۔"

ساتھ ہی اس کے کندھے کو تھپکے ایسے شاباشی دی گویا اسے میدان جنگ میں بھیج کر آر یا پار کی ترکیب کر دی ہو۔صائم نے پیزا کی خاطر کڑوا گھونٹ بھر لیا۔چند ثانیے بعد ہی تانیہ صائم کو زعیم سمجھے اس کا بازو تھامے اسے وہاں سے لے جا رہی تھی اور صائم نے بے بسی سے مڑ کر زعیم کو یوں دیکھا گویا کہہ رہا تھا۔"وعدہ نہ بھولنا۔"زعیم

نے خوشی کے مارے بالوں میں ہاتھ چلایا۔اب آزادی ہی آزادی تھی۔اگر تانیہ سے روز جان ایک پیز اپر چھوٹ رہی تھی تو اس میں قباحت ہی کیا تھی۔

☆☆☆☆☆

رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔تاحدِ نگاہ پھیلی حویلی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔لان کے آغاز پر لگے ایک زرد بلب کی واحد روشنی تھی جو کچھ حد تک منظر واضح کرنے میں مدد کر رہی تھی۔زنان خانے کی حویلی کے لان میں کھلنے والی کھڑکی پر کسی ہیولے کے کھڑے ہونے کا گمان ہو رہا تھا۔وہ آج حویلی شام حویلی آگیا تھا اور عین دوسرے پہر کے آغاز پر باہر نکل آیا تھا۔وہ گمان حقیقت ہی تھا وہاں قریب آنے پر اسے علم ہوا کہ وہ کوئی زنانہ وجود تھا۔تو کشف وہاں خاصی دیر سے کھڑی تھی۔اس سردی میں اس کا انتظار کرتی؟اس نے حد درجہ بڑھتی سردی کو محسوس کرتے سوچا تھا۔اس کے قریب آنے پر وہاں ٹھنڈ سے ٹھٹھرتی کشف اس کی قدموں کی چاپ سنتی،دیوار کا سہارا چھوڑے سیدھی ہوئی۔جب اسے مرتضیٰ کی ہلکی آواز سنائی دی۔

"خانزادی گھبرائیں مت یہ میں ہوں مرتضیٰ۔"

اس نے وضاحت دینا ضروری سمجھا۔شاید وہ ڈر گئی تھی۔

"ہم جانتے ہیں۔"

وہ جیسے اس کی ہر آہٹ سے واقف تھی۔لہجے کا وثوق بتا رہا تھا۔مرتضیٰ نے رخ موڑ لیا اور کھڑکی سے لگتا زمین پر آبیٹھا۔ایسے کہ اب اس کی پیٹھ اس کھڑکی کے ساتھ تھی جس کی جالیوں کے پار کشف کھڑی تھی۔کشف چند لمحے کھڑی رہی پھر مرتضیٰ سے کچھ فاصلے پر اسی کھڑکی سے پیٹھ لگا کر زمین پر بیٹھ گئی۔مرتضیٰ نے اس کا بیٹھنا محسوس کیا مگر خاموش رہا۔کشف نے ہاتھ باہم رگڑے اور گہرا سانس بھرا۔منہ سے نکلتی دھند ہوا میں تحلیل ہو گئی۔

"مرتضیٰ جیسے کہ ہم نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ ہم حویلی کی بیٹی نہیں ہیں۔اب دوبارہ بھی یہی کہیں گی کہ ہم زمان خان کی بیٹی نہیں ہیں۔"

اس نے سر کھڑکی سے ٹکا دیا۔لہجہ عام سا تھا۔مرتضیٰ بغور اس کی سرگوشی نما آواز سن رہا تھا۔چند لمحے بعد وہ پھر بولی۔ہلکی،دھیمی آواز میں۔

"یہ تب کی بات ہے جب ہم سات برس کی تھیں۔ہم،ماما اور پاپا گاؤں سے واپس جا رہے تھے۔رات کا وقت تھا۔ہم کبھی وہ رات نہیں بھول سکتیں۔وہ رات بہت خوفناک تھی،بہت زیادہ۔ماما کی طبیعت بہت خراب تھی وہ رو رہی تھیں اور ارد گرد کوئی ہسپتال بھی نہیں تھا۔ہمارے گھر۔۔۔ہمارے گھر ایک بے بی آنے والا تھا۔ہم سب بہت خوش تھے۔۔۔"

اس کی آواز دھیمی ہو گئی تھی۔آواز کانپی تھی۔

"گاڑی بہت تیز چل رہی تھی۔بہت زیادہ،ارد گرد آبادی بھی نہیں تھی کیوں کہ وہ گاؤں سے واپسی کا راستہ تھا اور ماما کی حالت کا خراب ہونا بھی بہت غلط تھا۔کچھ غلط تھا۔ماما کی حالت یوں خراب نہیں ہونی چاہیے تھی۔کیوں کہ بے بی کے آنے میں ایک ماہ رہتا تھا مگر ماما کی حالت ابھی سے خراب کیوں تھی؟پاپا فکر مندی سے بول رہے تھے۔ہم خاموشی سے پیچھے بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں۔ہم ماما کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھیں۔کچی سڑک پر گاڑی ہچکولے بھی کھا رہی تھی مگر پکی سڑک پر گاڑی ڈالتے پاپا نے بہت جلد بازی کر دی۔۔۔اتنی۔۔۔کہ۔۔۔کہ"

اب واقعی اس کا لہجہ روندھ گیا تھا۔مرتضیٰ کو لگا وہ مزید بول نہیں سکتی مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے روکا۔

"اتنی کہ دوسری جانب سے آتا ٹرک انھیں نظر ہی نہیں آیا۔ہمیں ایسا لگا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ہو۔گاڑی ہچکولے کھا رہی تھی۔ہمیں ماما اور پاپا کی چیخ و پکار سنائی دی۔مہربان ہاتھ تب بھی ہمیں۔۔۔ہمیں

بچانے کی تگ و دو میں تھے۔ گاڑی کے شیشے ٹوٹ رہے تھے۔ اتنا شور تھا کہ الامان۔ وحشت کا ڈیرہ چار سو تھا۔ ہماری آنکھیں بند ہونے سے قبل شور تھم گیا تھا پھر محض کان پھاڑ خاموشی تھی۔ اتنی خاموشی کہ ہمیں ہی وحشت ہونے لگی۔ خون کے چھینٹے ہر سو تھے۔ اور ہماری آنکھیں بند ہو گئیں۔۔۔"

وہ رکی۔ مرتضیٰ نے رخ موڑ کر دیکھنا چاہا مگر وہ چہرہ موڑے بیٹھی تھی۔ تبھی وہ اس کے تاثرات نہ دیکھ پایا۔

"ہوش آیا تو ہم چپ سی ہو گئی تھیں۔ اس حادثے نے ہمارے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ ہم نے چار روز تک پانی کے سوا کچھ نہ کھایا۔ ہمارے ارد گرد ہمارے شفیق ماں باپ تو نہ تھے مگر زمان بابا تھے جو ہمارے پاپا کے بہترین دوست تھے۔ جن سے اس روز ملنے ہم گاؤں گئے تھے۔ ان کے چہرے پر ہمارے لئے محبت تو تھی ہی مگر ترحم بھی تھا۔ ان کی وہ ترحم آمیز نظریں بتا رہی تھیں کہ ہم واقع اب رحم کے قابل ہو چکی ہیں۔ ہسپتال میں سارا دن ماما، پاپا کو بلاتی تھی مگر کوئی نہیں آیا۔ پھر ہسپتال سے ڈسچارج ہونے پر زمان بابا ہمیں اپنے ساتھ لئے حویلی آ گئے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے اعلان کر دیا کہ کشف اب ان کی بیٹی ہے اب وہ ایک خانزادی ہے۔ ہم خانزادی نہ ہوتے بھی خانزادی بن گئیں۔ ہم نے اپنی ماما، پاپا اس چھوٹے آنے والے وجود، سب کو کھو دیا۔ سفر سے ہمیں خوف محسوس ہوتا تھا۔ ہم کئی روز بخار میں پڑی رہتیں۔ چھوٹی ماما اور بڑی ماما سمیت حویلی میں سب نے ہمیں بہت محبت دی۔ زعیم اور صائم کی حرکتیں اور شرارتیں، دن گزرتے گئے اور ہم اس حویلی کی عادی ہو گئیں۔ ہمیں ہر غم بھولنے لگا۔ جیسے اس پر مرہم وقت رکھتا گیا۔ حویلی کے کسی ملازم کو اس بات کی بھنک نہیں ہے۔ جنھے ہے انھیں منہ بند رکھنے کا حکم ہے سب ٹھیک ہو گیا مگر سفر کرنے سے ہمارا خوف کبھی کم نہیں ہوا اور پھر آپ آ گئے۔"

وہ جھجک کر رکی۔ چہرہ موڑا تو کچھ ہی فاصلے پر بیٹھا مرتضیٰ اسے ہی بغور دیکھ رہا تھا۔ نیلی آنکھوں میں سحر تھا اور پلکوں کے کنارے آنسو موتیوں کی مانند چمک رہے تھے۔ وہ آنکھیں مرتضیٰ کو خاموشی سے ڈھیروں جذبات خود

میں عیاں کیے دیکھ رہی تھیں۔ مرتضیٰ خاموشی سے ان آنکھوں کو ورق، ورق پڑھتا گیا۔ وہ آنکھیں مرتضیٰ کی آنکھوں کی تاب نہ لاتے ہوئے عارضوں پر لرزنے لگیں۔ شفق کی لالی پورے چہرے پر پھیل گئی تھی مگر نقاب کے سبب مرتضی اس لالی کو دیکھنے سے قاصر رہا۔ ایک بار پھر اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ مرتضیٰ کا دل یک بارگی سے دھڑکا۔ یہ کوئی انوکھا، کوئی دلفریب احساس تھا جو ان آنکھوں کے ذریعے اس کے دل میں اتر رہا تھا۔ اس نے نظریں نہیں جھکائیں وہ ان آنکھوں کو دیکھتا رہا ہے، حیرت سے، بے یقینی سے، یہ آنکھیں اسے کیسے سحر میں مبتلا کر رہی تھیں کہ ان کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

"ہم۔۔۔ ہم جاتے ہیں اب۔"

وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ مرتضیٰ نے اچھنبے سے اسے دیکھا۔ کچھ کہنے کو لب وا کیے پھر سی ڈالے اور خاموشی سے اسے سیڑھیاں چڑھتا دیکھنے لگا۔ آج اس در سے جانے کا دل نہیں تھا۔

"کس راستے پر جا رہے ہو مرتضی؟"

دماغ نے دل سے سوال کیا تو دل نے سختی سے دماغ کو جھٹلایا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے۔"

رات دوسرے پہر سے نکلے تیسرے پہر میں منتقل ہو گئی تھی۔ حویلی کے وسیع لان میں گہری، دبیز، معنی خیز گفتگو کرتی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دو دلوں کی دھڑکنیں ایک تال پر کب آئیں گی؟ وقت منتظر تھا اور تقدیر ہولے سے مسکرا دی۔

☆☆☆☆☆

رات والی کیفیت پر پردہ ڈالے صبح ہوتے ہی مرتضیٰ تیار ہونے کے بعد عطا اللہ خان سے ملنے مردان خانے کے ہال میں چلا آیا۔ وہ اپنی تپائی پر حقے سمیت موجود تھے۔ اسے آتا دیکھ کر نال چھوڑ دی۔

"روانگی کی تیاریاں مکمل ہیں؟"

انداز سوالیہ تھا۔

"جی سرکار سب مکمل ہے۔ حساب کتاب کے کھاتے بھی گاڑی میں رکھوا چکا ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا ساتھ ہی اطراف میں نگاہ دوڑائی۔

"ڈیرے سے ہوتے جانا۔ سفیر سے وہ نیلی فائل بھی لے لینا۔ حویلی سے سب کو ہی آج ساتھ کے گاؤں کے چودھری کے بیٹے کی شادی کی شادی پر جانا ہے۔ میری خواہش تھی کہ تو بھی ساتھ چلتا تاکہ چودھری کو علم ہوتا کہ میرے پاس کیسے، کیسے ہیرے ہیں۔"

وہ تمسخر سے بولے۔ مرتضیٰ نے سر ہلایا۔ ان کی بات پر غور بھی نہیں کیا۔ اس کے نزدیک منافقت اس سے بڑھ کر کیا تھی کہ شادی میں بھی محض اپنی ٹھاٹھ باٹھ دکھانے جایا جا رہا تھا۔

"جو حکم سرکار۔۔۔"

وہ سر اثبات میں ہلاتے بولا۔ زمان خان کمرے سے نکلے تو ایک بار پھر نگاہوں کا تصادم اس سے ہوا جس کی آنکھوں میں محض سرد پن تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ مڑا اور داخلی دروازے سے باہر نکلتا گیا۔ حویلی سے نکلتے اسے کشف کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ "داد ہے تم کو زمان خان اپنے گاؤں کی حدود کی لڑکی کی عزت تار، تار کر دی۔ اس کی زندگی جہنم بنا دی اور دوسروں کی بیٹی کو پناہ دیتے ہو؟ سب دکھاوا۔۔۔!"

اس نے تنفر سے سوچا۔ اس سب کے پیچھے زمان خان کا کوئی مقصد نہ ہو یہ بات تو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆☆☆

آج منڈیر پر کبوتر بھی نہیں آئے تھے۔ سارا دن وہ ان کا انتظار کرتی رہی مگر وہ آئے ہی نہیں۔ پھوپھی اسے گھر رہنے کی تلقین کرتیں چارہ توڑنے گئی تھیں۔ قمر نا جانے کہاں نکلا ہوا تھا۔ اداس سی شام تھی۔ لالہ بھی گھر نہیں

تھے۔نارنجی جوڑے میں بالوں کی چٹیا پشت پر ڈالے وہ برگد سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھی تھی۔اس کا سب کچھ سفیر کے سبب ختم ہو چکا تھا وہ باہر آنا جانا،وہ چارہ توڑنا وہ سمی کا اس کے گھر آنا اور اس کا سمی کے گھر جانا،پہروں بیٹھ کر کھیلنا سب ختم ہو چکا تھا۔اب تو ہر شام اداس معلوم ہوتی تھی اور آج تو کچھ زیادہ ہی معلوم ہو رہی تھی۔سونو پاس ہی ارد گرد پھر رہا تھا۔چارہ نہ ملنے پر وہ بھی بھوکا تھا۔آج اسکول سے پھوپھی نے اسے چھٹی کروالی تھی۔سمی نے جانا نہیں تھا سو اکیلی جانا بس خطرہ تھا۔پھوپھی کو ابھی تک چھوٹے خان سے متعلق کسی بات کی بھنک تک نہیں پڑی تھی۔اگر پڑ جاتی تو؟

وہ سوچ رہی تھی۔پاس ہی زمین پر پڑا دوپٹہ گلے میں ڈالے وہ اٹھی تو ایک دم ہی دروازہ زور،زور سے بجنے لگا۔اس کا دل یک بارگی سے دھڑکا۔

"اللہ خیر کرے۔"

سرخ و سفید پاؤں میں جوتا اڑستے وہ دوپٹہ سر پر جمائے مسلسل بجتے

دروازے کی جانب بڑھی۔

☆☆☆☆☆

ڈیرے کے سبھی ملازموں کی آج عید تھی کیوں کہ صبح ہی سفیر نے سب کو آج کے دن کی چھٹی عنایت کر دی تھی۔ان سب کے تو وارے نیارے ہو گئے تھے۔عام دنوں کی نسبت آج ڈیرے پر حد درجہ خاموشی تھی۔کونے میں کھڑے لڑکے نے تیسرے بار سر اٹھا کر دیکھا تھا،چھجے تلے تپائی پر بیٹھے سفیر کے سامنے کی کرسی پر بیٹھا بخش اسے کچھ بتانے میں اب تک مصروف تھا۔ان کی جانب آئیں تو بخش خوشامدی لہجے میں بول رہا تھا۔

"سرکار اس سے بہتر موقع کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔مرتضیٰ لاچار ہے،کچھ نہیں کر پائے گا۔آپ سے ٹکرائے گا،بولے گا اور پھر چپ کر جائے گا۔کوئی ثبوت ہی نہیں ہو گا،لڑکی ذات کی عزت کا خیال کیے وہ منہ بھی نہیں

کھول پائیں گے اور ہمارا۔۔۔"سیگریٹ کے کش لگاتے سفیر کے گھورنے پر جملہ بدلا۔"مطلب آپکا کام بھی ہو جائے گا نا۔"

سفیر مونچھوں کو تاؤ دیتے دل کشی سے مسکرایا۔

"لڑکا تیار ہے؟"

اس نے سوالیہ انداز اپنایا جب مسکراتے ہوئے بخش نے سر ہلایا پھر مڑ کر کونے میں کھڑے لڑکے کو پاس بلایا۔خاکی قمیض شلوار میں ملبوس وہ لڑکا ان کے قریب چلا آیا۔سفیر ٹیک لگائے مطمئن انداز میں بیٹھ گا جبکہ بخش اس لڑکے کو کچھ سمجھانے میں مصروف تھا۔طمع ایسی چیز ہے کہ اچھا،برا کہاں سوچنے دیتی ہے؟اپنا فائدہ نکلے تو کسے پرواہ؟

☆☆☆☆☆

دروازہ اب تک بج رہا تھا۔اس نے پاس رک کر سانس بحال کی۔

"کون ہے؟"اونچی آواز میں وہ جی اکڑا کر بولی۔

"یہ گل شیر کا گھر ہے؟"باہر سے کوئی انجان آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"ہے تو؟"اس کا لہجہ کانپا تھا۔یہ کون تھا؟

"باجی وہ گل شیر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے جی،لاری تلے آیا ہے۔وہاں لوگ جمع ہیں کہہ رہے ہیں اس کے بیٹے کو بلا لاؤ۔خون بہت بہہ رہا ہے جی۔"

مقابل کیا بول رہا تھا اسے سنائی نہیں پڑ رہا تھا۔اس کے کانوں میں سائیں،سائیں ہو رہی تھی۔اس نے بروقت دیوار کا سہارا لیے خود کو سنبھالا۔سر چکرا رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔اس کا ابا؟اس نے فکر مندی سے ارد گرد دیکھا۔خالی صحن اس کا منہ چڑھا رہا تھا۔اس کا دل بھر آیا۔برگد کے تنے پر بنے گھونسلے میں اب تک

چڑیا لوٹ کر نہیں آئی تھی مگر اس کے انتظار میں بیٹھی ننھی چڑیوں میں سے ایک گھونسلے کے سرے پر چلی آئی تھی۔شام مزید گہری ہو رہی تھی۔اس کا ابا؟وہ یونہی پھوپھی کے انتظار میں اپنا ابا نہیں کھو سکتی تھی۔نقاب کیے اس نے تیزی سے دروازہ کھولا۔سامنے خاکی لباس پہنے ایک لڑکا کھڑا تھا۔نظریں جھکا رکھی تھیں۔

"کدھر ہے میرا ابا؟"

وہ روندھی آواز میں بولی۔

"وہ اس سڑک کی نکر سے دائیں جانب پر۔۔۔۔"

اسے یوں ہی بولتا چھوڑے وہ اپنا دوپٹہ سنبھالے دوڑی۔سڑک سنسان پڑی تھی۔وہ مدد کو بلاتی بھی تو کسے؟برگد کے درخت پر چڑیا لوٹی تو ایک ننھی چڑیا کو غائب پایا۔فکر مندی سے ارد گرد جھانکا جہاں زمین پر مری پڑی ننھی چڑیا کی بے بس نگاہیں گھونسلے کی جانب تھیں۔کاش وہ گھونسلا یوں نہ چھوڑ جاتی۔کاش ماں کے لوٹنے کا کچھ صبر کر لیتی تو آج یوں مر نہ جاتی۔خاکی سوٹ والا لڑکا اب سڑک کی دوسری جانب جاتا نوٹوں کی گڈی کی خوشبو سونگھ رہا تھا۔

دائیں جانب مڑنے کی دیر تھی کہ کسی نے تیزی سے اسے کونے میں کھڑی گاڑی کے اندر کھینچا تھا۔وہ کٹی ڈور کی مانند ایک ہی جھٹکے میں گاڑی کے اندر کھینچی چلی آئی۔ایک جوتا وہیں سڑک پر گر گیا۔کلائی ایسی زور دار گرفت میں آئی کہ چوڑیاں ٹوٹنے پر کانچ کلائی میں چبھ گیا۔وہ کسی سخت شکنجے میں تھی خود کو چھڑوانے کے لئے کی جانے والی کوششوں سے وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔مگر مقابل کی گرفت سخت سے سخت تر ہو رہی تھی۔

"بخشے گاڑی چلا۔"

خود کو تھامے انسان کی عقب سے آتی آواز۔اس آواز کو تو وہ ہزاروں میں پہچان سکتی تھی۔"چھوٹے سرکار۔"

سرسراتی آواز اس کے ہونٹوں سے نکلی تھی۔

☆☆☆☆☆

وہ جلد از جلد سوات پہنچ جانا چاہتا تھا۔ آج دل گھبرا رہا تھا۔ اسے سوات ہر صورت پہنچنا تھا۔ تبھی چھٹی ملتے ہی گاڑی نکالے وہ سوات جانے کو تیار تھا۔ اسے بھٹکے مسافر کو راہِ راست پر لانا تھا۔ لاتعداد سوچیں اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ وہ سیدھا ڈیرے جانا چاہتا تھا۔ برابر والی سیٹ پر دھری فائل میں سفیر کا ہر کارنامہ تھا۔ اگر وہ مکرا تھا تو وہ فائل ہی کافی تھی۔

گاڑی کبھی ہموار راستوں پر تو کبھی ٹیڑھے میڑھے راستوں پر چل

رہی تھی۔ اس کی سنجیدہ نظریں سامنے مرکوز تھیں۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا مگر چہرے پر ہر کیفیت کو چھپا رکھا تھا۔

کس کے نصیب میں کیا تھا؟ وقت اور تقدیر مل کر مسکرائے تھے۔

☆☆☆☆☆

پورے راستے وہ خود کو چھڑوانے کی بے طرح کوشش کرتی رہی مگر ناکام رہی۔ سفیر کی گرفت ہلکی ہر گز نہ تھی ۔ گاڑی کے شیشے بند ہونے اور سیاہ ہونے کے سبب کسی کو نہ کچھ نظر آ رہا تھا نہ کچھ سنائی پڑ رہا تھا۔ بے بسی کے احساس سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تو سفیر نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اس سے ایسے دور ہوئی جیسے وہ کوئی اچھوت ہو اور وہ اچھوت ہی تھا اس کا ہر انداز عجیب تھا مگر اس وقت وہ اللہ اور اپنے لالہ کو یاد کر رہی تھی۔ نقاب اس نے کسی بھی حال میں کھلنے نہیں

دیا تھا۔

"سرکار مجھے جانے دیں ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔۔۔"

وہ جی اکڑا کر اسے دھمکی دے رہی تھی جبکہ دل کانپ رہا تھا۔ اس کی بات پر دل چسپی سے سیٹ سے ٹیک لگائے اس کی حرکتیں دیکھتا سفیر سر پیچھے کو پھینکے قہقہہ لگائے ہنسنے لگا۔ بخش بھی ہنسا تھا۔ اس نے تعجب سے انھیں دیکھا۔

"ورنہ کیا؟"

سفیر اس کے قریب کھسک کر سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں

جھانکنے لگا۔ اس نے تھوک نگلا۔

"میں اپنے لالہ کو بلالوں گی وہ آپکو نہیں چھوڑیں گے۔"

اس نے ڈرتے، ڈرتے کہہ دیا۔ سفیر چند لمحے اسے ہونٹ بھینچے دیکھتا

رہا۔ پھر ایک دم ہی ہنس دیا سر جھٹکے اس نے بمشکل ہنسی پر قابو پایا۔ گاڑی ڈیرے کے قریب پہنچ گئی تھی۔ گیٹ پر کھڑا واحد پہرے دار مستعدی سے آگے بڑھا اور گیٹ کھولا۔ گاڑی کو ڈیرے کے اندر جاتا دیکھ کر اس کی ہرنی جیسی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے۔ سفیر اب مطمئن بیٹھا تھا۔ گاڑی کے رکنے کی دیر تھی بخش تیزی سے گاڑی بند کیے باہر نکلا اور دوسری طرف سے آکر دروازہ کھولا۔ سفیر نے اشارے سے اسے دور رہنے کا کہا تو وہ منہ بسورے ایک جانب ہو گیا۔ ایک بار پھر روتی، فریاد کرتی اور تڑپتی زینی کا بازو سفیر کی گرفت میں آچکا تھا۔ وہ اسے کھینچنے کے انداز میں گاڑی سے باہر نکال رہا تھا جیسے وہ کوئی سامان ہو۔ بخش دل چسپی سے اس شیرنی کو دیکھ رہا تھا جو کسی بھی صورت اپنا نقاب اترنے نہیں دے رہی تھی۔ بخش کو دلچسپی ہوئی کہ آخر اس نقاب کے پیچھے کا چہرہ کیسا ہے؟ سفیر کی اجازت کے بغیر آگے بڑھ کر اس نے زینی کا دوپٹہ اتارنا چاہا۔ سفیر کے ساتھ روش پر گھسٹتی زینی کو عجیب کراہیت محسوس ہوئی۔ اس نے دوپٹہ مزید مضبوطی سے تھام لیا۔ بخش کی پیش قدمی دیکھے سفیر کا غصہ عود آیا۔ اس نے مڑ کر پیچھے کھڑے بخش کے چہرے پر طمانچہ رسید کیا جسے اپنی غلطی کا احساس دیر سے صحیح ہو ضرور گیا تھا مگر پانی سر سے نکل چکا تھا۔ وہ خاموشی سے سر جھکا گیا۔ مٹھیاں بھینچے اس نے غصے پر قابو پانا چاہا۔

"میں نے تجھے بولا تھا ایسا کرنے کو؟"

وہ دھاڑا تھا۔ بخش نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر ابھی سے رال ٹپکانے کی کیا ضرورت تھی؟ میرے بعد تمہارے

حصے میں ہی آنی ہے صبر نہیں کر سکتا تھا؟"

اب کی بار وہ مزید سخت لہجے میں بول رہا تھا۔ زینی سہم کر انھیں دیکھ رہی تھی۔ کون سا حصہ؟ کیسا حصہ؟ وہ کیا کوئی چیز ہے جس کا حصہ کیا جانا ہے؟

"معافی سرکار۔۔۔ میں باہر انتظار کر لیتا ہوں، آپ جائیں۔"

وہ مڑا جب اسے سفیر کی آواز سنائی دی۔

"باہر نہیں۔۔۔ فلحال حویلی جا کر جائزہ لے آ۔ وہاں ماحول کیسا ہے؟ سب لوٹے تو نہیں۔ تب تک میں ذرا اس بلبل کو قابو کر لوں۔"

بات کے آخر میں جھٹکے سے زینی کو سامنے کی جانب کھینچا۔ وہ گرتے، گرتے سنبھلی۔

"جو حکم سرکار۔"

وہ سر ہلاتا زینی پر ایک نظر ڈالے مڑ گیا۔ گیٹ بند ہوا تو زینی نے ہراساں نظروں سے سفیر کی جانب دیکھا۔ اس کی نظریں خود پر جمی دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی سفیر نے اب کی بار اسے اپنی جانب کھینچا اور اگلے ہی لمحے اسے سوچنے سمجھنے کا موقع دیے بغیر کندھوں پر لاد لیا۔ وہ بہت دھان پان سی تھی تبھی اسے اٹھانے میں سفیر کو کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہوا۔ وہ چیخ رہی تھی، چلا رہی تھی اس کی پشت پر مکے برسا رہی تھی مگر وہ گونگا بہرا بنا ہوا تھا۔ کیوں گناہ کرتے وقت لوگ یہ نہیں سوچتے کہ ان کے اپنے گھر میں بھی ان کی بیٹیاں ہیں؟ ان کی بھی عزتیں ہیں؟ کیوں شیطان ان پر اتنا غالب آ جاتا ہے کہ وہ فرمانِ خدا بھول جاتے ہیں۔ وہ تو شیطان

سے بھی بڑھ کر شیطان بن جاتے ہیں۔ کسی مظلوم کی آہ و پکار انھیں کہاں سنائی دیتی ہے۔ ان کے دلوں پر اور روحوں پر ہوس کی ایسی چادر چڑھ جاتی ہے کہ اس کے پسِ پردہ انھیں کچھ دکھائی دیتا ہو نہ سنائی۔ ان کی اپنی روح تو داغ دار ہوتی ہی ہے وہ دوسروں کی روح بھی داغ دار کر ڈالتے ہیں۔

کمرے میں لا کر اسے بستر پر پٹخا اور اسے بھرپور نظروں سے دیکھا کیوں کہ اب اس کا نقاب اتر چکا تھا دوپٹہ اب سفیر کے ہاتھ میں تھا وہ اس دوپٹے کو اپنے ہاتھ پر لپیٹے شوخ سیٹی بجاتا مڑا اور دروازہ بند کر دیا۔ اسے اپنی جانب عجیب انداز میں بڑھتا دیکھ زینی ہاتھوں سے چہرہ چھپانے کی سعی کرتی پیچھے کی جانب کھسکنے لگی۔

☆☆☆☆☆

کام نپٹاتے ہی پہلی فرصت میں اس نے گاڑی گاؤں کی جانب موڑ لی۔ اس کا ارادہ گھر جانے کا تھا مگر اسے حویلی کے سامنے سے گزرتے ہوئے یونہی اچانک اسے صبح میں کی گئی عطا اللہ خان کی بات یاد آئی۔ صبح تو اس نے اتنا غور نہیں کیا تھا مگر اب فراغت میں اس نے اس بات پر غور کیا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

"حویلی والوں کو شادی پر جانا ہے۔ سفیر سے فائل لے جانا۔۔۔"

تبھی اسے دو روز پہلے سنی سفیر کی بات یاد آئی۔

"فکر مت کرو بہت جلد ہمیں وہ وقت بھی نصیب ہونے والا ہے، پرسوں ہی حویلی والوں کو شادی پر جانا ہے اور مرتضیٰ کو۔۔۔"

مگر پیچھے کھڑے آدمی کے اس کا نام پکارنے پر سفیر نے بات ہی بدل دی۔

"کیسا موقع؟"

اس نے حیرت سے سوچا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ کہیں زینی؟ اس نے گاڑی تیز رفتاری سے گھر کے راستے ڈال دی۔ دروازے کے پاس اسے کچھ عورتیں کھڑی نظر آئیں۔ بڑی گاڑی آتی دیکھ وہ ایک جانب ہوئیں۔ مرتضیٰ نے

گاڑی روکی اور تیزی سے باہر آیا۔دل دھک، دھک کر رہا تھا کہیں اس نے پہنچنے میں دیر تو نہیں کر دی؟اس کی بہن؟اس کی زینی؟

وہ ناہموار سانسوں سمیت دروازے تک پہنچا جہاں چوکھٹ پر پریشان صورت لئے رومانہ بیٹھی تھیں۔اسے آتا دیکھ سر اٹھایا تو آنکھوں میں آنسو تھے۔

"پھوپھی کیا ہوا ہے بتا مجھے؟"

وہ کس ہمت سے پوچھ رہا تھا وہ جانتا تھا یا اس کا خدا۔

"زینی کا کچھ پتا نہیں ہے۔نہ وہ سمی کی طرف گئی ہے نہ محلے میں کہیں میں گھر آئی تو دروازہ کھلا پڑا تھا اور زینی کہیں نہیں تھی۔"

انہوں نے ہچکیوں میں بات مکمل کی۔مرتضیٰ کا دل دھک سے رہ گیا۔

"یہ چھوٹے خان کا کام ہے۔۔۔میں اس کی جان لے لوں گا۔"

اس کی بات پر رومانہ تو چونکیں ہی چونکیں محلے کی عورتوں نے بھی چہ مگوئیاں شروع کر دیں۔کون کیا کہہ رہا تھا اسے پروا نہیں تھی۔وہ تیزی سے مڑا اور گاڑی میں جا بیٹھا۔آنکھوں کے سامنے زینی کی معصوم صورت لہرا رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

"مجھ سے کب تک بھاگ سکتی تھی تو چھوکری؟"

وہ دوپٹہ ایک جانب پھینکے مزے سے بولتا بستر پر اس کے سامنے آ بیٹھا۔اب کی بار زینی تیزی سے دوسری جانب سے نیچے اتری۔وہ دوڑ کر دروازے تک جانا چاہتی تھی مگر سفیر نے اسے راستے میں ہی جا لیا۔کلائی تھامے اسے جھٹکے سے اپنی جانب کھینچا تو وہ کٹی شاخ کی مانند اس کی گرفت میں آ گئی۔سفیر دلچسپی سے اس کی بے بسی کا تماشا دیکھ

رہا تھا۔ چوڑیوں کی چھن، چھن جاری تھی اور وہ فیروزے کی لونگ پوری شان و شوکت سے ناک پر براجمان تھی۔ سفیر بے بس ہونے لگا تھا۔ اس کا حسن اتنا کامل حسن تھا کہ آج تک سفیر نے ایسا حسن اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ اس نے دوسرا ہاتھ بڑھا کر اس کی لٹیں پیچھے کرنا چاہیں جو بال کھلنے کے سبب چہرے کے اطراف میں جمع ہو گئی تھیں۔ سفیر نے گہرا سانس بھرا اور سرگوشی کی۔

"واللہ قیامت۔۔" ہاتھ گال کی جانب بڑھانے چاہے مگر اسے سے قبل ہی زینی نے جھک کر ایک دم ہی اس کے بازو میں دانت گاڑ دیئے۔ اتنی شدت سے کہ سفیر نے فوراً سے اپنا بازو کھینچا تھا اگلے ہی لمحے سب بھلائے اس کے دائیں گال پر زوردار تھپڑ دے مارا۔

"تو پیار کی زبان نہیں سمجھتی۔۔۔ جھلی میں تو تیرا عاشق ہوں۔ عاشقوں کو یوں تڑپاتے نہیں۔"

وہ بیڈ کی پچھلی دیوار کے پاس جا گری۔ سفیر کی انگوٹھی سے اس کا ہونٹ پھٹ چکا تھا جبکہ گال پر نشان پڑ چکا تھا۔ اسے اپنے منہ میں خون کا ذائقہ گھلتا محسوس ہوا۔ سفیر کو ایک بار پھر اپنی جانب آتا دیکھ کر وہ بمشکل دیوار کا سہارا لئے اٹھی۔ نظر سائیڈ ٹیبل پر پڑے گلدان پر گئی اس نے تیزی سے گلدان اٹھالیا۔ سفیر اس کی ننھی سی پیش قدمی پر ہنسا پھر اس کی جانب قدم بڑھانے لگا۔ اس کے بڑھتے قدم محسوس کیے زینی نے دل ہی دل میں خود کو ہمت دی۔ جو وہ کرنے جا رہا تھا یہ گناہ تھا۔ اس کی پھوپھو نے اسے سکھایا تھا کہ کوئی ایسا کرنا چاہے تو اس کی جان لینے سے بھی گریز نہ کرنا۔ یہ وہ بات ہے جو آج سب ماؤں کو اپنی بیٹیوں کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔

"مجھے مارو گی؟"

سفیر نے اس کی جانب پیش قدمی ابھی بھی نہیں روکی تھی۔

"سرکار وہیں رک جاؤ ورنہ میں تمہاری جان لے لوں گی۔ قسم خدا کی۔۔۔"

اس نے سخت لہجہ اپنایا۔وہ آپ سے تم پر آچکی تھی۔سفیر نے اس کی ہمت کو سراہا۔اس میں یہ ہمت رب کی طرف سے ہی آئی تھی کہ وہ اسے اتنی بڑی دھمکی دے رہی تھی۔ہونٹ سے خون بہہ رہا تھا۔بال بکھر چکے تھے۔کلائی پر بھی خون جم چکا تھا۔ایک پاؤں بھی زخمی تھا مگر اس کی ہمت نہیں ٹوٹی تھی۔

"ہاہاہاہا۔۔۔۔"

اس کی بات پر سفیر محظوظ انداز میں ہنسا۔پھر تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔دفعتاً رکا۔باہر قدموں کی چاپ سنائی دی تھی مگر زینی نہیں رکی۔اس سے قبل وہ زینی کا ہاتھ تھام سکتا زینی نے پوری قوت سے ضرب لگائی تھی۔گلدان دو ٹکڑوں میں بٹ گیا ایک ٹکڑا زمین پر گر چکا تھا۔ایک ٹکڑا ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا جسے اس نے تیزی سے بستر پر پھینکا تھا۔وہ ضرب کسی کو برباد اور کسی کو بیدار کرنے والی تھی۔وہ ضرب بہت بھاری تھی۔وہ ضربِ کربناک تھی۔۔۔!

☆☆☆☆☆

منجھدار میں ڈبویا

سوال بنی ہے زندگی

جواب ہے لاپتہ

راستے کی خبر نہیں

منزل ہے لاپتہ

غموں نے جب سے گھیرا

دل ہوا ہے لاپتہ

خاک ہوئی زندگی

صبر ہوا ہے لاپتہ

کوئی گیا ہے چھوڑ

بیچ راستے میں

منجھدار میں ڈبویا

مسافر ہے لاپتہ

☆☆☆☆☆

اسے امید تھی کہ وہ ڈیرے جلد پہنچ جائے گا مگر اتفاقاً حویلی کے راستے سے گاڑی لے جاتے ہوئے اس کی نظر حویلی کے داخلی دروازے میں کھڑے بخش پر پڑی۔ وہ چونکا۔ بخش کا حویلی میں کیا کام؟ وہ تو سفیر کے ساتھ رہتا تھا۔ جہاں سفیر، وہیں بخش۔

کہیں سفیر حویلی ہی تو نہیں؟ ذہن میں اس بات کے آنے کی دیر تھی اس نے فوراً سے گاڑی کا رخ حویلی کی جانب موڑ لیا۔ اب یہی بہتر تھا کہ بخش سے ساری معلومات لی جاتی۔

بخش جو حویلی آ تو گیا تھا مگر رتی برابر دل نہ لگنے پر واپس ڈیرے کو نکلنے لگا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ گاڑی میں سوار ہوتا اسے کوئی گاڑی تیزی سے حویلی کی جانب آتی نظر آئی۔ وہ چونکا، اگلے ہی لمحے ماتھا ٹھنکا۔ یہ تو بہرام کی گاڑی تھی۔ اس کا مطلب اس بار پھر وہ بغیر اطلاع دیئے پہنچ چکا تھا۔ اگر وہ گھر کسی کو نہ پا کر ڈیرے چل دیا تو؟ اس سوچ نے اس کی پیشانی عرق آلود کر دی۔ اس نے تھوک نگلا۔ وہاں بہرام اپنی گاڑی سے نکلا تھا۔ نیلے آسمانی رنگ کے کرتا شلوار میں کف کہنیوں تک موڑ رکھے تھے اور ماتھے پر بل واضح تھے۔

☆☆☆☆☆

وہ ضرب کربناک تھی۔ جس تیزی سے زینی نے اس پر حملہ کیا اسی تیزی سے وہ آدھ ٹوٹا گلدان بستر پر پھینکا تھا۔ سفیر بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دونوں ہاتھ سر کے سامنے والے حصے پر تھے۔ خون کسی فوارے کی مانند نکل رہا تھا۔ اس پر غنودگی چھانے لگی۔ کیا یہی زندگی تھی؟ بس ایک وار پر ختم ہو جانی تھی؟ اگلے ہی لمحے وہ پورے قد سے زمین بوس ہوا تھا۔ دھڑام کی آواز کے ساتھ ہی پورے کمرے میں خاموشی چھائی۔ زینی اب وحشت زدہ انداز میں سفیر کی جانب دیکھا جس کے خون سے زمین رنگتی جا رہی تھی مگر وہ اس کی جانب اس امید سے ہاتھ بڑھائے ہوئے تھا کہ اب وہ اس ہاتھ کو تھام کر اس کی مدد کر دے گی شاید وہ اسے بچا ہی لے۔ تبھی دروازہ زور، زور سے بجنے لگا۔ پھر خاموشی چھائی۔ کسی کے قدموں کی چاپ دور جاتی سنائی دی اور ایک بار پھر دروازے کی جانب آتی سنائی

دی۔ کون تھا باہر؟ کہیں بخش؟ اس نے اپنی سسکی کا گلہ گھونٹنا چاہا۔ منہ پر زور سے ہاتھ جمائے وہ خوفزدہ سے انداز میں زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ بال بکھر چکے تھے۔ دونوں ہاتھ منہ پر جمائے وہ اب اپنی موت کی منتظر تھی۔ حویلی والے اس کی جان لے لیں گے آخر کو اس نے۔۔۔

اس کی نظر ایک بار پھر زمین پر بے حس پڑے سفیر پر گئی جس کا چہرہ پیلا پڑ رہا تھا۔ جیسے تمام تر خون نچوڑا جا چکا ہو۔ آخر کو اس نے حویلی کے جانشین کی جان لے لی تھی۔ یہ اس نے کیا کر دیا تھا؟ یہ اس سے کیا ہو گیا؟ اب کیا ہو گا؟ کوئی لاک میں چابی گھما رہا تھا اور یہاں زینی نے اپنا چکراتا سر بمشکل سنبھالا تھا۔ اگلے ہی پل دروازے کے ہینڈل پر دباؤ ڈالا گیا اور چڑ کی آواز سے دروازہ کھلتا چلا گیا۔ کوئی اندر داخل ہوا تھا اور تیزی سے داخل ہوا تھا۔ نووارد کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اس نے ایک نظر کمرے میں دوڑائی پہلی نظر خطرناک حد تک پیلی پڑتی زینی پر گئی اور اس کی نظروں کے تعاقب میں نظریں زمین پر بے حس خون میں لت پت سفیر پر گئیں۔ بے ساختہ اس نے منہ پر تیزی سے ہاتھ جمایا تھا۔ یہ اس کے لئے دھچکا ہی تھا۔ پورے کمرے میں نظریں دوڑائے وہ صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔ ایک پل کو سن ہوا دماغ اب تیزی سے کام کرنے لگا جبکہ زینی ابھی تک خاموشی بیٹھی دم سادھے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

وہ ارد گرد دیکھے بغیر سیدھا اسی کی جانب چلا آ رہا تھا۔ ماتھے کے بل بڑھتے جا رہے تھے۔ بخش نے گھبراہٹ سے دو قدم پیچھے کی جانب اٹھائے۔ پھر تھوک نگلا۔ بہرام اب اس کے سامنے کھڑا تھا۔ تن دہی سے اسے گھورتا وہ بخش کی جان نکال رہا تھا۔ ایک تو پولیس والا اوپر سے دیکھنے کا انداز بھی تفتیشی۔ بخش کو لگا آج نہ وہ بچے گا، نہ سفیر۔

"سفیر کہاں ہے؟"

ادھر، ادھر کی کوئی بھی بات کیے بغیر وہ سیدھا موضوع پر آیا۔ بخش نے گہرا سانس بھرا۔ پھر اعتماد سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"سرکار۔۔۔ خیریت؟"

اس نے سوالیہ انداز اپنایا تو بہرام نے بمشکل غصے پر قابو پایا۔

"جتنا پوچھا جائے اتنا جواب دیا کرو۔"

وہ اتنی سختی سے بولا کہ بخش نے فوراً سے منہ کھولا۔

"وہ سفیر سرکار تو سب کے ساتھ شادی پر گئے ہیں۔"

وہ بھرپور اعتماد سے جھوٹ بول رہا تھا حالانکہ ایسا کرتے ہوئے اس کا دل اندر ہی اندر کانپ رہا تھا۔ بہرام نے جانچتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"تمہیں یقین ہے؟"

اس نے ابرو اچکائی۔

"جی سرکار۔۔۔ انھیں یہاں سے ڈیرے اور وہاں سے سیدھا شادی کے لئے نکلنا تھا۔"

اس نے ایسا بہانہ ڈھونڈھا کہ اگر وہ سفیر کو ڈیرے پہ پا بھی لے تب بھی کوئی مسئلہ نہ ہو۔

"ٹھیک ہے جاؤ یہاں سے۔"

وہ سخت لہجے میں بولا۔ پھر مڑا اور گارڈ کو اشارہ کیا۔ بخش چند لمحے وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ ہاتھ ہلا کر کچھ سمجھاتا شاید گاڑی اندر پارک کرنے کا حکم دے رہا تھا۔ پھر مڑا تو ایک نظر بخش پر ڈالی جو چونکا پھر کھسیا کر گاڑی کی جانب مڑ گیا۔ وہ سر جھٹکتا حویلی کی جانب بڑھ گیا۔ اب سفیر کو شام گئے ہی سب کے ساتھ لوٹنا تھا اب وہ کل ہی اس سے

بات کرلے گا۔وہ لاتعداد سوچوں میں گم سیڑھیاں چڑھتا جارہا تھا اور تقدیر مسکرا رہی تھی۔نا جانے کس کو، کب کہاں مہلت ملنا تھی؟

☆☆☆☆☆

زینی اب تک زمین پر خاموش بیٹھی تھی۔مرتضیٰ کا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا۔اس نے آگے بڑھ کر فوراسے زینی کا دوپٹہ اٹھایا پھر تیزی سے اس کی جانب چلا آیا۔اس کے برابر گھٹنوں کے بل جھکا اور اسے دوپٹہ اوڑھایا۔وہ رونے کو بے تاب تھی مگر مرتضیٰ نے اپنی انگلی ہونٹوں پر رکھی۔

"شش۔۔۔۔"!

یہ اشارہ تھا کہ آنسو نہیں بہایا جائے گا۔زینی نے بمشکل اپنے آنسوؤں پر بند ھ بٹھایا۔

"لالہ۔۔۔"

وہ اپنے ہاتھ اس کے سامنے کرتی بے بسی سے بولی تو مرتضیٰ نے ترحم سے اسے دیکھا۔اس کے لئے یہی بہت تھا کہ وہ محفوظ تھی۔پھر نظر اس کے ہاتھ پر ڈالی جو کانپ رہے تھے۔کلائی بھی زخمی تھی۔

"بھاگ جاؤ زینی۔۔۔"

اس کی آواز سرگوشی سے کم نہ تھی۔زینی نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اس کی سنجیدہ آنکھوں میں جھانکا۔

"لالہ حویلی والے مار دیں گے آپکو۔۔۔وہ مجھے بھی۔۔۔"

اس نے جملہ مکمل کرنا چاہا مگر مرتضیٰ نے اسے ٹوک دیا۔

"نہیں کرتے حویلی والے کچھ۔۔۔تم بس یہاں سے نکل جاؤ۔۔۔میں سنبھال لوں گا سب۔بھروسہ کرو۔۔۔"

وہ نا جانے سب سنبھال پائے گا یا نہیں؟وہ اس بات سے ناواقف تھا مگر اسے ٹوٹتی زینی کو حوصلہ دینا تھا۔اس کی ہمت بڑھانی تھی۔

"لالہ میں آپکو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

وہ نفی میں سر ہلاتے بولی۔ آنسو گال پر آ نکلے۔ نظریں پھر سے بے حس و حرکت پڑے وجود پر گئیں۔

"میں نے کہانا بھاگ جاؤ تو بس بھاگ جاؤ، تمہیں۔۔۔" رکا پھر گہرا سانس بھرا۔ "تمہیں میری قسم"

زینی نے اس کے جملے کے مکمل ہونے پر بے بسی سے سر ہلایا۔ پھر دیوار کا سہارا لئے بمشکل اٹھی۔ گرتی پڑتی وہ آگے جاتے مرتضیٰ کے پیچھے چلتی جا رہی تھی۔ مرتضیٰ نے کھڑکی کے پاس رک کر تیزی سے پردے سرکائے پھر مڑ کر اس کے آنسو پونچھے۔

"لالہ میں نے مار دیا چھوٹے سرکار کو۔"

اس کی آواز لڑکھڑائی۔ خوف اور غم سے۔ یہی سوچ غالب آ رہی تھی کہ اب لالہ کی کیا حالت ہو گی۔ وہ کیسے سب سنبھالیں گے؟ مرتضیٰ نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا۔

"کوئی قتل نہیں کیا تم نے۔۔۔ سنا تم نے؟ کوئی قتل نہیں۔۔۔ اب اپنا دوپٹہ سیدھا کر کے اوڑھ لو۔ محلے کی عورتیں گھر کے پاس جمع ہیں۔ آرام سے چلتی جانا اور سکون سے پھوپھی کو لے کے اندر چلی جانا۔ کسی کی بات کا جواب نہ دینا۔ میں رات کو لوٹ آؤں گا اور سب سنبھال لوں گا۔۔۔ بس اپنا منہ مت کھولنا۔"

اس کا اپنا دماغ چکرا رہا تھا مگر زینی کو حوصلہ دینا اس وقت بہت اہم تھا۔ زینی نے سر ہلایا اور نقاب اوڑھا کھڑکی کی جانب بڑھی اور پھر ایک دم دوبارہ مڑ کر منتظر کھڑے مرتضیٰ کے گلے لگ گئی۔ مرتضیٰ نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

"اب جاؤ۔"

وہ سر ہلاتی مڑی اور اگلے ہی لمحے مرتضیٰ کی کھولی گئی کھڑکی کے دونوں اطراف میں ہاتھ جما کر باہر پھلانگی۔ ایک نظر مڑ کر دیکھا تو آنکھوں میں اس کے لئے فکر مندی واضح تھی۔ مرتضیٰ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے پرسکون رہنے کا اشارہ کیا۔ مرتضیٰ کے تسلی دینے پر وہ کچھ پرسکون ہوئی اور ارد گرد دیکھتی تیزی سے فصلوں کے

پیچ و پیچ دوڑنے لگی۔ گاؤں کی لڑکی تھی۔ ایسے راستے اسے ڈراتے نہیں تھے اور آج جو وہ کر آئی تھی اس نے اس پر یہ حقیقت واضع کر دی تھی کہ وہ ڈرپوک نہیں تھی۔ اس نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا وہ اپنی عزت بچانے میں کامیاب ہو گئی تھی اور ایسے میں اگر اس نے کسی کی جان لے بھی لی تھی تو اسے اس جان کے جانے کا نہیں، آنے والے وقت کا غم ستا رہا تھا۔ وہ فصلوں سے نکل کر پگڈنڈی پر اتری تو اب راستہ شناسا تھا۔ یہ راستہ گاؤں کو جاتا تھا۔ اب وہ بغیر مڑے بس دوڑتی جا رہی تھی۔ پاؤں میں کیا، کیا چبھ رہا تھا اسے پرواہ نہیں تھی۔

☆☆☆☆☆

وہ لائبریری میں بیٹھا کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول تھا جب اسے کسی کے اپنے ساتھ بیٹھنے کا گمان ہوا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو جلے بھنے صائم کو پاس بیٹھے پایا۔

"بس بہت ہو گیا۔۔۔"!

وہ ایک دم ہی ضبط کھو کر بہت ٹوٹے دل سے بولا تھا۔ زعیم نے اسے آنکھیں دکھائیں تو اسے احساس ہوا کہ وہ اس وقت لائبریری میں ہیں۔ لائبریری انچارج کی نظریں بھی ان کی طرف سنجیدگی سے اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ کھسیانی ہنسی ہنسے۔ اس نے بس آنکھیں دکھائیں جس کا مطلب سمجھتے وہ دونوں خاموشی سے اٹھے اور بیگ سنبھالتے باہر چلے گئے۔

"اب بول کیا مصیبت آپڑی تھی؟"

وہ تیز لہجے میں بولا۔ صائم نے ایک نظر اس کی جانب بے بسی سے دیکھا پھر پاؤں زمین پر پٹختا پاس کچھ فاصلے پر نصب بینچ پر جا بیٹھا بیگ ایک جانب پٹخا۔ زعیم نے آنکھیں گھمائیں یعنی حالات خراب تھے۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ پیزا کے لالچ میں تانیہ کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ مگر آج نہ صرف ہمت جواب دے گئی تھی بلکہ ضبط کا پیمانہ بھی چھوٹ گیا تھا۔ کوئی اتنا پاگل کیسے ہو سکتا تھا؟

"اب کیا ہوا؟"

زعیم بے بسی سے بولا۔ساتھ ہی ساتھ مروا کو کوسا جس کے سبب وہ اس نئی مصیبت سے دوچار ہو گئے تھے۔

"کہہ رہی تھی کہ مجھے آج اپنی فیملی سے ملوانے لے کر جائے گی میں نے انکار کر دیا تو میری آنکھوں کے سامنے اس نے اپنے بازو پر کٹ مار لیا۔۔۔"صائم غصے اور غم کی ملی جلی کیفیت سے بولا۔زعیم نے سر جھٹکا۔

"عجیب بیوقوف لڑکی ہے وہ تانیہ اور ویسی ہی صفا جس نے اسے ہمارے پیچھے لگایا ہے۔میں نے آج تک اتنی بے وقوف لڑکی نہیں دیکھی تھی مگر صفا نے تو میری سوچ بدل دی۔وہ اس سے بڑھ کر بے وقوف نکلی۔۔۔"بات کے دوران اس نے صائم کا سیدھے ہو کر بیٹھنا اور اسے آنکھیں دکھانا بھی محسوس کیا۔مگر اسے تو جیسے آج صفا کے خلاف بھڑاس نکالنے کا شاندار موقع مل گیا تھا۔

"خونی چڑیل ہے صفا۔۔۔ڈائین۔۔۔"وہ اس سے قبل مزید گوہر افشانی کرتا،صائم نے اس کے پاؤں پر پاؤں دے مارا۔

"بس کر جا بھائی۔۔۔پلیز آج بس کر جا۔"

وہ منمنایا۔اس کی منت آمیز شکل دیکھے زعیم کا ماتھا ٹھنکا۔

"تو اتنی سائیڈ کیوں لیتا ہے دونوں بہنوں کی؟میں نے دیکھا ہے تو مروا کو دیکھ کر فلیٹ ہو۔۔۔"

صائم نے اب کی بار آنکھیں دکھانے کی حد کر دی۔

"بس کر جاؤ زعیم۔۔۔صفا،مروا پیچھے کھڑی ہیں۔ہی ہی ہی"

آخر میں اسے آنکھیں دکھاتا وہ کھسیانی ہنسی ہنسا۔ہلکا سا رخ موڑے اس نے پیچھے دیکھا جہاں بازو سینے پر لپیٹے صفا اور ساتھ ہی مروا کھڑی تھی۔

"مارا گیا میں۔۔۔"

وہ بڑبڑایا پھر بغیر کچھ کہے یا پیچھے مڑے اٹھا اور دوسری جانب چل دیا صائم نے بھی ایک نظر دونوں بہنوں کو دیکھا پھر زعیم کی پیروی کی۔ پوری یونیورسٹی کو دگنی کا ناچ نچا دینے والے ان دونوں کے سامنے بھیگے بلے بن جاتے تھے۔

☆☆☆☆☆

اس کے جانے کی دیر تھی مرتضیٰ کے چہرے کا اطمینان جاتا رہا۔

"سرکار کا قتل ہو گیا۔ سرکار کو۔۔۔"

وہ بڑبڑایا۔ سفیر کے قریب پہنچ کر اس کے پاس بیٹھا پھر کانپتے ہاتھ بڑھا کر اس کی نبض ٹٹولنی چاہی مگر کچھ محسوس نہیں ہوا۔ اس نے بے بسی سے اس کا ہاتھ چھوڑا۔

"اور کتنی آزمائشیں؟"

وہ بے بس ہو گیا۔ بالوں میں ہاتھ چلاتے وہ بے چینی سے ادھر، ادھر گھومنے لگا۔ اس کا ہر انداز اس کے اضطراب کی گواہی تھا۔ اس کی نظر بستر پر پڑے آدھ ٹوٹے گلدان پر گئی جس کے سرے پر خون جما ہوا تھا۔ اس نے ایک نظر زمین پر پڑے بے حس وجود پر ڈالی۔ اگلے ہی لمحے تیزی سے آگے بڑھ کر وہ گلدان اٹھایا۔ پھر تیزی سے مڑا اور گرے سفیر کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ارادہ نیچے بکھرے ٹکڑے سمیٹنے کا تھا۔ مگر اس سے پہلے وہ کچھ کر پاتا کوئی تیزی سے دروازہ کھولتا اندر آیا تھا۔

"سرکار معذر۔۔۔"

شاید بخش یوں اندر آ جانے پر معذرت کر رہا تھا مگر اندر کے منظر کو دیکھ کر اس کی زبان تالو سے جا چپکی۔ اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ مرتضیٰ بوکھلا کر اٹھا۔ کرتے کے دامن پر گلدان لگنے سے خون لگ گیا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ جو تم دیکھ رہے ہو یہ ایسے نہیں ہے جیسے تم سمجھ رہے ہو۔"

مرتضیٰ نے گلدان تیزی سے دوسری جانب پھینکتے ہوئے وضاحت دینا چاہی مگر بخش نے تیزی سے چلا کر کسی کو بلایا۔

"رشیدے۔۔۔جلدی آجا۔۔۔"

وہ چلایا۔اس سے پہلے مرتضیٰ کچھ کہہ پاتا رشید تیزی سے اندر آیا تھا۔دروازے میں ہی بخش کے ساتھ رک کر اس نے اندر کا منظر دیکھا۔بے ساختہ ہاتھ منہ پر جمایا اور حیرت سے خاموش کھڑے مرتضیٰ کو دیکھا جس کے تمام الفاظ کھو گئے تھے۔وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھے۔بخش نے سفیر کے پاس بیٹھ کر اس کی نبض ٹٹولی۔چند لمحے بعد بے یقین نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا۔گلدان کے ٹکڑے جابجا بکھرے ہوئے تھے۔زینی کا بھی نام و نشان نہیں تھا۔وہ تو بعد کی بات تھی۔جب سرکار نہیں رہے تو چھوکری سے کیسا واسطہ؟

"سرکار کو۔۔۔مار دیا تو نے؟"

وہ طیش سے چلایا۔رشیدے کو بھی موت کا یقین ہو گیا تھا۔مرتضیٰ گھبرا گیا اور اگلے ہی لمحے مڑ کر کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔حالات بہت مختلف تھے اس کی سوچ سے بھی زیادہ،ایسے میں یہیں رہنا ٹھیک نہیں تھا۔اسے یہاں سے ایک بار نکلنا تھا۔وہ بخش کی آوازیں سن سکتا تھا جو رشید کو اس کے پیچھے آدمی دوڑانے اور حویلی اطلاع کرنے کے حکم صادر کر رہا تھا۔وہ بغیر مڑے بس بھاگتا جا رہا تھا۔اب اس کی منزل گھر نہیں اس کے دوست کا گھر تھی۔ آج کی رات پورے گاؤں میں یہ بات پھیل جانا تھی کہ سرکار کا قتل ہو گیا ہے اور کل جرگہ بیٹھنا تھا۔اس کا دماغ آنے والے وقت کے لئے اسے تیار کر رہا تھا۔رات بہت گہری و سیاہ تھی اور خاموشی ایسی کہ وحشت آگھیرے۔

☆☆☆☆☆

وہ ابھی لباس تبدیل کیے فارغ ہوا تھا کمرے سے نکلا اور موبائل پر انگلیاں پھیرتا،سیڑھیاں اترتا لاؤنج میں پہنچا۔نظریں گھڑی پر گئیں۔چھ بج رہے تھے۔اب تک سب آنے ہی والے تھے۔اس نے ارد گرد چکر کاٹتے

ہوئے سوچا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا جہاں شام پل، پل تاریک ہو رہی تھی۔ اس کا دل بھرنے لگا۔ عجیب سی بے چینی رگ وپے پر اترنے لگی۔ اس نے چکر کاٹنا چھوڑا اور صوفے پر جا بیٹھا۔ ابھی بمشکل پانچ منٹ گزرے تھے کہ گیٹ کھلنے کی آواز آئی اور یکے بعد دیگرے گاڑیاں رکنے کی آواز۔ وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور مردان خانے کے داخلی دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ حویلی کی عورتیں سب سے پہلے ایک جانب سے سر جھکائے اندر زنان خانے کی جانب بڑھ گئیں۔ بی جان اور صبور خانم اسے دیکھتے ہی حیرانی سے رک گئیں۔

"بخیر راغلے بچے۔۔۔! تم کب آئے؟"

وہ مسکراتا ہوا بی جان کے گلے لگا تو وہ خوشی سے اس کا ماتھا چومتے ہوئے بولیں۔

"بخیر راغلے بی جان۔۔۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی آنا ہوا ہے۔"

وہ بی جان کو جواب دیتا صبور خانم سے ملنے لگا۔ دروازے سے جب مرد آنے لگے تو صبور خانم اس سے علیحدہ ہوئے زنان خانے کی جانب بڑھ گئیں۔ وہ سب سے ملا مگر منتظر نظریں اب تک دروازے پر تھیں۔ عطا اللہ خان نے اس کی بے چینی کو بھانپ لیا۔

"خیریت ہے برخوردار؟"

انہوں نے شال کندھے سے اتاری اور ایک جانب کھڑے ملازم کے حوالے کر دی۔ جو اس کی تہہ لگانے لگا۔

"سفیر کہاں ہے؟"

اس نے حیرانی سے پوچھا باہر گاڑیوں کے آس پاس سفیر کا نام و نشان تک نہ تھا۔

"وہ۔۔۔ وہ تو ڈیرے ہو گا۔"

عطا اللہ خان کی بجائے جواب زمان خان کی جانب سے آیا۔

"مگر۔۔۔ وہ تو۔۔۔"

اس کی بات ادھوری رہ گئی جب باہر سے چلانے کی اور رونے پیٹنے کی آواز آئی۔یہ آواز رشید کی ہی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے یہ؟"

عطا اللہ خان اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔زمان خان بہرام کی تقلید میں ہی باہر کی جانب بڑھے۔

"سائیں۔۔۔غضب ہو گیا۔۔۔"!!!

رشید عرف رشیدے نے روتے ہوئے کہا۔

"کیا ہو گیا ہے۔۔۔بکو"

عطا اللہ خان باہر نکل آئے بہرام کو ایک جانب کرتے انہوں نے آگے بڑھ کر غصے سے کہا۔کسی انہونی کا خوف ان کے دل کو ستا رہا تھا۔

"سائیں۔۔۔چھوٹے سرکار۔۔۔!سائیں ان کا قتل ہو گیا سائیں ڈیرے پر۔۔۔"

وہ روتے ہوئے سارا واقعہ بیان کر گیا پھر سیدھا ان کے قدموں میں آ بیٹھا۔عطا اللہ خان نے یہ سوچنا چاہا کہ شاید یہ کوئی مذاق ہے کوئی فضول مذاق۔کتنی دیر وہ وہیں ساکت کھڑے رہے۔بہرام کے اٹھے ہاتھ پہلو میں جا گرے ۔کہنے سننے کو بچا ہی کیا تھا؟

زنان خانے سے رونے کی آواز آ رہی تھی۔بی جان کے چیخنے، چلانے کی آواز، کھڑکی کے پاس کھڑیں صبور خانم بھی وہیں زمین پر بیٹھتی چلی گئیں۔عمر بھر کی کمائی لٹ گئی تھی۔حویلی کا بڑا دروازہ کھل رہا تھا۔بہرام نے سپاٹ نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا جہاں بخش کچھ لوگوں کے ہمراہ ایک چارپائی اٹھائے انہی کی جانب چلا آ رہا تھا۔عطا اللہ خان کا سر سائیں، سائیں کرنے لگا۔انہوں نے بمشکل برابر میں کھڑے زمان کا سہارا لئے خود کو قابو کیا۔چارپائی ان کے سامنے رکھ دی گئی تھی۔کوئی کڑیل جوان اس پر لیٹا ہوا تھا اوپر دیا کپڑا اور چادر سرخ ہو چکے تھے۔انتہا سے زیادہ سرخ۔بہرام تیزی سے آگے بڑھا۔پاس پہنچ کر لوگوں کو ہٹاتا وہ تیزی سے اس پر دی چادر ہٹانے لگا۔چادر کے ہٹنے

کی دیر تھی اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔اس نے تیزی سے ہاتھ بڑھا کر اس کی نبض محسوس کرنا چاہی مگر کچھ محسوس نہ ہوا۔زمان خان ڈاکٹر کو بلانے کا کہہ رہے تھے۔سب چلا رہے تھے۔چیخ و پکار جاری تھی۔

"لالہ آپ ہمیشہ آنے میں دیر کر دیتے ہیں۔۔۔"

خفگی سے بھرپور آواز ارد گرد گونجی۔اس نے محسوس کیا کہ آنکھوں کے گوشے بھیگتے جا رہے ہیں۔اس کے اندر عجیب وحشت، عجیب خاموشی پھیلنے لگی۔کون کیا کہہ رہا تھا، کیا کر رہا تھا اسے خبر نہ تھی۔وہ بس سن سا گھٹنوں کے بل اس کے قریب آ بیٹھا۔

"توبہ بھی نصیب نہ ہوئی۔"

وہ بہت دھیمے سے اس کی بند آنکھیں دیکھتا بڑبڑایا۔پھر تیزی سے اٹھ کر اس کا ماتھا چومتا اندر چلا گیا۔دو پل بھی یہاں رہتا تو ضبط کھو دیتا اور ایسا وہ نہیں چاہتا تھا۔سلیمان خان کو اس نے دروازے کے پاس ساکت کھڑے دیکھا وہ ایک نظر انھیں دیکھتا تیزی سے اوپر کی جانب بڑھ گیا۔سفیر کا جسدِ خاکی حویلی کے وسیع لان کے بیچ و بیچ پڑا تھا۔حویلی میں لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔جسے خبر ہو رہی تھی وہ آتا جا رہا تھا۔عطا اللہ خان کو زمان خان سنبھالے ہوئے تھے۔بی جان کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔صبور خانم یونہی سپاٹ بیٹھی تھیں اور کشف کو سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ سفیر کی موت پر آنسو بہائے یا اپنی محبت کی موت پر؟"یہ آپ نے کیا کر دیا مرتضیٰ؟"وہ ہلکی آواز میں بڑبڑائی۔رونے کو بہانہ مل گیا تھا۔اس کی آنکھ سے آنسو لڑیوں کی مانند نکلنے لگے۔

☆☆☆☆☆

کمرے میں گہرا اندھیرا تھا۔باہر کے اندھیرے سے بھی زیادہ۔سناٹا اس کا دل چیر رہا تھا۔دل لہولہان ہو رہا تھا۔اس نے آنکھیں میچیں پھر کھڑکی کی جانب چلا آیا۔پردے سرکا کر نیچے جھانکا۔جہاں لوگ جمع ہو رہے تھے۔بیچ و بیچ ایک چارپائی پر پڑی ہوئی۔وہ لاش۔بہرام کا دل بھر آیا۔اسے لگا سفیر کی آنکھیں بھلے ہی بند ہیں مگر ارد گرد

کمرے میں پھیلا سناٹا اور جیسے خود سفیر کی ذات اس سے سوال کر رہی تھی۔ اسے اس بات کا قصوروار ٹھہرا رہی تھی کہ آپ کیوں مجھے ہدایت کی راہ پر نہ لا سکے؟ کیوں اس انتظار میں رہے کہ روبرو ملاقات کریں گے؟ آپ کو مجھ سے روبرو ملنا تھا نا؟ لیں مل لیں۔

سوال و جواب بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ ہارے جواری کی مانند زمین پر آ بیٹھا۔ سر ہاتھوں میں دیئے اس نے درد سے پھٹتے سر کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ آنکھیں شدتِ غم سے لال ہو رہی تھیں۔

"لالہ آپ بہت برے ہیں۔ ایسے کرتا ہے کوئی؟"

ایک اور بازگشت اسے سنائی پڑی۔ اس نے کانوں پر سختی سے ہاتھ جما دیئے۔

"بس کر جاؤ سفیر۔ مذاق بند کرو۔ اللہ مجھے اس برے خواب سے جگا دو۔"

وہ آنکھیں سختی سے بند کیے نفی میں سر ہلانے لگا۔ باہر کی چیخ و پکار اور لہو کی بو اندھیرے کی طرح ہی تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔ ملال بڑھتا جا رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

وہ رات کے دوسرے پہر تک وہیں اپنے دوست کے ہاں رہا جس نے مہر و مروت سے اسے وہاں رکھا۔ اب وہ گھر جانے والا تھا۔ آگے کیا کرنا تھا ساری حکمت عملی اب گھر جا کر ہی طے کرنا تھی۔ وہ اتنا بزدل نہ تھا کہ حالات سے بھاگ جاتا۔ اب جو ہو گا دیکھا جائے گا لیکن وہ مزید روپوش نہیں رہے گا۔ اس نے اسی لمحے فیصلہ کیا اور دروازہ تک پہنچا۔ وہ دروازہ بجا کر اپنے دوست کو بلانا چاہتا تھا لیکن اس سے قبل کہ وہ دروازہ بجاتا اسے باہر سے دبی، دبی سی آواز سنائی دی۔

"میری بات سنو دوست کی محبت میں اتنے پاگل نہ ہو، وہ ایک قاتل ہے، ہم نے اسے گھر میں جگہ دی ہے، ابھی اسے کسی طریقے سے یہیں روکو، کل صبح ہی حویلی والے اس کی تلاش میں آدمی دوڑا دیں گے، تب تم ان کے پاس

جا کر اس کی ہمارے گھر میں موجودگی کی اطلاع دے دینا۔ اس طرح حویلی والے بھی خوش ہو کر انعام دیں گے ہمارا بھلا ہی ہو جائے گا۔ اب سمجھے کہ نہیں؟"

یہ آواز اس کے دوست کی بیوی کی تھی وہ جانتا تھا۔ شاید وہ اس بات سے انجان تھی کہ وہ دروازے کے پاس کھڑا ان کی ہر بات سن رہا ہے۔ تبھی وہ بولتی جا رہی تھی۔ اب اس کا یہاں رہنا ہر صورت میں ناممکن تھا۔ اس کی نظر کھڑکی پر گئی بغیر کچھ کہے وہ خاموشی سے کھڑکی کی جانب بڑھ گیا۔ دوست کی خاموشی اسے بہت کچھ باور کروا گئی تھی۔ اب حالات ہی ایسے تھے کہ دوست بھی ناقابل بھروسہ تھا۔

☆☆☆☆☆

صبح آج بہت اداس بہت ویران تھی۔ منڈیر پر بیٹھے کبوتر گردن جھکائے مایوس تھے۔ گل شیر ایک جانب برگد کے درخت تلے لب سیئے خاموش بیٹھے تھے۔ وہ کل رات سے اب تک یونہی بیٹھے تھے۔ خاموش اور ساکت۔ زینی باڑے کی دیوار سے ٹیک لگائے کل والے لباس میں ہی ملبوس تھی مگر اب بال سلجھا کر ان کی چوٹی بنا رکھی تھی۔ پوری رات جاگنے کے سبب لال ہوئی آنکھیں اپنی داستان آپ سنا رہی تھیں۔ قمر اور پھوپھی ایک جانب بیٹھے تھے۔ پورے گھر میں سوگواری تھی۔ خاموشی تھی۔ پو پھوٹنے سے قبل ہی بخش سمیت کچھ آدمی ان کے گھر آ پہنچے تھے۔ مرتضیٰ نے سب کو تسلی دی اور خاموشی سے ان کے ساتھ چل دیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد سے اب تک سب لب سیئے بیٹھے تھے انہونی کا اندیشہ ان کے دلوں کو دھڑکا رہا تھا۔ آنے والا وقت کیا دکھانے والا تھا اس سب سے وہ انجان تھے کل تک وہ اتنی پرسکون زندگی گزار رہے تھے اور اب کیسا طوفان آ کھڑا تھا۔ زینی کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ اس کی وجہ سے اس کے گھر والوں کو کس عذاب سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا؟ وہ ضبط کھو رہی تھی۔ نا جانے لالہ کا کیا حال ہو گا۔ سورج سروں پر آنے لگا۔ صبح ختم ہوتی، ہوتی سہ پہر میں آ ڈھلی۔ کبوتر بھی جا چکے تھے مگر سب اب تک بغیر کچھ کھائے پیے اپنی جگہ پر بیٹھے تھے۔

دروازہ بجنے لگا تھا، جرگے کا بلاوا آگیا تھا۔ گھٹنوں پر ہاتھ جمائے کھڑے ہوتے وہ جیسے ایک ہی رات میں بوڑھے ہو گئے تھے حالات نے ان کی کمر توڑ دی تھی۔ دروازے سے باہر نکلنے سے قبل وہ رکے پھر مڑ کے باڑے کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی زینی کے قریب آئے اور جھک کر اس کا ماتھا چوما۔ زینی نے حیرت سے سر اٹھا کر انھیں دیکھا۔ پوچھنا چاہتی تھی ایسا کیوں؟ پر پھر سمجھ آتے ہی چپ سی ہو گئی اور خاموشی سے زمین تکنے لگی۔ وہ اسے قربانی کے لئے تیار کیے جا رہے تھے۔ جیسے کسی جانور کو قربان کرنے سے قبل بہلا پھسلا کر تیار کرتے ہیں۔ پھر گل شیر لڑکھڑاتے قدموں سے رومانہ کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ مڑ کر شفقت و ارماں بھری نظر زینی پر ڈالی جو ساکت بیٹھی تھی۔

"ایک ہی حل ہے بس ایک ہی۔۔۔ خور۔۔۔ بس تیار رہنا۔"

پھر خاموشی سے چوکھٹ پار کر گئے۔ رومانہ نے دکھ سے آنکھیں میچ لیں۔ نظر فاصلے پر بیٹھے اپنے بیٹے اور پھر زینی پر گئیں۔ کتنے ارمان اور حسرت بے موت مر گئے تھے۔

زینی کی آنکھیں ساکت اور ایک ہی نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔ اب کیا ہو گا؟ گاؤں کی رہنے والی وہ بچی کیا اس بات سے ناواقف تھی کہ سزا کے طور پر وہ بیٹیاں لے جاتے ہیں۔ اور اب یہی اس کے ساتھ ہو گا۔ وہ جانتی تھی۔ اس کی آنکھ سے آنسو بہنے لگے۔ ہر شے حتیٰ کہ موسم بھی اس کے ساتھ ہی افسردہ نظر آنے لگا۔

☆☆☆☆☆

جرگہ آج کیا فیصلہ کرنے والا تھا اس سے وہاں موجود چند لوگ بخوبی واقف تھے۔ جبکہ کچھ منتظر تھے کہ نا جانے کیا فیصلہ ہونے والا ہے۔ دونوں فریقوں نے فیصلے کا اختیار جرگے کے معزز بزرگوں کو دیا۔ عطا اللہ خان اپنی کرسی پر کروفر سے بیٹھے تھے۔ اپنے غموں کو خود میں چھپائے وہ بھرم کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے۔ نظریں سنجیدگی اور نفرت سے سر اٹھائے کھڑے مرتضیٰ پر جمی ہوئی تھیں۔ جس کی ڈھٹائی قابلِ ستائش تھی۔ اتنی بری طرح لہولہان ہونے

کے بعد بھی اس نے گردن جھکانا نہیں سیکھا تھا۔ چہرے پر جابجا نیل پڑے ہوئے تھے۔ پھٹے کرتے کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اسے کوڑے لگائے گئے ہیں۔ بائیں آنکھ بھی سوجھی ہوئی تھی۔ اس کی حالت دیکھے گاؤں کے لوگ ترحم آمیز انداز میں اسے دیکھ رہے تھے۔ مگر شاید اسے خود پر رحم ہی نہیں آتا تھا۔ ایک جانب کھڑا بخش بہت خوش تھا کہ آج صبح سے مرتضیٰ کو مارتے، مارتے اسے عجیب راحت محسوس ہو رہی تھی۔ ساری احساس کمتری کہیں جا سوئی تھی اور اس نے جی بھر کر مرتضیٰ کو پیٹا تھا۔ سارے بدلے لے لینے کے بعد وہ خود کو بہت پر سکون محسوس کر رہا تھا۔

جھکے کندھوں سمیت لڑکھڑاتے گل شیر جب جرگے پہنچے تو بے تاب نظریں ارد گرد گھومتیں مرتضیٰ پر آ رکیں۔ اس کی حالت دیکھ کر دل کو دھچکا لگا اور عجیب تکلیف ہوئی۔ وہ دوڑ کر اس کے پاس جانا چاہتے تھے مگر دو آدمی سامنے آ کھڑے ہوئے۔

انہوں نے بے بسی سے سر جھکا دیا۔ جرگے کا آغاز عطا اللہ خان کے بڑے پوتے اور سفیر خان کے بھائی بہرام خان کے آنے کے بعد ہونا تھا۔ زعیم اور صائم ایک جانب کھڑے تھے۔ سنجیدہ صورت لئے وہ خاموش تھے کہ وہ عطا اللہ خان کے بنائے قانون کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔ مگر ان کی دلی نیک تمنائیں مرتضیٰ کے ساتھ تھیں جسے طرح بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ کیا تھا اگر اس سے سفیر کا قتل ہو گیا تھا۔ شاید اس کی زندگی اتنی ہی تھی۔ مگر یہ ناخدا کون ہوتے ہیں کسی کی زندگی اور جزا و سزا کا فیصلہ کرنے والے؟ مگر قبیلے، جرگے کے قانون اور عطا اللہ خان کی اقدار و روایات کی محبت ایسی کہ وہ کچھ کہہ نہیں پائے۔

چند ثانیے انتظار میں سرک گئے۔ چہ مگوئیاں جاری و ساری تھیں۔ جب کسی گاڑی کے ہارن بجنے پر ہجوم کا ایک بڑا حصہ تیزی سے دوسری جانب ہوا۔

اگلے ہی پل جیپ کو بریک لگائی گئی۔ گاڑی کا دروازہ کھلا اور کالے کرتا شلوار میں ہلکی، ہلکی شیو اور سنجیدہ آنکھوں سمیت بہرام خان باہر نکلا۔ خاکی شال کو جھٹک کر سیدھا کیا اور مضبوطی سے زمین پر قدم جمائے ناک کی سیدھ میں چلتا عطااللہ خان کے ساتھ آ بیٹھا۔ آنکھیں سنجیدہ تھیں اور نظروں میں سرد سا تاثر۔ محض ایک بار آنکھیں اٹھا کر اس نے سامنے کھڑے مرتضیٰ کو دیکھا تھا۔ وہ یہاں آنا ہی نہیں چاہتا تھا مگر عطااللہ خان کے مجبور کرنے پر اسے یہاں آنا پڑا اور نہ اس جرگے سے اسے کوئی دل چسپی تھی، نہ سزا سے۔ وہ مرتضیٰ کی تفتیش خود کرنا چاہتا تھا مگر اس بات کی اجازت اسے نہ ملی مجبوراً اسے اس جرگے میں شرکت کرنا پڑی۔

"جرگے کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔" بخش نے عطااللہ خان کے اشارے پر با آواز بلند کہا تو مجمعے کو سانپ سونگھ گیا۔ بخش نے گواہ ہونے کے سبب رشیدے سمیت سب سے پہلے گواہی دی۔ وہ واقع بیان کرتا جا رہا تھا اور عطاء اللہ خان کے ماتھے کی رگیں واضح ہوتی جا رہی تھی یہ اس بات کی گواہی تھی کہ وہ بمشکل خود پر ضبط کیے بیٹھے ہیں۔ مرتضیٰ بس خاموشی سے انہیں سن رہا تھا۔ یہی حال گل شیر کا تھا۔ جب مرتضیٰ کے بولنے کی باری آئی تو وہ شدتِ ضبط سے ہونٹ بھینچ گیا ایک نظر بھرے مجمے پر ڈالی۔ کیا وہ اتنا بے غیرت تھا کہ اپنی بہن کی عزت یوں سرِ عام اچھالتا۔ اس کی غیرت نے گوارا ہی نہ کیا۔ خود گل شیر بھی خاموش کھڑے تھے۔ بیٹی کے باپ جو تھے۔ کچھ لمحے خاموشی کی نظر ہوئے پھر ایک دم مرتضیٰ نے سپاٹ چہرہ اٹھایا اور عطاء اللہ خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے عام سے لہجے میں اعتراف کر گیا۔

"میری ان سے بحث ہو گئی تھی۔ اپنے دفاع کی خاطر میں نے گلدان سے ان پر ایک وار کیا تھا جس کی وجہ سے ان کا سر پھٹ گیا اور وہ موقع پر مر گئے۔ بس یہی وجہ تھی۔۔۔"

وہ ایسے اعتراف کر رہا تھا، لہجہ ایسا تھا جیسے کسی مقابلے کو جیتنے کی خبر سنا رہا ہو۔ عطاء اللہ خان غصے سے اپنی جگہ سے اٹھے۔ اس سے قبل وہ کوئی غلط قدم اٹھاتے یا اسے کچھ کہہ پاتے بہرام نے ان کا بازو تھامے انھیں روکا۔ انہوں

نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ بہرام نے نفی میں سر ہلائے انھیں ٹوک دیا۔ وہ پہلو میں اٹھا ہاتھ واپس گراتے بیٹھ گئے۔ ایک بار پھر ہجوم میں چہ مگوئیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ چند لمحے یونہی شور بلند رہا پھر جرگے اور گاؤں کے معزز بزرگ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"سزا تو بس دو ہی ہیں۔۔۔ خون کے بدلے خون یا خون کے بدلے دیت (رقم)"

ایک بزرگ بولے تو سب نے اثبات میں سر ہلایا۔

"سردار صاحب آپ بتائیں کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ خون کے بدلے خون یا دیت؟"

عطاء اللہ خان نے ہنکارا بھرا۔ مڑ کر ایک نظر سلیمان خان اور زمان خان کی جانب دیکھا دوسری نظر ساتھ سنجیدہ صورت لیے بیٹھے بہرام خان پر ڈالی۔ پھر شال جھٹکتے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جگر کے ٹکڑے کی موت نے کمر توڑ کر رکھ دی تھی مگر رسمِ دنیا ہے کہ جو جھک جائے کچلا جاتا ہے۔ تبھی انا کا پرچم بلند رکھنے کو خود بھی سیدھے کھڑے تھے۔ مرتضیٰ اور گل شیر منتظر نظروں سے لب سیئے انھیں دیکھ رہے تھے۔ گل شیر کے کندھے جھکتے جا رہے تھے۔

"ہم ونی چاہتے ہیں۔"

مجمعے کو سانپ سونگھ گیا۔ بہرام نے جھٹکے سے سر اٹھا کر انھیں دیکھا۔ مرتضیٰ اور گل شیر نے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا۔ گل شیر شدتِ ضبط سے آنکھیں میچ گئے۔

"یہ غلط بات ہے۔۔۔ خون کا بدلہ خون ہے۔ میری جان لیں مگر میری بہن مت مانگیں۔"

مرتضیٰ کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔ عطاء اللہ خان محظوظ انداز میں مسکرائے نشانہ صحیح جگہ جا لگا تھا۔ ان کا لختِ جگر اگر مرا تو وہ بھی ان کے جگر کا ٹکڑا مانگ کر انھیں پل، پل موت دیں گے۔

"ہمیں ونی ہی چاہیے۔"

سلیمان خان بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ان کی دیکھا دیکھی زمان خان بھی کھڑے ہو چکے تھے۔بزرگوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔فیصلہ ہو چکا تھا۔گل شیر کو حکم ملا تھا کہ بخش اور دو تین آدمیوں کے ساتھ جا کر اپنی بیٹی کو لے آئے۔مرتضیٰ کو چھوڑا گیا تو وہ تیزی سے گل شیر کی جانب بڑھا۔لڑکھڑاتا، گرتا، پڑتا وہ ان کے پاس آیا۔ان کے کندھے پر ہاتھ رکھے بے بسی سے انھیں دیکھا۔

"ابا نہیں"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔گل شیر کے آنسو ان کی داڑھی بھگونے لگے۔صباء سے کیا ہر وعدہ انھیں ستا رہا تھا۔صباء نے کہا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے مرتضیٰ کو خود سے الگ مت کرنا۔انہوں نے کانپتے ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے۔

"تجھے تیری ماں کی قسم ہے تو آج مجھے روکے گا نہیں، تو کچھ نہیں کہے گا کوئی سچ نہیں بولے گا۔"

ان کی قسم پر وہ بے بسی سے ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔وہ اپنی بیٹی کی قربانی دے رہے تھے۔اس کے لئے؟

"ابا وہ مر جائے گی۔"

وہ گھٹی آواز میں بولا۔

"نہیں مرتی وہ۔۔۔میں جانتا ہوں۔۔اس کی تربیت صباء نے کی ہے، میں نے کی ہے۔ایسی مشکلوں اور ایسے حالات سے نہیں مری گی وہ۔لیکن اگر تو نے اپنی جان دے دی تو وہ ضرور مر جائے گی۔"

انہوں نے کتنی قسمیں، کتنے وعدے دیے اس کے سوچنے، سمجھنے اور بولنے کی قوت ہی چھین لی تھی۔اس کا ہاتھ پہلو میں آ گرا۔

"ابا۔۔۔"

وہ پلٹے تو مرتضیٰ چلایا۔وہ ان کے پیچھے جانا چاہتا تھا انھیں روکنا چاہتا تھا مگر بخش کے اشارے پر دو آدمی اسے قبضے میں لے چکے تھے۔بہرام تیزی سے کھڑا ہوا۔وہ جانے والا تھا جب اسے عطاء اللہ خان کی آواز سنائی دی۔

"تم کہیں نہیں جاسکتے۔۔۔"

ان کی آواز میں چٹان سی سختی تھی۔وہ بغیر پلٹے ہونٹ چبانے لگا۔

"یہاں بیٹھو واپس آکر۔"

اب کی بار وہ مزید سخت لہجے میں بولے۔زعیم اور صائم تو خاموشی سے واپس چلے گئے۔مزید کچھ بھی برداشت کرنا ان کے بس سے باہر کی بات تھی۔یہی غنیمت تھی کہ وہ پچھلے کچھ گھنٹوں سے وہاں خاموش کھڑے تھے۔

"ہوش کریں آغا جان۔۔ونی مانگ لینے سے یا اس لڑکے کی جان لے لینے سے ہمیں ہمارا سفیر واپس نہیں مل جائے گا۔"

بہرام سخت لہجے میں بولا وہ ان رسومات کے سخت خلاف تھا اس کا بس نہیں چلتا کہ آغا جان کی ان رسومات کے خلاف اٹھ کھڑا ہو مگر وہ ان کے ادب واحترام کے سبب مجبور تھا۔

" اب تم ہمیں سکھاؤ گے کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا؟"

وہ تیز لہجے میں بولے مجمعے کو سانپ سونگھ چکا تھا سب خاموشی سے بس تماشہ دیکھ رہے تھے بہرام نے ہونٹ کچلے۔

"تو ٹھیک ہے آپ اس لڑکی کا نکاح زعیم سے کروادیں یا صائم سے۔"

آخر کو انہی کا پوتا تھا۔بلا کا ڈھیٹ۔

"ہمیں سختی پر مجبور نہیں کرو ورنہ۔۔۔"

"کیا ورنہ؟؟؟"

ان کی دھمکی پر وہ تیزی سے بولا۔اس کا ماتھا ٹھنکا تھا۔

" ورنہ تمہاری مور جان کو طلاق دلوادیں گے۔"

ان کی بات تھی یا کوئی لوہے کا گرم سلاخ، جو سیدھا دل پر رکھا گیا تھا، جس نے بہرام خان کا وجود جلا ڈالا تھا۔ اس کا دل پھٹنے لگا۔ اپنا مطلب نکالنے کو کسی کی زندگی برباد کرنے کو لوگ کس حد تک چلے جاتے ہیں۔ اس نے بس خاموش نظریں سلیمان خان پر ڈالیں جو نظریں چرا گئے۔ ایک بیٹے کو کھو کر اب وہ مزید دکھ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ جانتے تھے کہ اگر بہرام خان نے عطا اللہ خان کی بات نہ مانی تو وہ اسے جائیداد سے عاق کر دیں گے۔ ایسے میں وہ ہمیشہ کے لئے اس سے دور ہو جائیں گے۔ اگر اب سر جھکا لیں گے تو آگے دکھ اٹھانے سے بچ جائیں گے۔ بہرام تمسخر سے مسکرایا پھر سر جھٹکتا سپاٹ اور سرد انداز میں واپس کرسی پر جا بیٹھا۔

☆☆☆☆☆

ہرنی جیسی آنکھوں میں خوف ہی خوف تھا۔ بدن پر کپکپی طاری تھی تو دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ پھوپھی کہہ رہی تھی کہ کسی بھی وقت سائیں کے آدمی موت کا فرشتہ بنے آسکتے ہیں، پھوپھی کی جس بات نے اسے سب سے زیادہ خوف زدہ کیا وہ یہی تھی کہ وہ اسے ان سے چھین کر لے جائیں گے اور پھر کبھی یہاں نہیں آنے دیں گے۔ اس کا گھر؟ اس کی گڈیاں؟ اس کے کپڑے؟ اس کی سہیلی؟ اس کے ابا اور اس کا لالہ؟ ابھی تو اسے گڈی اور گڈا کی شادی بھی کروانی تھی۔ لیکن اب پھوپھی یہ کیا کہہ رہی تھی؟ وہ پھوپھی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر بیٹھ گئی۔

"پھوپھی مجھے چھپا دے۔۔۔ مجھے اپنے دوپٹے میں چھپا لے۔ میں نہیں جاؤں گی پھوپھی۔۔۔ حویلی والے بہت ظالم ہیں۔"

معصومیت اور خوف کے ملے جلے امتزاج سے بولتی وہ رومانہ میں سمٹتی جا رہی تھی۔ رومانہ بھی اسے خود سے لپٹائے ہوئے تھی جیسے اسے کہیں جانے نہیں دے گی۔

"رونا بند کر زینی میں تجھے کہیں جانے نہیں دوں گا۔ تو جانتی ہے تیرے رونے سے مجھے درد ہوتا ہے تو کیوں رو رہی ہے؟"

قمر اس کے برابر بیٹھا اور اس کا رخ اپنی جانب موڑے اس کے آنسو پونچھے۔ رومانہ نے اسے آنکھیں دکھائیں پھر سختی سے بولیں۔

"قمر اندر جا۔"

قمر نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھوپھی میں سمی کے گھر چھپ جاتی ہوں۔"

وہ چارپائی سے اٹھی تو ایک دم ہی قمر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے مڑ کر قمر کی جانب دیکھا جو اسے نظر انداز کیے یونہی اس کا ہاتھ تھامے رومانہ کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کی کلائی کے زخم میں درد ہوا تو اس نے نامحسوس انداز میں ہاتھ چھڑوانا چاہا۔

"امی تو ان لوگوں کے آنے سے پہلے ہی مسجد لے جا کر ہمارا نکاح کروا دے میں اپنی زینی کو لے کر یہاں سے دور چلا جاؤں گا۔"

وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ زینی نے گھبرا کر ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکالا۔

"تو پاگل ہو گیا ہے قمر؟ سائیں تجھے مار دے گا۔ سائیں کے بندے تم دونوں کو ڈھونڈھ کر مار دیں گے۔"

رومانہ کے لہجے میں ہزاروں خوف اور اندیشے چھپے ہوئے تھے۔

"امی میں۔۔۔" قمر کی بات دبا دی گئی۔

"بس کر قمر۔۔۔ چپ رہ، تو میری عمر بھر کی کمائی ہے میں تجھے سائیں کے ہاتھ نہیں چڑھنے دوں گی۔"

رومانہ سخت لہجے میں بولیں۔ وقت برہنہ تلوار بنا ان کے سروں پر لٹک رہا تھا کسی بھی لمحے وہ تلوار ان پر آ گرنی تھی۔

"اور یہ امی؟ یہ کیوں اس رسم کی بھینٹ چڑھے؟ کیوں؟"

رومانہ نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر تھپڑ دے مارا۔وہ بے یقینی سے ان کی جانب دیکھنے لگا۔زینی خاموش کھڑی تھی۔

"ایک بار کی بات سمجھ نہیں آتی تجھے؟چار جماعتیں پڑھ کر مجھے پڑھانے چلا ہے۔"

وہ تنفر سے بڑبڑائیں۔ تبھی لکڑی کا دروازہ زور،زور سے بجنے لگا۔دستک جاری تھی اور وہ سن ہوئے کھڑے تھے۔دروازے کے پار اس کی قسمت کھڑی تھی۔کیا یہی تھا اس کا نصیب؟کس کے نام لکھی جانے والی تھی وہ آج ؟کہاں گئی اس کی وہ خوش نصیبی جس کی دعا اسے ملا کرتی تھی؟کہاں جا سوئی تھی اس کی قسمت؟

رومانہ چادر لئے دروازہ کھولنے جا رہی تھیں۔وہ دھندلائی آنکھوں سے دروازے کی جانب دیکھ رہی تھی۔اس کا لالہ اسے بچا نہیں پایا وہ اپنی زینی کو بچا نہیں سکا اور اس کا ابا مجبور و لاچار ہو گیا تھا۔اس کا ابا اس کے سر پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔اس کی پھوپھی اسے کپڑے تبدیل کرنے کو کہہ رہی تھی۔اسے یاد آیا اس کے کپڑوں پر تو خون لگا ہوا تھا۔وہ پھوپھی کے کہنے پر گوں مگوں کیفیت میں چلتی جا رہی تھی۔قمر کے چلانے کی آواز آ رہی تھی اور اسے لگ رہا تھا جیسے قیامت آ گئی ہو۔ہاں غلطی اس نے کی تو سزا بھی وہی بھگتے اس کے گھر والے نہیں۔اس نے جی بھر کے اس گھر کو دیکھا جہاں پندرہ برس گزار دیے تھے۔جہاں کے صحن میں اس کی شامیں گزریں،جہاں کی منڈیر پر کبوتر اس کے انتظار میں بیٹھے رہتے۔وہ باڑا جہاں اس کا سونو اس کا انتظار کرتا۔وہ خاموشی سے کمرے میں چلی گئی۔کپڑے تبدیل کیے وہ باہر آئی تو پھوپھی نے اسے ٹوپی برقع اوڑھا دیا۔جرگے کے اتنے مردوں کے سامنے یوں چادر لے کر چلی جانا مناسب نہیں تھا۔اس نے پھوپھی کی جانب دیکھا۔جالیوں کے پیچھے وہ ہرنی جیسی آنکھیں چھپ گئی تھیں۔

"پھوپھی میں اپنی گڑیا لے جاؤں؟میں اس سے باتیں کر لیا کروں گی"

وہ معصومیت سے بولی تو رومانہ نے چہرہ موڑے آنسو چھپا لیے۔

"یہ تو چھوٹی دنیا تھی نازینی؟ چھوٹا گھر؟ یہاں تو تجھے دل بہلانے کو گڑیا کی ضرورت ہوتی تھی مگر وہ بڑی دنیا ہے وہاں ایسی چیزوں کی ضرورت نہیں ہو گی۔ وہاں کے لوگ ظالم ہوں گے، پر تو کوشش کرنا کہ بے حس بن جائے۔ ایسے کہ کوئی غم کوئی مار تجھے مار ہی نہ لگے۔ تو ہمیں معاف کر دینا، اپنے ابا کو بھی معاف کر دینا اور اپنے لالہ کو بھی۔"

رومانہ تلخ حقیقت بیان کرتیں اس کے خوابوں کا گلہ گھونٹ رہی تھیں۔

"کبھی غلطی سے بھی خود کو ان کی بہو نہ کہہ دینا تم بہو نہیں ہو حویلی کی۔ تم بس ونی ہو۔ اور ونی کسی کی بیوی نہیں ہوتی وہ بس ملازمہ ہوتی ہے۔"

اپنے ابا کے ساتھ چوکھٹ پار کرتے اس کے کانوں میں بازگشت جاری تھی۔

"تم بس ونی ہو۔۔۔۔"

☆☆☆☆☆

وہ ابا کے پیچھے چھپتی، بخش کی غلیظ نظروں سے خود کو بچاتی جرگے آ پہنچی۔ سب کی نظریں اس کی جانب اٹھیں جن میں سب سے بے تاب نظریں مرتضیٰ کی تھیں۔ وہ اس تک پہنچنا چاہتا تھا پر اس کی آنکھوں میں ڈھیروں ملال اتر آیا تھا۔ مولوی آ چکے تھے۔ عطا اللہ خان کے اشارے پر خاموشی چھا گئی۔ نکاح کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے زینی سے رضامندی لی گئی۔

"زینش قیصر ولد قیصر احمد آپ کا نکاح سردار بہرام خان ولد سلیمان خان کے ساتھ باعوضِ حق مہر پچیس ہزار روپے سکہ رائج الوقت طے پایا۔ کیا آپ نے قبول کیا؟"

جہاں زینش قیصر نام پر وہ چونکی وہیں پورے مجمعے میں ایک بار پھر چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں۔

"گل شیر یہ کیا مذاق ہے؟ "

عطااللہ خان کے سوال پر گل شیر خاموشی سے سر جھکا گئے جب کہ مرتضی نے آنکھیں میچ لیں۔ یہ وہ لمحہ تھا جس سے وہ دونوں خوف کھاتے تھے۔ گل شیر نے نظریں اٹھائیں اور نا جانے کتنی ہمت جمع کی۔

"یہ سچ ہے سرکار۔۔۔بے شک میں اس کا باپ نہیں ہوں مگر میں نے بہت محبت سے اسے پالا ہے۔۔۔"

وہ مزید بولنا چاہتا تھا جب بیچ میں ہی ٹوک دیا گیا۔

" صحیح ہے۔۔۔لڑکی تو بول"

اب وہ سن سی بیٹھی زینی سے نخوت سے گویا ہوئے جسکو آج بس دھچکے ہی لگ رہے تھے۔ اس نے شکوہ کناں نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا مرتضیٰ رخ موڑ گیا۔ وہ کچھ کہنے کی حالت میں نہیں تھا۔ زینی نے سر جھٹکا۔ بھرے دل سے اس نے سر اثبات میں ہلا کر رضامندی دی۔ گل شیر کا کانپتا ہاتھ وہ اپنے سر پر محسوس کر سکتی تھی۔ مرتضیٰ نے اس کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچے وہ ضبط کی آخری منازل طے کر رہا تھا۔

اب ایجاب و قبول کی باری بہرام کی تھی اس نے خاموش نظریں اٹھا کر کچھ فاصلے پر بیٹھی اس ڈھکی چھپی لڑکی کو دیکھا پھر نظریں چرا لیں۔ اسے عطااللہ خان کی دھمکی یاد آئی نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس ظلم میں برابر کا شریک ٹھہرا اسے خود پر افسوس ہو رہا تھا۔ لیکن وائے افسوس کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں نکاح مکمل ہوا وہاں وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر خاموشی سے اٹھا اور جیپ میں جا بیٹھا۔ چند لمحے بعد ہی اس کی جیپ دھواں چھوڑتی جا رہی تھی۔

عطااللہ خان کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ نکاح کر چکا ہے۔ اب جا کر انھیں سکون ملا تھا۔ تماشا ختم ہو چکا تھا اور کسی کی زندگی برباد ہونے والی تھی۔ جرگے کے بزرگوں کے جانے کی دیر تھی، آہستہ آہستہ ہجوم چھٹنے لگا۔ بت بنی بیٹھی زینی کے وجود میں حرکت ہوئی وہ اٹھی اور تیزی سے مرتضیٰ کے پاس چلی آئی۔ مرتضیٰ بھی مڑا اور اس کی جانب دیکھا۔ آنکھیں سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔

" مجھے اس بات سے انجان ہی رہنے دیں کہ میرا حقیقی باپ کہاں ہے۔مجھے بس یہی محسوس کرنے دیں کہ آپ سب ہی میرے اپنے ہیں۔"

اس کی آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔مرتضیٰ نے خود پر قابو پایا۔

"ہمیں معاف کر دینا۔مجھے معاف کر دینا۔"

مرتضیٰ نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا۔زینی اب باقاعدہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

"میں کچھ نہیں کر سکا۔"

وہ ہلکی آواز میں بڑبڑاتا مڑ گیا۔زینی کی رخصتی وہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔اگر رخصتی ایسی ہوتی تھی تو وہ دعا کر رہا تھا کہ کوئی بیٹی ایسے رخصت نہ ہو۔وہ اسے منجھدار میں ڈبو کر جا چکا تھا وہ ایسے مسافر کی طرح تھی جسے بیچ منجھدار چھوڑ دیا گیا تھا۔بے آسرا،بے سہارا،اور بے یار و مددگار۔گل شیر سے ملنے کے بعد وہ اسے یونہی نم آنکھوں سمیت چھوڑے بڑے لوگوں کی بڑی سواری پر بیٹھ کر جا چکی تھی۔زمین پر گھٹنوں کے بل گرتے گل شیر نے تڑپ کر رب سے فریاد کی تھی کہ اب کسی بیٹی کی رخصتی یوں نہ ہو۔کوئی بیٹی یوں اس رسم کی بھینٹ نہ چڑھے۔ان کا دل بھر رہا تھا۔آسمان کی جانب دیکھتے وہ دھیمے انداز میں بڑبڑائے۔

"آج تم سے محبت کا قرض ادا کر دیا صباء۔آج اپنی محبت کو تیری محبت پر لٹا دیا اس گل شیر نے۔"

☆☆☆☆☆

کمرے میں اندھیرا کیے آج وہ اپنی محبت کا ماتم منا رہی تھی جو بے موت ہی مر گئی تھی۔حویلی والے کیا اب دوبارہ کبھی مرتضیٰ کی شکل دیکھیں گے؟نہیں مر کر بھی نہیں۔اور ایسے میں اس کی محبت کا کیا؟آنسو ان نیلے نین کٹوروں سے نکلتے عارض بھگوتے جا رہے تھے اور دل تھا کہ ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔آنے والا وقت کیا،کیا دکھانے والا تھا؟ یہ سوچ اس کا دل ہولا رہی تھی؟وہ کب تک اس منہ زور جذبے کی لگام تھامے رکھے گی؟آخر کب تک؟لاتعداد

سوچیں ذہن کے کوری سلیٹ پر ابھر رہی تھیں اور وہ بس آنسو بہاتی سن بیٹھی تھی۔اسے سمجھ نہیں آرہا تھا ان حالات کے لئے مرتضیٰ کو قصوروار ٹھہرائے یا اپنے نصیب کو؟

☆☆☆☆☆

دن ڈھل گیا تھا۔پرندے مسکن کو لوٹ گئے تھے۔زندگی سب کو لئے اپنی ڈگر پر رواں تھی مگر نجانے اسے کیوں یہاں لے آئی تھی۔اب ناجانے اس کی زندگی اسے کیا، کیا دکھانے والی تھی؟وہ بہرام خان جس نے اسے ایک بار بچایا بھی تھا کیا اب وہ اپنی ونی کو بچائے گا؟اسے ٹھوکر لگی تو وہ گر گئی۔ہوش کی دنیا میں لوٹی تو پر شکوہ حویلی کا داخلی دروازہ سامنے تھا اور وہ انہی سیڑھیوں کے پاس گری ہوئی تھی۔ذہن پانچ ماہ پیچھے چلا گیا۔وہ اپنے عام سے گھر کے کمرے کی چھت پر چڑھنے کے جتن کر رہی تھی۔کونے میں دیوار سے کچھ باہر کو ابھری اینٹیں اوپر تک جاتی تھیں۔وہ بمشکل ان پر پاؤں رکھ پائی تھی۔اوپر کی دو اینٹوں کو پکڑ کر نیچے پاؤں رکھنا پھر اوپر کی طرف جانا اس کے لئے مشکل تھا۔چوتھی کوشش پر وہ بری طرح گری۔دروازے سے اندر آتے گل شیر دوڑ کر اس کی جانب آئے۔

"ہائے میری بچی"شفیق آواز۔

"اٹھو لڑکی اور اندر دفع ہو۔"

کرخت آواز پر وہ چونکی۔خواب ختم ہو چکا تھا۔اب حقیقت کا دور آپہنچا تھا جہاں تھامنے یا اٹھانے کو کوئی نہیں تھا جہاں گر کر خود اٹھنا تھا۔وہ ہاتھ جھاڑتی اٹھی۔داخلی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی لمبی راہداری دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔اس نے زنان خانے کا رخ کیا۔زنان خانے پہنچی تو سب سے پہلے اس کا سامنا تخت پر بیٹھی بی بی سرکار سے ہوا۔جن کی متورم آنکھیں بیتے کل کی داستان سنا رہی تھیں۔انہوں نے نخوت سے اسے دیکھا۔سر تا پاؤں اسے دیکھتی وہ پہچان گئیں کہ یہ لڑکی جرگے کا فیصلہ ہے۔

"خجستہ۔۔۔ارے او خجستہ۔۔۔"!

وہ اسے نظر انداز کیے چلائیں۔ اگلے ہی پل درمیانی عمر کی عورت وہاں دوڑی چلی آئی۔ ایک نظر اسے دیکھا پھر تند ہی سے بی بی سرکار کو۔

"اس کا برقع اتروا اور اسے اس کی رہائش گاہ دکھا۔ یہ مجھے حویلی کے کسی کمرے میں نظر نہ آئے۔ روبینہ کو بھیج میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" انہوں نے اسے سرے سے نظر انداز کیے رکھا مگر وہ جانتی تھی اسی کی بات ہو رہی ہے۔ روبینہ غالباً حویلی کی کوئی ملازمہ ہی تھی۔

"چلو آو میرے ساتھ۔"

خجستہ کا لہجہ عام اور نرم تھا۔ اسے کچھ حوصلہ ملا تبھی بی بی جان کی چنگاڑتی آواز سنائی دی۔

"مہمان آئی ہے یہ جو اتنی محبت برت رہی ہے تو؟"

ان کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔ خجستہ گڑبڑائی۔

"معافی بی بی سرکار۔۔۔" انہوں نے ہاتھ جھلایا تو وہ اس کی جانب پلٹی۔ "چل لڑکی"

زینی کے دل میں جو موہم امید جاگی وہ اسی لمحے ختم ہو گئی۔ یہاں تو سب حکم کے غلام تھے۔ خجستہ کی راہنمائی میں چلتی وہ لمبی راہداری کے کونے میں بنے کمرے کے سامنے آ رکی۔ خجستہ نے مڑ کر اسے دیکھا پھر کنڈی کھول دی۔ ہاتھ مارا تو دروازہ کھلتا گیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ اسکا دل ڈوب کر ابھرا۔ آزمائشوں کے سفر کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس نے جی کڑا لیا۔ اب چاہے آر ہو یا پار۔ رہنا تو یہیں تھا اور اپنی غلطی کا کفارا ادا کرنا تھا وہ غلطی جو اس سے سرزد ہو گئی تھی۔ سفیر کو قتل کرنے کی غلطی۔ ہاں گناہ وہ تب ہوتا جب اس نے ناحق اسے مارا ہوتا مگر اب تو محض یہ غلطی ہی تھی۔

"آج سے تم یہیں رہو گی۔"

وہ ارد گرد دیکھتی اب خاصے نرم لہجے میں گویا ہوئی۔شاید وہ دیکھ رہی تھی کہ آس پاس کوئی ہے یا نہیں تبھی کسی کو نہ پا کر اس کا لہجہ نرم ہوا تھا جو شاید اس لہجے کا خاصا تھا۔

"اندھیرا بہت ہے تم رہ لو گی؟"

جانے سے پہلے وہ مڑی تھی اور کسی خدشے کے زیر اثر اسے دیکھا۔وہ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔خجستہ نے گہرا سانس بھرا۔

"نہ بھی رہ پاؤ تب بھی عادت ڈال لینا۔"

وہ گہرا سانس بھرے رہ گئی۔خجستہ اب پل، پل دور جاتی نظر آ رہی تھی۔اس نے سر جھٹکا اور اندر چلی آئی۔کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔اس نے آنکھوں کو جھپک، جھپک کر خود کو ماحول کا عادی کرنا چاہا۔کمرے میں اوپر واحد روشن دان تھا۔جس سے روشنی چھن، چھن کر اندر آ رہی تھی۔واحد وہی روشنی تھی جو اس جگہ کو تاریک نہیں ہونے دے رہی تھی۔اس نے اب کمرے کا جائزہ لیا۔کمرے میں کچھ پرانا ساز و سامان تھا۔ٹوٹا، پھوٹا سامان جو کاٹھ کباڑ تھا اور ان سب کے بیچ شاید وہ خود بھی۔اس نے برقع اتارا اور ایک ٹوٹی کرسی پر رکھ دیا۔گلے میں ڈالا بڑا سا دوپٹہ اتار کر سر پر لیا۔وہ ابھی پورے کمرے میں گھومنے ہی والی تھی کہ اسے چوکھٹ پر آہٹ کا احساس ہوا۔فوراً چہرہ ڈھانپ کر مڑی تو دروازے پر کوئی عورت کھڑی رہی۔تندہی سے اسے گھورتی وہ زینی کو عجیب سی لگی۔

"چل لڑکی"

وہ تیز لہجے میں بولی۔زینی نے حیرانی سے اسے دیکھا اس سے پہلے وہ اس کے کہنے پر عمل کرتی وہ عورت تیزی سے اس کے پاس آئی اور اسے بازو سے پکڑا۔گرفت اتنی مظبوط تھی کہ اس زینی کی جان نکلنے لگی۔وہ سخت انگلیاں بازو کی جلد میں گھستی معلوم ہو رہی تھیں۔وہ سسکی۔مگر شاید وہ عورت بے حس تھی۔اسے بازو سے پکڑے ہی گھسیٹتی باہر نکلی۔زینی کے صبر کی انتہا ہو گئی۔اس نے خود کو چھڑوانے کی بھرپور کوشش کی۔جب کوشش ناکام ہوتی نظر

آئی تو جھک کر روبینہ کے بازو میں دانت گاڑ دیے۔ نقاب اتر گیا تھا۔ دوسری جانب روبینہ بلبلا کر دور ہٹی پھر بازو کی سرخ ہوتی جلد کو مسلنے لگی۔

"منحوس۔"

روبینہ غصے سے بولی۔ روبینہ کو اپنی جانب پر تولتا دیکھ کر زینی کے پاؤں میں برق رفتاری آگئی۔ اگلے ہی لمحے وہ دوڑی۔ لمبی راہدری میں وہ پیچھے دیکھ بنا دوڑتی جا رہی تھی۔ راہدری کے سرے پر مڑی تو مقابل سے زور دار ٹکر ہوئی۔ اگلے ہی لمحے وہ گرتے، گرتے سنبھلی۔

☆☆☆☆☆

برگد کا درخت خاموش تھا۔ پرندے اداس تھے ہر شے پر ایسی تاریکی پھیل رہی تھی کہ الامان۔ اداس شام کا حصہ بننے پر ہر شے اداس نظر آ رہی تھی برگد کے سائے تلے بیٹھے گل شیر خاموش تھے۔ نظریں غیر مرئی نقطے پر جما رکھی تھیں۔ لب سختی سے آپس میں پیوست اور آنکھیں خاموش تھیں یوں جیسے کوئی لٹا ہوا جواری ہو، بے سازو سامان مسافر ہو، یا دکھ کی کوئی گہری المناک داستان ہو۔ وقت جیسے رک گیا تھا، اور یوں لگتا تھا کہ جہاں زینی سب چھوڑ گئی ہے وہیں سب کچھ رک گیا ہے، وہ وقت، وہ سماں، وہ گھڑی۔ کونے میں اٹاری کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے زمین پر سر جھکائے بیٹھا مرتضی خاموش تھا۔ زخموں سے خون رسنا بند ہو گیا تھا مگر ایسے لگ رہا تھا کہ اب کی بار زخم روح پر لگایا گیا ہے اور یوں جیسے دل پر تیز دھار چھری چلائی جا رہی ہوں جس میں برچھی کی کاٹ تھی جو اس کی روح کو تار، تار کر رہی تھی۔ دل میں حد سے زیادہ غم اور دکھ تھا۔ شدتِ غم سے کلیجہ منہ کو آنے والا تھا۔ حالت بتا رہی تھی کہ مسافر سب لٹا آیا ہے۔

رومانہ کی حالت بھی ان سے مختلف نہ تھی جب کہ قمر شام کا گیا اب تک لوٹ کر واپس نہیں آیا تھا رومانہ کو قمر کا غم بھی کھائے جا رہا تھا۔ کبھی دل میں آتا کہ مرتضی سے کہے قمر کو ڈھونڈ لائے مگر مرتضی کی حالت دیکھ کر وہ کہہ نہ

پائی۔ نا جانے قمر کہاں تھا؟ اور کس حال میں تھا؟ انہیں زینی کے ساتھ، ساتھ قمر کا غم بھی ڈستا جا رہا تھا۔ کچھ پل یونہی صرف ہو گئے اور پھر گل شیر گھٹنوں پر ہاتھ جمائے بمشکل اٹھے۔ لڑکھڑاتے ہوئے وہ مرتضی کی جانب چلے آئے۔ مرتضی نے سر اٹھا کر خالی نظروں سے انہیں دیکھا پھر سر دوبارہ واپس گرا لیا۔ مرتضی کی حالت دیکھ کر گل شیر کا دل بھر آیا وہ اس کے ساتھ ہی زمین پر بیٹھتے چلے گئے۔

چند پل یونہی خاموشی سے گزر گئے۔ پھر مرتضی کو گل شیر کی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔۔۔ مجھے معاف کر دو، مجھے کچھ سجھائی نہ دیا، تمہاری قربانی میں نہیں دے سکتا تھا اور اس کی قربانی میں نے بہت بھرے دل سے دی ہے، میں خود کو اس کے لیے کبھی معاف نہیں کر سکتا، جسے دل میں رکھنے، جسے زندگی بھر محبت دینے کا وعدہ میں نے خود سے کیا تھا، اس وعدے کو پورا نہ کرنے پر جتنا دکھ مجھے ہے۔۔۔ تم سوچ نہیں سکتے۔ میں۔۔۔ میں وہ بد قسمت باپ ہوں جس نے اپنی ایک اولاد کو بچانے کیلئے دوسری کی قربانی دے دی اور میں اس معاملے میں بڑا بے بس نکلا۔ "

آواز میں آنسوؤں کی آمیزش ہو چکی تھی۔ مرتضی بس خاموشی سے انہیں سن رہا تھا۔ اس نے کچھ بولنا ضروری خیال نہ کیا۔ گل شیر بولتے جا رہے تھے اور اسے ہر شے بتاتے جا رہے تھے۔ وہ اس سے اپنی مجبوری کا رونا رو رہے تھے، مرتضی کا دل پسجا۔ ہر کوئی اپنی جگہ مجبور تھا۔ ہر کوئی اپنی مجبوری میں اتنا مجبور تھا کہ اگلے بندے کو لاچار اور بے بس بنا کر بھی مجبور ہی رہتا تھا۔

گل شیر بولنے کے بعد خاموش ہوئے کچھ پل مرتضی کے بولنے کا انتظار کرتے رہے مگر جب وہ کچھ نہ بولا تو اٹھ گئے۔ ان کے جانے کے بعد مرتضیٰ نے اپنا سر اٹھایا۔ دھندلی آنکھوں کے پار اس نے بوڑھے گل شیر کو چوکھٹ پار کرتے دیکھا۔ پھر یاسیت سے سر واپس گھٹنوں میں گرا دیا۔

☆☆☆☆☆

اسے آئی جی صاحب کا فون آیا تھا۔ڈرگ سمگلنگ اور لڑکیوں کی تسکری والے کیس میں اہم پیش رفت سامنے آئی تھی جس کے سبب اسے فوراًاسلام آباد کے لئے نکلنا پڑا تھا۔اس وقت فرض سر پر سوار ہو چکا تھا۔فرض کے سامنے وہ یہ بھی بھول گیا کہ کل اس کی زندگی میں کیسا سیاہ دن آیا تھا اور بدلے میں اس نے کسے کھویا تھا اور آج اس کی زندگی میں کس نئے فرد کا اضافہ ہوا تھا؟ایس ایس پی بہرام خان کو یاد تھا تو بس یہی کہ فرض نے اسے للکارا ہے اور فرض کی للکار سے زیادہ اہم اس کے لئے کچھ نہیں تھا۔خود اس کی اپنی ذات بھی نہیں۔اپنا مختصر سامان لئے وہ بغیر اطلاع دیے جا چکا تھا۔شام ڈھلے آغا جان کو اس کی غیر موجودگی کا علم ہوا تو انھیں گمان ہوا کہ شاید وہ ناراض ہو کر گیا ہے۔اور یہی حویلی کے باقی لوگوں کو لگ رہا تھا کہ وہ خفا ہو کر گیا ہے اور اب کی بار جلد لوٹ کر نہیں آئے گا۔

☆☆☆☆☆

زوردار تصادم کے نتیجے میں وہ بمشکل گرتے، گرتے سنبھلی۔پھر نظریں اٹھا کر دیکھا تو تقریباً تئیس سال کی خوبصورت لڑکی سامنے کھڑی حیرانی سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

کشف حیرانی سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی جو اس سے بھی زیادہ حیران نظر آ رہی تھی۔عام سا لباس پہنے وہ خوبصورت سی لڑکی اسے آج پہلی مرتبہ اس حویلی میں نظر آئی تھی۔کون تھی وہ؟کشف اس سے پوچھنا چاہتی تھی مگر وہ بار، بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی۔روبینہ کو پاس آتا دیکھ کر وہ اس کے پیچھے چھپنے لگی۔

" مجھے بچالیں۔۔۔خدارا مجھے بچالیں۔یہ عورت میری دشمن بنی ہوئی ہے۔مجھے نہیں معلوم کیوں؟لیکن یہ پاگلوں کی طرح میرے پیچھے پڑ چکی ہے۔"

وہ خوف اور غصے کے ملے جلے امتزاج سے بولتی اس کے پیچھے سمٹی جا رہی تھی۔کشف اس کے مسلسل بولنے پر بوکھلا گئی۔

"دیکھیں آپ سیدھی کھڑی ہوں اور اب بتائیں کیا ہوا ہے؟"

تب تک روبینہ بھی وہاں پہنچ چکی تھی۔ہانپتی کانپتی روبینہ نے رک کر سانس بحال کی۔پھر سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

"آپ اسے چھوڑ دیں یہ لڑکی ونی ہے۔اس کی جان تو میں اپنے ہاتھوں سے لونگی۔آپ کو نہیں معلوم بی بی جی یہ کتنی چلاک ہے۔"

روبینہ تیکھے لہجے میں بول رہی تھی۔زینی نے غصے سے اسے دیکھا۔نا جانے وہ اس سے کون سے بدلے لے رہی تھی؟کشف نے اچھنبے سے اسے دیکھا۔پھر سمجھتے ہی تلخی سے مسکرائی۔

"روبینہ جائیں یہاں سے۔"

وہ متوازن لہجے میں بولی۔روبینہ پاؤں پٹختی وہاں سے چلی گئی۔کشف نے اسے جاتے دیکھا پھر رخ موڑ کر اپنے پیچھے چھپی زینی کو دیکھا۔وہ مرتضیٰ کی بہن تھی۔خوبصورت کیسے نہ ہوتی؟مگر جس بات نے کشف کو حد سے زیادہ پریشان کیا وہ اس لڑکی کی کم عمری تھی۔وہ کتنی چھوٹی اور لاابالی سی لڑکی تھی۔آنکھوں میں چمکتے وہ جگنو اور امیدوں کے دیے۔وہ تو شاید لفظ ونی کی حقیقت سے بھی آشنا نہیں تھی۔مرتضیٰ کتنا اچھا تھا تو کیسے اس نے گوارا کر لیا کہ اس کی چھوٹی سی بہن ونی ہو جائے؟کشف کا سر چکرا رہا تھا۔زینی اس کی پل،پل بدلتی حالت کو دیکھے پریشان ہو گئی۔کشف نے جب زینی کو پریشان دیکھا تو فوراً خود کو سنبھالا۔وہ اس ننھی لڑکی کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"کیا نام ہے آپ کا؟"

وہ نرم لہجے میں بولی تو زینی چونکی۔"کیا اس حویلی میں نرم لہجے میں بات کرنے والے لوگ بھی ہیں؟"اس نے دل ہی دل میں سوچا۔پھر نظر کشف پر گئی جو شاید اس کے جواب کی منتظر تھی۔ایک دم ہی اسے جرگے میں کھلنے والی حقیقت دوبارہ یاد آئی۔اس کا دل ڈوبا۔

"میرا نام زینش ہے۔پیار سے سب زینی کہتے ہیں۔"

کشف کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

"مرتضیٰ بھی آپکو یہی بولتے ہیں؟"

زینی نے گہرا سانس بھرا۔پھر نم آنکھیں صاف کیں۔مرتضیٰ کے ذکر پر گھر یاد آگیا تھا۔وہ اس حویلی میں آتو گئی تھی مگر یہاں سب کے دل تاریک تھے۔

"وہ پیار سے گڑیا اور عام انداز میں زینی ہی کہتے تھے۔"

کشف چند پل خاموشی سے اسے دیکھتی رہی پھر سر جھٹکا۔

"کیا عمر ہے آپکی؟"

"میں کچھ دن تک سولہ برس کی ہو جاؤں گی۔"

اس بات پر وہ یوں چوڑی ہوئی جیسے کچھ روز بعد سولہ کی نہیں بیس کی ہونے والی ہے۔کشف کو اس کے معصوم انداز پر جہاں ہنسی آئی وہاں اس کی کم عمری نے پریشان کیا۔وہ لاابالی سی لڑکی کتنی شوخ اور چنچل تھی۔کیا حویلی والے اسے ایسا ہی رہنے دیں گے؟کشف نے دکھ سے سوچا۔پھر گہرا سانس خارج کیا۔اسی لمحے وہ خود سے وعدہ کر چکی تھی کہ خواہ جو بھی ہو وہ مرتضیٰ کی بہن کا خیال خود سے بڑھ کر رکھے گی شاید تب ہی وہ کسی حد تک اس محبت کا حق ادا کر پائے۔

"اب کہاں جا رہی تھیں آپ؟"

چند پل یونہی خاموشی کی نظر ہو گئے جب کشف کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

"ناجانے کہاں؟مجھے تو یہ عورت لے کر جا رہی تھیں۔"

اس نے پیچھے کی جانب اشارہ کیا تو کشف حیرانی سے مڑی۔پیچھے کھڑی روبینہ زبردستی مسکرائی۔

"وہ بی بی سرکار بلا رہی ہیں اسے۔"

اس نے ہاتھ ہلاتے ہوئے یوں اشارہ دیا جیسے بی بی سرکار کا کمرہ ساتھ ہی موجود ہو۔ کشف نے سر اثبات میں ہلایا۔ پھر مڑ کر زینی کو دیکھا۔

"ہمارا تعارف پھر کبھی صحیح۔ خیال سے جایئے گا۔ کوئی بھی مسئلہ ہو تو ہمیں بتایئے گا۔"

اس بات پر اس نے باقاعدہ مڑ کر روبینہ کی جانب دیکھا جہاں روبینہ سٹپٹائی۔ وہیں زینی نے اپنی بے ساختہ امڈ آنے والی مسکراہٹ دبائی۔ سر اثبات میں ہلاتی وہ روبینہ کے پیچھے چل دی۔ کشف خاموشی سے کھڑی اسے راہداری میں پل، پل خود سے دور جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب چاہے کچھ بھی ہو اسے ہر صورت میں زینی کی حفاظت کرنی ہے۔ زیادہ نہ سہی، تو کچھ ہی صحیح مگر مرتضی سے محبت کا قرض ادا کرنا ہے۔

☆☆☆☆☆

خاموش صبح حویلی پر اتری۔ صبح کچھ غیر معمولی تھی۔ حویلی کے ملازم حیرانی سے اونچی فصیل پر جمع کبوتر دیکھ رہے تھے۔ یہ کبوتر آج پہلی مرتبہ یہاں آئے تھے اور جب سے آئے تھے گردن اٹھا، اٹھا کر ارد گرد دیکھنے میں مگن تھے۔ بخش کو اٹر سے نکلا تو ملازموں کو سر اٹھائے حویلی کی اونچی فصیل کی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔ ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو وہاں لاتعداد کبوتر تھے۔

"کیا کر رہے ہو؟"

بخش حاکمانہ اور تیز انداز میں بولا تو تمام ملازم چونکے۔

"وہ۔۔۔ کبوتر"

مالی نے کبوتروں کی جانب اشارہ کیا۔

"پہلے کبھی نہیں دیکھتے؟ کام کرو سب اپنا۔"

وہ غصے سے بولتا مردان خانے کی جانب بڑھ گیا۔

" ہاں کام کرو بابا۔۔۔شاید آج کے دن کے لئے ہی آبیٹھے ہوں۔"

ایک ملازم اپنے کام کو لگتا تیزی سے بولا تھا۔مالی نے گہرا سانس بھرا۔

" یہ بھی ہے۔"

کندھے اچکائے وہ بھی اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ مگر وہ کیا جانیں کہ اب تو کبوتروں نے اس حویلی کا راستہ دیکھ لیا تھا۔اب تو روز وہ یہیں پائے جائیں گے۔ کئی بار انسانوں سے زیادہ گہرا تعلق پرندوں، جانوروں سے ہوتا ہے۔ایک بار دانہ کیا ڈال لو یہ عمر بھر کو آپ کے مانو وفادار بن جاتے ہیں۔ پھر چاہے آپ کہیں بھی چلے جاؤ آپ کی خاک چھانتے، چھانتے آپ کے پیچھے آجائیں گے۔

روشن دان سے باہر جھانکتی زینی نے سر جھٹکا اور گہرا سانس بھرا۔وہ یہاں سے اس فصیل کو دیکھ سکتی تھی جس پر اس کے دوست آبیٹھے تھے۔اس کا جی چاہا ان کے پاس جائے انھیں خود پر بیتا سب سنا دے۔ دو روز پہلے تک زندگی کیا تھی؟ اور اب؟ اتنا بدل گئی تھی کہ سوچا بھی نہیں تھا۔حویلی میں کل سے اسے کسی نے ہاتھ بی شک نہیں لگایا تھا مگر طنز اور طعنے اس کا دل دکھانے کو کافی تھے۔اس کے گھر والوں کے لئے طرح، طرح کی باتیں کی جارہی تھیں مگر وہ خاموش تھی وہ انھیں کیا کہہ سکتی تھی بھلا۔اس معاملے میں وہ کل سے خود کو بے بس ہی محسوس کر رہی تھی۔ کون جانے آنے والا وقت اپنی جھولی میں کیا، کیا چھپائے ہے؟

☆☆☆☆☆

یونیورسٹی میں معمول کا ہنگامہ تھا۔وہی روز بروز کی چہل پہل۔ طالبات اپنے، اپنے پسندیدہ کاموں میں مشغول تھے، کچھ کو زعیم اور صائم نامی بلا کی غیر موجودگی سکون دیے ہوئے تھی۔

ایسے میں کیفے ٹیریا کا ماحول بھی آج خاصا خوش گوار تھا۔ سامنے کی جانب لگے چوتھے بینچ پر بالآخر اسے وہ بیٹھی نظر آئی۔ سر جھکائے گلاس میں سٹر اہلاتی وہ خاموش بیٹھی باہر کی جانب دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں اداسی اور بے زاریت واضح تھی۔ وہ اپنا بیگ سنبھالتی اس کی جانب چلی آئی۔ اگلے دو منٹ میں وہ اس کے سامنے تھی۔ اس نے سر اٹھا کر پاس کھڑی صفا کو دیکھا پھر ہلکا سا مسکرائی۔

" میں یہاں بیٹھ جاؤں؟"

صفا نے رسمی مسکراہٹ چہرے پر سجائی۔ تانیہ نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ کرسی گھسیٹتی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

" کیسی ہو؟"

اس نے بیگ میز پر رکھتے ہوئے پوچھنا ضروری سمجھا۔

"بس ٹھیک ہی ہوں۔ زعیم کے بغیر دل نہیں لگتا۔"

آخر میں وہ قدرے دھیمی آواز میں بڑبڑائی اور سٹر اگلاس میں گھمانے لگی۔ صفا خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا کام آسان ہو چکا تھا وہ جو پوچھنا چاہ رہی تھی خود تانیہ اس مدعے پر آ پہنچی تھی۔ صفا نے چہرے پر پریشانی سجائی اور میز پر قدرے آگے بازو ٹکا کر بیٹھی۔ ہتھیلی پر ٹھوڑی جمائے وہ دلچسپی سے تانیہ کی جانب دیکھنے لگی۔

"خیریت ہے زعیم اور صائم پچھلے تین روز سے یونیورسٹی نہیں آ رہے؟ میرا مطلب ہے کہ خیریت تو ہے نا؟"

تانیہ کے گھورنے پر اس نے جلدی سے بات مکمل کی۔ اس کے بات مکمل کرنے پر تانیہ کچھ پرسکون نظر آئی پھر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

"کہاں یار؟ زعیم کے فرسٹ کزن کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ قتل تھا۔"

اس کی بات پر صفا چونکی۔ چہرے پر واضح حیرانی نظر آئی حیرانی کے ساتھ، ساتھ اب چہرے پر پریشانی بھی جگہ لے چکی تھی۔

"کیا قتل؟اس کی کسی سے دشمنی تھی کیا؟

اس نے حیرانی سے پوچھا۔تانیہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"ہو بھی سکتی ہے۔۔۔جب اتنی بڑی حویلی ہو اور باپ دادا پورے گاؤں کا فیصلہ کرتے ہوں تو کہیں نہ کہیں دشمن نکل ہی آتے ہیں۔"

وہ بے نیازی سے کندھے اچکاتے بولی۔صفا چونکی۔

"کیسے فیصلے؟"

تانیہ نے اسے گھورا۔وہ اب اکتا گئی تھی۔یہ سوال وجواب کا سلسلہ۔

" وہ پٹھان ہیں نا۔۔۔ان کے ہاں جرگے کا فیصلہ زعیم کے دادا وغیرہ کرتے ہیں۔یہ وہاں کا اصول ہوتا ہے کہ سردار فیصلہ کرتا ہے۔"

تانیہ نے بات مکمل کی پھر مزید کسی سوال سے بچنے کو خود ہی اس جگہ سے اٹھی بیگ سنبھالا اور باہر کو چل دی۔صفا خاموشی سے اس کی پشت تک رہی تھی۔

وہ پٹھان لگتے تو نہیں تھے پھر کیسے؟صفا نے انھیں ہمیشہ شرٹ پینٹ میں دیکھا تھا،خود کو شہر کے حلیے میں ڈھالے وہ کہیں سے پٹھان نہیں لگتے تھے۔اور ان کے لہجے بھی عام تھے۔یعنی ہماری ذات پات میں کتنا فرق ہے؟اس نے دل ہی دل میں سوچا۔پھر کانوں کو ہاتھ لگایا۔چہرہ خفت سے سرخ ہو رہا تھا۔"توبہ یہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔"

گال ہاتھوں سے تھپتھپاتی وہ تیزی سے بیگ سنبھالتی وہاں سے اٹھی۔مروا اسے ڈھونڈھ رہی ہو گی۔عین ممکن تھا کہ اسے نہ پا کر شاید رو بھی رہی ہو۔

☆☆☆☆☆

ناشتے سے لے کر برتن دھونے اور پھر دوپہر کا کھانا تیار کرنے سے لے کر کھانا لگانے اور برتن دھونے ہیں پھر صفائی کرنے اور شام کا کھانا تیار کرنے اور برتن لگانے پھر انھیں دھونے، غرض ہر کام کی ذمہ داری جیسے زینی کو ہی سونپ دی گئی تھی۔ زینی کو یوں لگ رہا تھا جیسے ساری حویلی کا کام اسے سونپ دیا گیا ہو۔ اوپر سے روبینہ ایسے اس پر حکم چلا رہی تھی جیسے مالکن بی بی سرکار نہیں وہ خود ہے۔ کشف اس معاملے میں بے بس تھی۔ وہ اسے مار، پیٹ اور ڈانٹ، ڈپٹ سے بچا سکتی تھی مگر وہ اسے اس طرف سے بچا نہیں سکتی تھی کیونکہ اگر وہ ایسا کرتی تو اسے بی بی جان کی جانب سے سختی کا سامنا کرنا پڑتا اور ایسا وہ نہیں چاہتی تھی کہ جو تھوڑا بہت اسے مار سے بچانے کا موقع ہے وہ بھی ہاتھ سے گنوا دے۔

زینی چونکہ یہ تمام کام کرنے کی عادی تھی اس لئے اسے کوئی مشکل پیش نہیں آ رہی تھی مگر اتنے لوگوں کا کھانا تیار کرنا اور اپنے برتن دھونا اس کے لئے مشکل تھا بڑے، بڑے پتیلوں میں چمچے ہلا، ہلا کر اس کے ہاتھوں پر چھالے پڑنے لگے تھے اور سارا دن کھڑے رہنے کے باعث کے پاؤں پر ابلے پڑ رہے تھے۔

رنگت بھی زرد پڑ رہی تھی۔ چار دن سے بلاناغہ کام کرنے اور چند گھنٹوں کا آرام لینے کے باعث اسے پورے جسم میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا مگر وہ اپنی حالت بتاتی بھی تو کسے؟ اس وقت بھی وہ درد سے چور ہوتے بدن سمیت رسوئی میں کھڑی تھی۔ آج گوشت تیار کیا جا رہا تھا روبینہ رسوئی میں نہیں تھی تبھی خجستہ اس کی مدد کر رہی تھیں ورنہ روبینہ کی موجودگی میں ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ ان چار دنوں میں اس نے خجستہ کا رویہ اپنے ساتھ بہت ہی بھلا پایا اور روبینہ اس سے ایسے کام لیتی ہیں جیسے وہ روبینہ کی زر خرید ملازمہ ہو۔ خجستہ سمیت حویلی کے باقی لوگ جتنا حیران ہوتے کم تھا۔ وہ اتنی کم عمر میں بھی ہر کام نفاست سے کرنا جانتی تھی اور اس کے ہاتھ میں ذائقہ تھا۔ بی بی جان نے بہت کوشش کی کہ اس کے پکائے کھانے میں کوئی نقص نکال سکیں مگر ایسا نہ کر پائیں۔ دوسری جانب

روبینہ کے سر پر لگی تلوں پر بجھی تھی۔اس سے یہ بات ہضم ہی نہیں ہو پا رہی تھی کہ کل کی آئی لڑکی جو کہ ونی تھی۔وہ ملازمہ سے بہتر کھانا پکا رہی تھی۔روبینہ کو اپنی نوکری خطرے میں جاتی محسوس ہو رہی تھی۔

جب زینی کھانا لگانے میز پر گئی تو روبینہ خاموشی سے رسوئی میں داخل ہوئی۔رسوئی میں اس وقت کوئی نہ تھا۔وہ چولہے کے پاس آئی۔ارد گرد دیکھا۔پھر چولہے پر پڑے پتیلے کا ڈھکن ہٹایا۔گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو پوری رسوئی میں پھیلی ہوئی تھی اور ڈھکن ہٹانے کی دیر تھی گوشت کی دلفریب خوشبو اس کے ناک کے نتھنوں سے ٹکرائی۔اس نے سر جھٹکا پھر رسوئی کے دروازے کی جانب دیکھا۔کہیں کوئی آ ہی نہ جائے۔تیزی سے ہاتھ بڑھائے ساتھ پڑے مسالے کے ڈبے سے نمک مٹھی میں بھر کر سالن میں انڈیل دیا۔جلدی، جلدی چمچ سے ہلایا پھر ڈھکن واپس پتیلے پر دیے خاموشی سے جیسے آئی تھی ویسے ہی باہر نکل گئی۔

☆☆☆☆☆

دیدۂ گریاں

غموں کی ماری
وہ زمانے سے ہاری
صحرا میں بھٹکی
وہ آب آب کرتی
سناتی ہے راتوں کو
غم کی داستان ساری
آنکھوں سے بہاتی ہے
اشک کی صورت لڑی
قصہ مختصر ہنس مکھ لڑکی
بن گئی ہے غم کی المناک کہانی

☆☆☆☆☆

کھانے کے میز پر آغا جان کے بیٹھنے کی دیر تھی کہ خاموشی چھا گئی۔ اب کشف بھی اسی میز پر بیٹھنے لگی تھی کیوں کہ اب وہاں سفیر کی کرسی خالی ہو چکی تھی۔ سفیر سے جو پردہ تھا، اس کی موت کے بعد وہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ آغا جان

کے بیٹھنے اور اشارہ کرنے پر سب نے کھانا شروع کیا۔ چمچ، پلیٹ اور ڈھکن کے کھڑکنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔بی جان نے چاول پر گوشت کو فوقیت دی۔ کشف نے ان کے اشارے پر ڈونگے سے سالن ان کی پلیٹ میں منتقل کیا پھر صائم کو اشارہ دیا جس نے آغا جان کے روٹی لے لینے کے بعد ہاٹ پاٹ اٹھا کر کشف کی جانب بڑھا دیا۔ کشف نے گرما گرم روٹی نکال کر بی جان کی پلیٹ میں رکھ دی۔ گوشت کی خوشبو لذت بھری تھی۔باقی سب بھی اب اپنی اپنی پلیٹوں میں کھانا نکال رہے تھے۔نوالے توڑے جا رہے تھے۔

کونے میں کھڑی زینی سر جھکائے چہرہ ڈھانپے ہوئے تھی۔

وہ یہاں انھے ہر سامان مہیا کرنے کے لئے کھڑی تھی۔اسے ان کی جانب دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ تبھی چہرہ دوسری جانب موڑ رکھا تھا۔ گاہے بگاہے وہ رسوئی سے بار بار سر باہر نکال کر جھانکتی روبینہ کو دیکھ رہی تھی جس کے چہرے پر حیرت واضح تھی۔سب کو آرام سے کھانا کھاتا دیکھ کر اس کی حیرت زدہ شکل دیکھنے لائق تھی۔اس نے زینی کی جانب دیکھا تو زینی نے آنکھ مار دی۔روبینہ ناسمجھی سے اسے دیکھ رہی تھی۔اب یہ کیا تھا؟سب اتنے آرام سے کیسے کھا رہے تھے؟ بلکہ سب کے چہروں پر تو رغبت تھی وہ رغبت جو لذیذ چیز کو کھانے پر محسوس ہوتی ہے۔

اس نے دوبارہ گردن موڑ کر زینی کو دیکھا جو اب رسوئی میں

چلی آئی تھی۔زیرِلب مسکراتی وہ اب نقاب اتار چکی تھی۔ اتنے میں خجستہ بھی اندر چلی آئی۔زینی نے اسے دیکھا پھر ہلکا سا مسکرائی۔ خجستہ نہیں مسکرائی۔وہ یونہی کھڑی رہی۔اب بھلا روبینہ کے سامنے مسکرا کر اپنی شامت بلانا تھی۔بی جان کا بلاوا آیا تو روبینہ کو ہی مارے بندے جانا پڑا۔اس کے جانے کی دیر تھی زینی تیزی سے خجستہ کی طرف آئی۔

"بچ گئے۔"

اس کے چہرے کی مسکراہٹ دیکھے خجستہ تو اطمینان ملا۔اب کم از کم کشف سے اس کی کلاس تو نہیں لگے گی۔زینی خوش تو کشف بھی اس سے خوش۔

"چپ کر جاؤ لڑکی۔۔۔کام کرو۔"

خجستہ کی نظر دروازے پر پڑی تو لہجہ سخت ہو گیا۔زینی اس کا اشارہ سمجھ گئی۔

"معاف کر دیں۔"

دھیمی آواز میں کہتی وہ سلیب کی دوسری جانب بڑھ گئی۔صبور خانم کے جانے کے بعد زینی نے شکر کا کلمہ پڑھا ورنہ آج بے وجہ اسکی اور خجستہ کی عزت افزائی ہو جاتی۔

☆☆☆☆☆

سالن ڈونگے میں ڈالتے وقت اپنی عادت سے مجبور خجستہ نے چمچ سے سالن چکھا تو اسے لگا کسی نے اس کے منہ میں نمک کی کان الٹ دی ہے۔اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر نل چلایا۔

پانی حلق سے گزارا تو کچھ سکوں ملا۔گلہ مسلتے وہ میز پر ہاٹ پاٹ رکھنے گئی زینی کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

چند لمحے بعد زینی واپس آچکی تھی۔خجستہ تیزی سے آگے بڑھی اور اس کا ہاتھ تھامے اسے ہانڈی کے پاس لے آئی۔زینی نے خاموشی سے اسے دیکھا پھر ہانڈی کو۔آبرو اچکائے اس کا انداز سوالیہ تھا۔خجستہ کا جی چاہا سر پیٹ لے۔

"سالن خراب کیوں کر دیا؟نمک کی پوری کان اندر ڈال دی زینی۔"

وہ آنکھیں گھماتے ہوئے بول رہی تھی۔زینی نے نفی میں سر ہلایا۔تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے سالن چکھا تو اس کی حالت بھی خجستہ سے مختلف نہیں تھی۔

"یہ میں نے نہیں کیا۔"

اس نے گھبراہٹ پر قابو پایا۔وقت کم تھا اب کیا ہو سکتا تھا؟وہ پریشانی سے ٹہلنے لگی۔

"یہ کام تمہارا نہیں،میرا نہیں تو روبینہ کا ہی ہو گا۔مگر اس وقت یہ اہم نہیں ہے۔اگر کھانا نہ لگایا تو ہم دونوں کے ساتھ کیا ہو گا تم سوچ بھی نہیں سکتی۔"

خجستہ کی باتیں اس کا دل دہلانے لگیں لگیں مگر اسے ہمت نہیں ہارنا تھی۔اسکا ذہن کوئی بھولا بسرا درس یاد کرنے لگا۔ذہن دو سال پیچھے چلا گیا جب اسے کھانا پکانے کا نیا،نیا شوق آیا تھا۔تب اس نے شوق شوق میں سالن پکاتے ہوئے نمک کا آدھا ڈبہ ہانڈی میں خالی کر دیا تھا اسے نمک محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا۔بعد ازاں پھوپھی نے چمچ ہلایا تو زینی کو بھی یاد آیا کہ اس نے چمچ تو ہلایا ہی نہیں تھا۔نمک کیسے محسوس ہوتا اور پھر پھوپھی نے جو اس کی کی وہ ایک الگ کہانی تھی۔اس کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ آگئی۔خجستہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا تو وہ ہوش میں آئی۔جلدی سے آگے بڑھ کر فریج کھولی۔خجستہ خاموشی سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی پھر اکتا کر بول اٹھی۔

"ہمارے پاس وقت کم ہے۔۔۔تم کیا کر رہی ہو؟"

اسے آٹے کا گول سا پیڑا بناتے دیکھ وہ چڑ کر بولی۔

"چپ کریں نا۔۔۔ایک پرانی ترکیب ہے استعمال کر رہی ہوں امید ہے کام بن جائے گا۔"

اس نے پیڑا ہانڈی میں رکھا۔خجستہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"اب یہ کیا تھا؟"

وہ حیرانی سے بولی۔زینی نے مسکراہٹ دبا کر نفی میں سر ہلایا۔

"کمال ہے لڑکی حالات اتنے تشویش ناک ہیں اور تم ہنس رہی ہو۔"

"بات یہ ہے کہ آٹا اضافی نمک کو خود میں ضم کر لے گا۔جب نمک برابر ہو جائے گا تو ہم یہ آٹا نکال لیں گے۔"

اس نے وضاحت دی۔ خجستہ بے یقین نظر آتی تھی مگر پھر بھی مجبوراً اس کی بات مان لی اور وہی ہوا۔ نمک نہ صرف برابر ہوا تھا بلکہ سالن پہلے سے بڑھ کر لذیذ ہو گیا تھا۔ خجستہ اس چھوٹے پیک بڑے دھماکے کو سراہے بنا نہ رہ پائی۔ اس نے اپنی ہمت بھی ٹوٹنے نہیں دی بلکہ خجستہ کو بھی ساتھ ہی ساتھ حوصلہ دیا اور سارا معاملہ سلجھا لیا تھا۔

☆☆☆☆☆

وہ سفیر کی موت کے بعد سے حویلی میں ہی بند ہو کر رہ گئی تھی۔ کچھ ماحول کا تقاضا بھی یہی تھا مگر اتنے دن حویلی میں بند رہ، رہ کر اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ چند روز بعد اس کے امتحانات کا آغاز ہونے والا تھا۔ پرائیویٹ پڑھ تو لیا تھا مگر اب امتحان دینے امتحان گاہ جانا ہی مقصود تھا۔ آج کل وہ جی جان لگائے پڑھ رہی تھی۔ وہی امتحان سے قبل پڑھائی کو سر پر سوار کر لینے کی عادت سے مجبور طالبات۔

اس نے رات میں ہی بی جان سے اجازت طلب کر لی تھی اور اب ہر صورت اسے لائبریری جانا تھا کچھ اہم کتابوں کا حصول لائبریری سے ہی ممکن تھا۔ شام ڈھلتے ہی وہ زینی کو خجستہ کے سپرد کیے روبینہ کو لیے حویلی کے داخلی دروازے سے باہر نکلی۔ آج اٹھی نظریں کسی کی منتظر تھیں مگر اب وہ چہرہ دن بیت گئے تھے، نظر ہی نہیں آیا تھا۔ اس نے اداسی سے سر واپس گرایا تو حویلی کے خاموش پڑے لان، اونچی فصیل پر نظر آتا غروب ہوتا سورج، پرندے، پھول ہر شے اس کے ساتھ افسردہ نظر آنے لگی۔ اس نے کندھوں پر ڈالی شال برابر کی۔ کالے جوڑے میں خاکی شال اور چہرے کو دوپٹے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ روبینہ اس سے قبل ہی ڈرائیور کے پاس پہنچ کر اسے ہدایات دینے لگی تھی۔ وہ بے دلی سے چلتی گاڑی کے پاس آئی تو ڈرائیور نے فوراً سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

"بیٹھیں چھوٹی بی بی۔۔۔" عام لہجہ۔ اس کے ذہن کے کورے کاغذ پر کوئی تحریر ابھرنے لگی۔ سماعت میں میٹھی آواز جاگی۔

"تشریف رکھیں خانزادی صاحبہ۔۔!"

وہ ہوش میں آئی۔ چاشنی گھولتا لہجہ اب کہیں نہیں تھا۔ آس پاس تھا، تو سادہ سا، عام لہجہ اور جس لہجے کی اسے عادت تھی وہ لہجہ کہیں دور تھا۔ شاید پہنچ سے بھی دور۔ اس نے سر جھٹکا پھر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی حویلی سے باہر نکلی تو گہرا سانس بھرتی یاسیت سے سر کھڑکی سے ٹکا گئی۔ راستے آشنا سے تھے۔ منزل بھی وہی تھی مگر کئی بار ہمسفر کا ساتھ وہ واحد شے ہوتی ہے جو شناسا راستوں کی اور منزل کی خوبصورتی کو مزید بڑھا دیتی ہے۔ بہترین ہمسفر کا ہونا بھی نعمت ہے اور کھو جانا تو ناقابلِ بیان اذیت اور ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

اپنی سوچوں میں مگن اسے علم بھی نہیں ہوا کب سفر ختم ہوا اور ادھوری منزل آ پہنچی۔ پہلے یہاں پہنچتی تھی تو ہمیشہ باہر مرتضیٰ کو روک کر اندر جاتی۔ کتابیں لے کر واپس آتی تو دل سرشار ہوتا کہ باہر اس کے انتظار میں کھڑا شخص اس کی دن بھر کی تھکن اتار دینے کا سبب بنتا ہے مگر اب تو جیسے ہر شے بے کیف نظر آ رہی تھی۔

وہ لائبریری میں داخل ہوئی تو مکمل سناٹے نے اس کا استقبال کیا۔ شیلف میں اوپر سے نیچے تک ترتیب سے چنی کتابوں نے خاموشی سے اسے دیکھا۔ خود کو اپنے سرِ ورق کے لبادے میں چھپائے ڈھیروں ڈھیر کاغذات اتنی معلومات رکھتے تھے کہ جو کہیں کسی جگہ نہیں مل سکتی۔ یہ تو وہ کنواں ہے جس کا پانی کبھی خشک نہیں ہوتا تھا۔ وہ بے دلی سے چلتی آئی۔ ذہن میں کتابوں کے نام دہرائے۔

☆☆☆☆☆

وہ کسی نا کسی طریقے سے کشف سے بات کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ کئی روز سے وہ اس موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ واحد ایک کشف ہی ہے، جو اس کی مدد کر سکتی ہے۔ وہ روز حویلی سے کچھ فاصلے پر کھڑا رہتا تھا، اس امید کے ساتھ کہ اب کشف باہر نکلے گی مگر پچھلے کئی روز سے کشف کہیں باہر نہیں گئی تھی مگر آج تقدیر اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ بلا آخر تقدیر کو اس پر رحم آ ہی گیا وہ اس وقت بھی درخت کے سائے میں ستا رہا تھا، جب حویلی کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

جس طریقے سے گارڈز چوکنا ہو رہے تھے اور جیسے گارڈز کی گاڑیاں باہر نکل رہی تھیں، اسے علم ہو گیا کہ کشف ہی گاڑی میں موجود ہے۔ کیوں کہ حویلی کی عورتوں کو ایسے ہی نگرانی میں کہیں لے کر آیا اور جایا جاتا تھا۔ رہی کثر کھڑکی سے باہر جھانکتی کشف کی نقاب میں لپٹی اداس آنکھوں نے پوری کر دی۔ اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ یہ کشف ہی ہے اور وہ کہاں جا سکتی تھی یہ بات مرتضی سے بہتر کون جانتا تھا؟

وہ تیزی سے آگے بڑھا اور کچھ فاصلے پر چھپا کر کھڑی اپنی موٹر سائیکل پر جا بیٹھا۔ کچھ لمحے بعد ہی وہ موٹر سائیکل پر سوار دوسرے راستے سے ہوتے ہوئے لائبریری کی جانب جا رہا تھا۔ منزل اب دونوں کی ایک تھی۔ کوئی بعد میں اور کوئی پہلے پہنچنے والا تھا۔

☆☆☆☆☆

اپنی مطلوبہ کتابیں حاصل کرنے کے بعد وہ انہیں ایشو کروا کر باہر نکلی۔ ڈرائیور گاڑی سے کچھ فاصلے پر گارڈز کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ ان کا چہرہ دوسری جانب تھا تبھی وہ کشف کو باہر آتا نہیں دیکھ پائے اس سے پہلے کہ ان کی جانب بڑھتی کسی نے تیزی سے اس کا بازو پکڑے اسے بائیں جانب دیوار کی اوٹ میں کھینچا، کشف اس اچانک افتاد پر بوکھلا گئی۔ ہاتھ میں تھامی کتابیں بال بال گرتے بچیں۔ کچھ کو خود مرتضی نے گرنے سے بچایا۔ اگر شور ہوتا تو بخش اور گارڈز کا دھیان اس کی جانب مبذول ہو جاتا ایسا وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ کشف چیخ پاتی مرتضی نے تیزی سے منہ پر لپیٹا رومال اتارا۔ اس کا چہرہ دیکھے جہاں کشف کو حیرانی ہوئی، وہاں انجانی سی خوشی نے اسے گھیرے میں لے لیا۔ اتنے عرصے بعد محبوب کا دیدار اس کے لئے کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ وہ بے چینی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ مرتضی نے اسے یک ٹک اپنی جانب دیکھتے پایا تو گلا کھنکھارا اس کے گلا کھنکھارنے پر کشف ہوش میں آئی۔ فوراً نظروں کا زاویہ بدل ڈالا۔

"آپ؟"

وہ ہکلائی تھی اور کچھ حد تک شرما بھی رہی تھی یہ پہلی بار تھا کہ مرتضی نے اسے ہاتھ لگایا تھا۔

"یوں اس طرز بے ادبی پر معذرت۔۔۔ مگر آپ جانتی ہیں کہ میں مجبور تھا۔ ورنہ باخدا کبھی بھی ایسی بے ادبی کا سوچ نہیں سکتا تھا۔ خیر وقت کم ہے مگر بات لمبی ہے۔"

کشف بس خاموشی سے اسے سن رہی تھی اس کی موجودگی کو محسوس کر رہی تھی۔ اس کا پاس ہونا ہی کافی تھا۔ دلِ بے چین دل کو سکون مل رہا تھا۔ آنکھوں کو اس کی دید سے قرار نصیب ہوا تھا۔ دل جو پہلے بے کیف تھا اب ایک دم ہی موسم اور سب کچھ کھل اٹھا تھا، ساتھ ہی دل مسکرانے لگا تھا۔ مرتضی چند لمحے لب بھینچے اسے دیکھتا رہا پھر گہرا سانس خارج کیا۔

"کیا آپ بھی یہی سمجھتی ہیں کہ میں نے سفیر سائیں کو مارا ہے؟"

کشف نے دھیرے سے پلکیں اٹھائیں اور اس کے شفاف چہرے کی جانب دیکھا۔ نقاب تلے ہونٹ بے دردی سے کچلے۔ گلا تر کیے وہ بولنے کے قابل ہوئی۔

"دل کہتا ہے کہ اس بات پر یقین نہ کرو اور حالات کا تقاضہ ہے کہ کر لو مگر کیا کریں دل آڑے آجاتا ہے۔۔۔ نہ یقین کر پاتے ہیں، نہ بے یقین رہ پاتے ہیں۔ عجیب صورتحال سے دوچار ہیں۔"

ان گزرے دنوں میں جو بھی وہ محسوس کر رہی تھی من و عن اسے بتا دیا مرتضی اس کی جانب دیکھتا رہا پھر گہرا سانس لئے پیچھے ہٹا۔

"یعنی کہ آپ کو یقین ہے۔"

کشف نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا۔

"ہم نے ایسا تو نہیں کہا آپ ہمیں غلط سمجھ رہے ہیں۔"

وہ غلط فہمی کا شکار تھا اور وہ اسے غلط فہمی کا شکار نہیں رہنے دینا چاہتی تھی۔ اسی لیے تیزی سے بول اٹھی۔ چند لمحے مرتضی اسے یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں دیکھتا رہا۔

"خانزادی صاحبہ میرا آپ سے دوسرا سوال یہ ہے کہ میری بہن کیسی ہے؟ خدارا اچھی خبر سنایئے گا۔ یہ بات میں نے بہت ہمت کیے پوچھی ہے۔ مجھ میں اتنا ضبط نہیں تھا کہ یہ پوچھ پاؤں۔"

اس کا لہجہ ٹوٹا بکھرا تھا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کتنی تکلیف میں ہے۔

"محبت تو یہ ہے کہ محبوب کے محبوب کا بھی خیال رکھا جائے۔ بے فکر رہیں۔ ہم جتنا کر سکتے ہیں ہم کر رہے ہیں۔ ہم بہترین طریقے سے اس کا خیال رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں خجستہ کو ہم نے اسی کام پر مامور کیا ہے مگر ایک بات ہم سمجھ نہیں پائے مرتضی، آپ نے کیسے خود کو اجازت دے دی کہ آپ نے اپنی بہن کو ونی ہونے دیا؟"

جہاں اس کا جواب سنے مرتضی کو سکون محسوس ہوا وہیں اس کا کیا اگلا سوال تکلیف دہ تھا۔ اس کا انداز چھبتا نہیں تھا مگر سوال چھبتا ہوا تھا۔ مرتضی کے لیے نظریں ملانا دوبھر ہو گیا۔

"یہ جو محبت ہے یہ انسان کے بہت امتحان لیتی ہے خانزادی صاحبہ۔۔۔ آپ نہیں سمجھیں گی۔"

نفی میں سر ہلاتے وہ مڑنے والا تھا جب کشف نے تیزی سے اس کا بازو تھاما۔ اس کی آخری بات نے کشف کو تکلیف پہنچائی تھی۔ وہ کیسے نہیں سمجھ سکتی تھی، محبت تو نام ہی امتحان کا تھا۔ امتحان، امتحان اور بس امتحان۔ دوسری جانب مرتضی کیلئے بھی کشف کا یہ نیا انداز ایک دھچکا تھا اسے کشف سے اس بات کی امید نہ تھی کہ وہ اسے یوں روکے گی۔

"ہم سے بہتر کوئی سمجھ بھی نہیں سکتا، سنا آپ نے۔ یونہی آپ سے محبت کا دعوی نہیں کیا، ہر امتحان میں آپ کو پورا اتر کر دکھائیں گے یہ وعدہ ہے ہمارا آپ سے۔"

اسے یوں ہی گم سم چھوڑے اگلے ہی لمحے وہ اپنی کتابیں سنبھالے لائبریری کی سیڑھیاں اترنے لگی۔ اسے آتا دیکھ کر ڈرائیور تیزی سے گاڑی کی جانب بڑھا۔ اس کے دروازہ کھولنے سے پہلے روبینہ نے باہر نکل کر دروازہ کھولا۔ کشف نے تمام کتابیں روبینہ کی جانب بڑھا دیں جنہیں اس نے فوراً سے تھام کر اگلی سیٹ پر رکھ دیا۔ نقاب تلے کشف کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ دیدارِ یار روح تک کو سرشار کر گیا تھا۔

گاڑی کے چلنے سے قبل محض ایک بار مڑ کر کشف نے اس دیوار کی جانب دیکھا جس کی آڑ میں مرتضی کھڑا تھا۔ ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں ان دونوں کے درمیان حائل ہوئیں تو منظر بیک وقت خوبصورت اور ادھورا رہ گیا۔ تقدیر وقت اور قسمت مسکرا دیے۔ وادیِ عشق میں الہام قدم رکھ چکا تھا۔ وہاں محوِ رقص محبت الہام کو دیکھے جی جان سے مسکرا دی۔ منظر مکمل ہونے کو تھا۔ سماعت میں محبت کے خوبصورت بول چاشنی گھول رہے تھے۔ نیلی آنکھوں والی شہزادی اور خوبصورت قد کاٹھ کے ملازم پر محبت الہام کی صورت نازل ہونے لگی تھی۔ کشف کے میٹھے بولوں کا جادو جاگنے کو تھا، ایک پہلے ہی محبت میں ڈوبی ہوئی تھی اور دوسرا ڈوبنے کو تیار تھا۔

☆☆☆☆☆

کیس ختم ہوا اور انہیں کامیابی ملی۔ آئی جی صاحب نے اسے دفتر بلا کر دوبارہ سے چھٹیاں دے دیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بہرام صرف اور صرف کیس کی خاطر واپس آیا ہے۔ وہ سفیر کی موت سے آگاہ تھے۔ انہیں اس بات کا دکھ تھا کہ انہیں بہرام کو اتنی نازک صورتحال میں واپس بلانا پڑا مگر ان کی بھی مجبوری تھی۔ انہوں نے یہ بات جب بہرام سے کی تو بہرام کے زخم کھریدے گئے۔ کیس کی تفتیش میں مصروف رہ کر کافی حد تک اس نے خود کو سنبھالا ہوا تھا مگر اب آئی جی صاحب کے بات کرنے پر اسے لگا کہ سارے غم دوبارہ سے ہرے ہو گئے ہیں۔ آنکھیں شدتِ ضبط سے سرخ ہو گئیں تھی۔

ان سے اجازت لیے وہ تیزی سے باہر نکلا۔وہ کسی کے سامنے کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ اپنے فرض میں اتنا مگن تھا کہ اس کا دھیان اس جانب بہت کم جاتا تھا۔رات ہوتے ہی اس کی اور سفیر کی بچپن کی تمام یادیں اس کے سامنے آنے لگتیں۔اسے نئے سرے سے ملال آگھیرتا۔اس کی مغفرت کی دعائیں کرتے وہ رو پڑتا تھا۔کئی بار وہ نماز پڑھنے کے بعد جب سفیر کے حق میں دعا کرنے کو ہاتھ اٹھاتا تو زبان سے کوئی لفظ جاری ہی نہیں ہو پاتا تھا۔

پچھلے کئی روز سے اس کا جی چاہا کہ وہ اڑ کر سوات پہنچ جائے،اپنے بھائی کی قبر پہ جائے مگر وہ اپنی جگہ مجبور تھا لیکن اب ہر صورت وہ جلد سے جلد سوات پہنچنا چاہتا تھا۔

☆☆☆☆☆

گاڑی اونچے نیچے راستوں سے ہوتی اب سوات کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔موسم نے یکدم ہی تیور بدل لیا تھا۔خنک ہوائیں جاڑے کے کڑکڑاتے پتے،سنسان سڑک اور حزن و ملال میں گھرا اس کا دل،ہر شے اسے شریک غم محسوس ہو رہی تھی۔پانچ گھنٹے کی ڈرائیو چار گھنٹے میں مکمل کیے،بغیر اپنی تھکن کی پرواہ کیے،اس نے گاڑی قبرستان کو جاتے راستے پر ڈال دی۔دل ایک دم سے مزید افسردہ ہونے لگا۔پچھلی بار جب وہ سوات آیا تھا تو اس کا جی چاہتا تھا کہ سفیر کو راہ راست پر لے آئے مگر اس کی یہ خواہش ادھوری رہ گئی زندگی میں کچھ خواہشات ادھوری رہنے کے لئے کی جاتی ہیں،جو لاحاصل رہ کر نئے سرے سے اذیت میں دوچار کرتی رہتی ہیں۔

یاسیت سے سوچتے ہوئے اس نے گاڑی قبرستان کے باہر روک دی۔اس کا جی چاہا کہ کاش یہ سب سچ نہ ہوتا۔یہ ایک خواب ہوتا ایک ایسا برا خواب جس میں کوئی حقیقت نہ ہوتی مگر بھلا خواب اور حقیقت بھی کبھی ایک ہو پائے ہیں؟وہ گاڑی سے نکلا اور شال کو کندھوں پر اچھے سے لپیٹا۔جاڑے کے موسم کا آغاز ہونے کو تھا،ابھی سے ہوا کی خنکی ہڈیوں میں گھستی جا رہی تھی۔قدموں تلے کڑکڑاتے پتے روندھتا وہ قبرستان میں داخل ہوا۔ایک منجمد سا

احساس تھا جو دل و جان کو اپنے قابو میں کیے برف بناتا جا رہا تھا۔ قدموں میں پل بھر کو لغزش آئی۔ نظریں گھما کر اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔ بے شمار ایک سی قبریں تھیں۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ جب سب انسانوں کا مقدر ہی یہی تھا، جب سب کی حقیقت ہی فنا ہونا تھی تو کیوں لوگ ساری زندگی "میرا، تیرا" میں پڑے رہتے ہیں۔ اپنی امارت کا بول بالا کرتے رہتے ہیں۔ اس کا بھائی جس کی امارت اتنی بلند تھی، جس کا رتبہ اتنا بلند تھا، اب وہ بھی ان عام سی قبروں میں سے ایک میں آلیٹا تھا۔ قبر کی نشاندہی کرنے کو اس نے اپنے دماغ پر زور ڈالا تو یاد آیا کہ کونے میں درخت تلے دائیں ہاتھ پر اسے دفنایا گیا تھا۔ وہ دماغ کے نشاندہی کرنے پر اس جانب چلا آیا۔ گہرا سانس بھرے بلا آخر وہ اس قبر کو ڈھونڈ چکا تھا۔ ذہن کے پردوں پر بچپن کے مناظر دوڑنے لگے۔ جب بہرام باری دیتا تھا اور سفیر چھپتا تھا۔ وہ کتنی دیر چھپن چھپائی کھیلتے رہتے تھے۔ سفیر ہمیشہ ایسے چھپتا تھا کہ بہرام اسے مشکل سے ڈھونڈ پاتا تھا۔ پھر سفیر ہنس کر کہتا تھا۔ دیکھا لالہ اسے کہتے ہیں چھپنا کہ کوئی بھی نہ ڈھونڈ سکے، دیکھا کیسا چھپا آپ بھی نہیں ڈھونڈ سکے اور بہرام اس کے سلگانے پر سلگ کر رہ جاتا تھا مگر آج جب بہرام کا دل چاہ رہا تھا کہ چھپا ہوا سفیر ایک بار پھر سے باہر آ کر اسے سلگائے۔ آج وہ آوازیں دے رہا تھا۔ اسے کہہ رہا تھا کہ سفیر باہر آؤ میں ہار گیا ہوں مگر آج سفیر باہر نہیں آیا تھا۔ وہ اس بار چھپن چھپائی کے کھیل کو زیادہ ہی سنجیدہ لے گیا تھا۔

کتنے پل اس کی قبر کے پاس بیٹھ کے وہ اس کی قبر کی مٹی پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ اس مٹی کو ہاتھ لگاتے وہ عجیب کیفیات سے دوچار ہو رہا تھا۔ شام کے گہرے ہوتے سائے مزید گہرے ہو گئے تھے۔ ہوا کے سبب پتے جا بجا بکھرتے جا رہے تھے اور ان کی آوازوں کے سوا اس قبرستان میں کسی اور شے کی آواز نہیں تھی لیکن اس کے سوا قبرستان میں کچھ بچے موجود تھے جن کے ہاتھوں میں درختوں کی چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں تھیں۔ کچھ کے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے کٹورے تھے جن میں وہ پاس کے نلکے سے پانی بھرتے اور قبروں پر چھڑکتے جا رہے تھے۔ کچھ بچے پانی چھڑکنے پر مامور تھے تو کچھ ہر قبر پر ایک ایک ٹہنی رکھنے میں مصروف تھے۔ بہرام نے دیکھا کہ سفیر کی قبر کی مٹی

بھی خشک ہوئی تھی۔اس پر بھی شاید کافی عرصے سے پانی نہیں چھڑکا گیا تھا۔اس نے ہاتھ کے اشارے سے ایک بچے کو اپنے پاس بلایا تو وہ دوڑتا ہوا بہرام کی جانب چلا آیا۔

"جی سرکار"

وہ سعادت سے بولا۔دور سے ہی وہ پہچان چکے تھے کہ یہ سردار عطاء اللہ خان کا بڑا پوتا ہے۔

"تم لوگ اس وقت یہاں پر کیا کر رہے ہو؟"

وہ چہرے پر بدوقت نرمی سجائے نرم لہجے میں بولا۔بچے کو کچھ حوصلہ ہوا اس نے پیچھے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"سرکار ہم سب یہاں پر ہفتے میں دوبار آتے ہیں اور رضائے خدا کے لئے ان قبروں پر پانی چھڑک کر اور نیم کے پتے رکھ کر جاتے ہیں۔"

بہرام کو ان کی تربیت پر رشک ہوا۔سر جھٹک کے اس نے اپنا اگلا سوال کیا۔

"تم لوگوں کو قبرستان سے ڈر نہیں لگتا؟وہ بھی اس وقت؟"

اس کی بات پر بچے نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا۔

"سرکار قبرستان عبرت کی جگہ ہے،ڈرنے کی نہیں۔یہاں آتے رہنا چاہیے تاکہ عبرت پکڑ سکیں۔جب منزل ہی یہ ہے تو خوف کیسا؟"

وہ دیدہ دلیری سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بول رہا تھا بہرام کو لگا وہ مزید اس بچے کے ساتھ بحث نہیں کر سکتا۔سادگی سے مسکرائے اس نے جیب ٹٹولی اور کچھ پیسے نکال کر اس بچے کے حوالے کئے جنہیں اس نے نا سمجھی سے تھام سوالیہ نظروں سے بہرام کی جانب دیکھا بہرام اس کی آنکھوں میں پنپتا سوال بھانپ گیا۔

"جب بھی ان قبروں کو پانی دینے آیا کرو تو اس قبر کو بھی پانی دے دیا کرو۔ ہو سکے تو اس پر بھی ٹہنیاں رکھ دیا کرو۔"

وہ ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے بول رہا تھا۔ اس مسکراہٹ میں کہیں، کہیں غم کی پرچھائی بھی تھی۔

"سرکار آپ یہ پیسے واپس رکھ لیں مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا ہے کہ ہم یہ کام رضائے خدا کے لئے کرتے ہیں۔ آپ کا کام کر دیا کریں گے۔" پیسے واپس اس کے ہاتھوں میں تھما کر وہ بچہ دوسری جانب چل دیا۔ آج وہ بچہ بہرام کو اس کی زندگی کا بہت بڑا سبق دے کر گیا تھا۔ وہ سبق شاید کسی کتاب سے مل ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ سبق انسانیت کا سبق تھا۔

☆☆☆☆☆

عطاء اللہ خان اور زمان خان بخش کے ہمراہ آج ڈیرے گئے ہوئے تھے۔ بی جان، صبور خانم اور سبین خانم اپنے اپنے کمروں میں آرام فرما تھیں۔ کشف آج کل اپنے امتحان کی تیاری میں مصروف رہتی اور زیادہ وقت پچھلے باغ میں ہی گزارتی تھی۔

آج کافی دنوں بعد اسے آرام کا موقع ملا کھانا بنا حویلی کے کام اتنی زیادہ تھے کہ وہ ایک کر کے فارغ ہوتی تو اگلا کام اس کا منتظر ہوتا مگر چونکہ ہر کوئی مصروف تھا سو اسے آج کافی وقت مل گیا۔ اس نے سوچا کہ یہ وقت یوں ہی بیٹھ کر ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ وہ جا کر آرام کر لے۔ ویسے بھی یہاں آنے کے بعد سے اب تک اس کی نیند ہی وہ واحد چیز تھی جو اب تک پوری نہ ہو پائی تھی۔ گھر میں تو پھوپھی کا جب جی چاہتا ہے اسے اٹھا دیتی اور سکول جانا ہوتا تب بھی وہ مشکل سے چھ بجے اٹھتی تھی مگر یہاں اسے چار بجے اٹھنا پڑتا تھا۔ ایک بار پھر گھر اسے جی بھر کر یاد آیا ساتھ ہی ساتھ وہ روز کی رونق، سمی اور قمر بھی یاد آ گئے۔ نا جانے وہ کیا کر رہے ہوں گے؟ اسے یاد بھی کرتے ہوں گی یا نہیں؟ گھر میں سب کیسے ہوں گے؟ اس کا ابا، اسکی پھوپھی اس کا لالہ، اس کا سونو؟

اسے سب کی بے انتہا یاد آ رہی تھی۔ وہ محبتوں کی عادی تھی۔ نفرت بھرے رویے اس نے کبھی نہیں سہے تھے مگر یہاں تو اس روز سے وہ سب کے سرد لہجے اور سرد رویے کو ہی محسوس کر اور دیکھ رہی تھی۔ صرف ایک کشف تھی جس کے رویے اور لہجے کو دیکھ کر اسے کچھ حد تک سکون ملتا تھا۔ خجستہ کا رویہ بھی اس کے ساتھ بہتر تھا۔ یہاں گزرتے شب و روز بے کیف سے تھے اور وہ شخص جس کے نام پر وہ اس حویلی میں آئی تھی اسے اس روز کے بعد سے اب تک دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ اسکا محسن تھا، کیا مزید رہے گا؟

اسے یہ بات بھی پریشان کرتی تھی مگر ان سب بے کیف دنوں میں وہ ایک چیز جو اس کے اداس دل کا مرہم بنتی تھی اور وہ فصیل پر کبوتروں کی موجودگی تھی۔

وہ اپنے اس کمرے کم، کال کوٹھری زیادہ کی چوکھٹ پر بیٹھی تھی۔ سونے کا ارادہ ترک کر دیا تھا کیوں کہ اندر جانے کی ہمت اس میں ناپید تھی۔ وہ رات گئے، تھکاوٹ سے چور بدن لیے سیدھا آ کر بستر پر گرتی تھی تو فوراً نیند اپنے غلبے میں لے لیتی تھی یوں اندھیرے سے ڈر جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر اب اندر جانا مشکل تھا وہ چوکھٹ پر بیٹھی تھی جب اسے آہٹ کا احساس ہوا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو راہداری کے کونے میں اسے روبینہ کھڑی نظر آئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا پوری راہداری خالی تھی، اسے روبینہ سے خوف محسوس ہوا یہ عورت ہمیشہ اس کے کام بگاڑ دیتی رہتی تھی نا جانے اسے زینی کیا دشمنی تھی۔ وہ گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی جبکہ روبینہ اسے مسلسل گھورتی اس کی جانب چلی آئی۔

"تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ چلو آؤ میرے ساتھ"

اس کے پاس آ کر مزید کچھ کہے بغیر اس کا بازو پکڑے وہ اس سے لیے دوسری سمت چل دی زینی اس کے ساتھ چلتی کم گھسٹتی زیادہ، خود کو چھڑوانے کی کوشش کر رہی تھی، اب تو خجستہ بھی آس پاس نہیں تھی۔

"کہاں لے جا رہی ہیں آپ مجھے؟"

وہ تیزی سے بولی تو روبینہ نے اس کا بازو مروڑ ڈالا۔

"بی بی سرکار کا حکم ہے، مردان خانے چلنا ہے۔"

وہ بغیر اس کی جانب دیکھے بولتی جا رہی تھی جبکہ اس کی بات سنتی زینی کو حیرت ہوئی۔

"یہ بی بی سرکار کا حکم ہے کیا؟"

زینی نے اچھنبے سے پوچھا۔ روبینہ رکی اور اس کی جانب پلٹی۔ سخت نظروں سے اسے گھورتی وہ چبا چبا کر بولنے لگی۔

"ہاں اور میں پاگل ہوں تمہیں حکم دیتی پھروں؟ بی بی سرکار کو سانس کی بیماری ہے۔ ان کا سانس لینے والا آلہ زنان خانے میں موجود نہیں ہے مگر مردان خانے میں بہرام سرکار کے کمرے میں موجود ہے۔"

اس نے جان بوجھ کر بہرام کے کمرے کا ذکر کیا وہ جانتی تھی کہ اس نے جو چال چلی ہے اگر وہ اس میں کامیاب ہو جائے گی تو زینی کو حویلی والوں کے عتاب سے کوئی نہیں بچا پائے گا۔ در حقیقت نہ بی جان کو سانس کی بیماری تھی اور نہ ہی انہیں کسی آلے کی ضرورت تھی۔ یہ سب تو سوچی سمجھی سازش تھی۔ جس کے لئے وہ کئی دنوں سے موقع کے انتظار میں تھی اور آج اسے وہ موقع مل گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آج ہی بہرام لوٹ آئے گا۔ جبکہ اس کے ساتھ چلتی زینی لاتعداد سوچوں میں گھری ہوئی تھی۔

"تو یہ کام آپ بھی تو کر سکتی تھیں نا؟"

مردان خانے میں داخل ہوتے ہی وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔ آگے جاتی روبینہ نے پلٹ کر اسے گھورا۔

"میں تمہاری طرح فارغ نہیں ہوں مجھے مزید بہت سے کام ہیں۔ تم سکون سے ڈھونڈ لینا اور اس کے بعد کمرے کی صفائی کر کے آجانا، کوئی مرد نہیں ہے آج مردان خانے میں۔"

اسے بہرام کے کمرے تک چھوڑ کر وہ واپس نیچے کی جانب بڑھ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ سانس لینے کا ایسا کوئی بھی آلہ حویلی میں موجود نہیں ہے اور زینی اس آلے کی تلاش میں پورے کمرے کو بکھیر کر رکھ دے گی۔ ایسے میں کسی کا

اچانک اس کمرے میں آجانا، کمرے کی بکھری حالت کو دیکھنا اور سب سے بڑھ کر زینی کو وہاں دیکھنا، زینی کو کس قدر مصیبت میں ڈالے گا یہ سوچ سوچ کر ہی وہ خوش ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

زینی تیزی سے اس کمرے میں داخل ہوئی، احتیاط کے طور پر نقاب بھی کر لیا تھا، بھلے ہی مردان خانے میں کوئی مرد موجود نہیں تھا مگر اسے جلد از جلد مطلوبہ شے ڈھونڈ کر واپس جانا تھا۔ یہی اس کے لیے بہتر تھا۔

☆☆☆☆☆

قبرستان سے واپسی پر وہ سیدھا حویلی ہی آیا تھا۔ فلحال وہ کسی سے بھی ملنے ملانے کی حالت میں نہیں تھا تبھی گاڑی پارک کرنے کے فورا بعد بغیر کسی سے کوئی بات کہے وہ مردان خانے کی جانب بڑھ گیا۔ اندر آنے پر کسی کو نہ پا کر اس نے سکون کا سانس بھرا۔ سامان نہ وہ لے کر گیا تھا اور نہ لے کر واپس آیا تھا۔ اس لیے سیدھا اوپر کی جانب بڑھ گیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا، پھر کف فولڈ کرتا اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ چڑ کی آواز سے دروازہ کھلا۔ سنگھار میز کے پاس جھکی زینی کی سانس تھم گئی۔

وہ کمرے میں آیا تو کسی لڑکی کو کمرے میں پا کر چونک گیا۔ آخر کون تھی وہ جو اس کے کمرے میں موجود تھی۔ حالانکہ حویلی میں سب اس کی عادت سے واقف تھے کہ وہ کسی بھی نوکر تو کیا حویلی کے کسی فرد کو بھی اپنی غیر موجودگی میں اس کمرے میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ سنگھار میز سے مطلوبہ چیز کی تلاش کرتی زینی چونکی۔ اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے مڑی۔

کسی لڑکی کو نقاب میں اپنے کمرے کے سامان سے چھیڑ چھاڑ کرتا دیکھے بہرام کے غصے کا گراف پل بھر میں آسماں کو چھونے لگا۔ زینی نے بھاگنا چاہا مگر اس سے قبل ہی اس کی مومی کلائی بہرام کے ہاتھوں میں آچکی تھی۔ اگلے ہی

لمحے بہرام نے اسے کھینچ کر دیوار سے لگایا تھا۔وہ کانپتی ہونٹ چباتی سر جھکا گئی۔پہلی بار کوئی مرد اس کے اتنے قریب تھا اور تھا بھی ایسے کہ غصے سے بھرپور۔

"کون ہو تم؟ یہاں کیا چرانے آئی تھی۔"

اس کا سوال چبھتا تھا مگر زینی خاموش رہی۔سر تک نہ اٹھایا۔

"میری جانب دیکھو لڑکی۔"

اس کے بازو پر گرفت سخت کرتے اس نے زینی کو گھورا۔اس کے سخت لہجے اور انداز پر زینی نے آنکھیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔صرف ایک پل کو وہ چونکا اگلے ہی لمحے ان آنکھوں کو دیکھے وہ ساکت ہوا تھا۔یہ آنکھیں؟

☆☆☆☆☆

وہ لوٹ آیا

کوئی لوٹا ہے ایسے
خزاں چھائی ہے جیسے
کھلی حقیقت ہے ایسے
منجمد ہر احساس ہے جیسے
ڈوبی ہے زندگی کی حقیقت ایسے
آگہی روح پر سوار ہوئی ہو جیسے

☆☆☆☆☆

وہ جب سے کشف سے ملاقات کئے لوٹا تھا اسے اس بات نے اطمینان دے رکھا تھا کہ اب وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے وہ جانتا تھا اب کشف ہر صورت زینی کا خود سے بھی بڑھ کر خیال رکھے گی چاہے اسے کچھ بھی کر جانا پڑے۔ اتنے دنوں کی کثافت کچھ حد تک رفع ہوئی تھی۔ وہ پر سکون سا برگد کے درخت تلے چارپائی ڈالے لیٹا تھا۔ ہلکی ٹھنڈی ہوا کو اس کا لمبا کوٹ روکے ہوئے تھا۔ اٹاری میں دھواں چل رہا تھا۔ بڑی مدت کے بعد آج سب کو کچھ سکون آیا تھا تبھی دیسی گھی کے پراٹھوں کی پکائی کی خوشبو پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ کونے میں سر جھکائے قمر بیٹھا تھا، اسکا دکھ واقعی بہت بڑا تھا۔ وہ نہ ٹھیک سے کچھ کھا رہا تھا نہ پی رہا تھا۔ اندر ہی اندر گھلتا وہ بے حال ہو رہا تھا۔

مرتضیٰ اسے اب تک نہ سنبھالتا تو وہ حویلی بھی پہنچ چکا ہوتا۔ آہستہ سے گردن موڑے مرتضیٰ دوسری جانب دیکھنے لگا۔ نظریں خالی منڈیر پر گئیں پھر ناکام لوٹ آئیں۔ ذہن خود بخود کل کے واقعہ کی طرف چلا گیا۔ وہ کشف کی باتیں، آنکھوں کی وہ روشنی اور پیامِ محبت کا دل فریب احساس۔ ایک بار پھر الہامِ محبت دل پر اترا روح تک دل فریب احساس پھیلا تو وہ بے چین اٹھ بیٹھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

بے چین دل نے دماغ سے سوال کیا۔

"یہ میں کن راہوں پر چل نکلنے کو تیار ہوں۔"

اس نے سر جھٹکا۔ وہ اور خانزادی؟ بھلا جس کی حیثیت کو کبھی اسکا اپنا باپ قبول نہیں کرے گا اس کی حیثیت کیا کہ وہ خانزادی کا ہاتھ مانگے۔ اس نے سر جھٹکا۔ منڈیر اب بھی خالی تھی۔

☆☆☆☆☆

وہ حیرانی سے اسکی جانب دیکھ رہا تھا۔ یہ آنکھیں اسے اسی چھت پر لے گئیں، اسے وقت میں پیچھے لے گئیں۔ وہ ان ہرنی جیسی آنکھوں میں پہلی بار خوف دوسری بار بے خوفی اور اب دوبارہ خوف دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک لمحے میں اس سے دور ہوا۔ اس وجود کو تکلیف دینے کے بارے میں سوچ کر ہی اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ زینی نے خاموشی سے اس کی جانب دیکھا خاموشی کا دورانیہ بڑھا تو وہ باہر جانے کو مڑی جب اسے بہرام کی آواز سنائی دی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

وہ سانس روکے پوچھ رہا تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اور ایسے دھڑک رہا تھا کہ اسے اپنا دل ہاتھوں میں محسوس ہوا۔ اس نے شدت سے دعا کی کہ اس کے منہ سے اس بات کا وہ جواب نہ نکلے جو وہ سوچ رہا تھا۔ وہ سننا ہی نہیں چاہتا تھا کہ وہ!

"ونی ہوں۔ساک ہوں۔"

بہرام ساکت رہ گیا۔دھڑکن تھم گئی۔سانس تک رک گئی تھی۔یہی جواب وہ سننا نہیں چاہتا تھا۔اس کا مطلب وہ اسکی بیوی تھی۔

"تم سے نکاح ہوا تھا میرا؟تم زینش ہو؟مذاق ہے نا؟"

اسے اب بھی امید تھی کہ وہ انکار کر دے گی مگر حویلی میں موجود گی؟اسکے کمرے میں اسکی موجود گی؟یہ سب کیا تھا؟وہ کیسے حقیقت سے نظریں چرا لیتا؟

"جی میں ہی زینش ہوں۔میں آپکی بیوی نہیں ہوں سائیں،میں بس ونی ہوں،یونہی تڑپ،تڑپ بے نام ونشان رہنا اور مرنا میرا مقدر ہے۔میری پھوپھی نے کہا تھا میں بس ونی ہوں۔کسی کی بیوی نہیں۔"

وہ اتنی سمجھدار نہ تھی مگر رومانہ کی باتیں اس کے ذہن میں آئیں تو وہ سب کہتی گئی۔اسی نے کہا تھا کہ وہ بس ونی ہے،کسی کی بیوی نہیں۔

اسکے منہ سے نکلتے الفاظ کو وہ بے یقینی سے سن رہا تھا۔سر پھٹنے کو تھا۔یہ کیا تھا؟تقدیر کے فیصلے اتنے سنگدل کیوں ہوتے ہیں۔وہ کچھ کہنے والا تھا جب دروازہ دھاڑ کی آواز سے کھلا۔بہرام اور زینی نے بیک وقت دروازے کی جانب دیکھا۔بی جان کے ساتھ ساتھ رومانہ بھی اندر آئی مگر بہرام کو دیکھ کر نہ صرف بی جان کھٹکیں بلکہ رومانہ کے ہاتھوں کے طوطے بھی اڑ گئے۔اس نے تھوک نگلا۔عزت تو بچانا ہی تھی پھر چاہے کچھ بھی کرنا پڑتا۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟"

بی جان غیض وغضب سے بولیں۔بہرام کو حیرانی ہوئی۔بی جان کا رویہ کب سے ایسے اکھڑا،اکھڑا ہو گیا؟وہ ہمیشہ اسے پہلی نظر پر پیار دیتی تھیں مگر اب ان کے لہجے میں برچھی کی کاٹ تھی۔

"بی جان کیا مطلب کیا ہو رہا ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ رومانہ نے نہ بولنے کی قسم کھائی تھی۔ نہ بولی تب بھی پھنسی، بولی تب بھی۔

"یہی کہ نہ تم ملنے آئے ہم سے نہ کسی اور سے اور آتے ہی اس منحوس کے پہلو میں کھڑے ہو اور اس کی مجال دیکھو تمہارے کمرے میں کیسے کھڑی ہے اور اوپر سے ڈھٹائی دیکھو کیسے ٹکر ٹکر دیکھ رہی ہے۔"

بی جان کا بس نہیں چل رہا تھا آگے بڑھ کر اس کا چہرہ تھپڑوں سے لہولہان کر دے۔

"پھر کیا ہوا بی جان میری بیوی ہے۔ میں اس سے بات کر رہا تھا۔"

اس کی بات پر بی جان پتھرا کر رہ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں جھانکا کہ شاید کہیں مذاق کی کوئی رمق؟ مگر وہاں بس سچائی ہی سچائی تھی۔ زینی بس خاموشی سے بہرام کا شفاف چہرہ دیکھنے میں مگن تھی۔

"بکواس بند کرو خاناں وفی ہے یہ۔" مڑ کر رومانہ کو پکارا جو فوراً جی بی بی کرتے سامنے آئی۔ "اس حرام خور کو لے جاؤ یہاں سے۔ اس سے میں نپٹ لوں گی۔"

انہوں نے ہاتھ جھلایا۔ وہ زینی کی جانب بڑھی۔ بہرام نے ناگواری سے ہاتھ اٹھا کر رومانہ کو روکا۔

"چل لے گی وہ، آپ جاؤ یہ خود آجائے گی۔"

اس کے نرم لہجے پر زینی کو بہت سکون محسوس ہوا۔ جس کے نام پر وہ یہاں آئی تھی وہ بہت باہمت تھا اور اسی ہمت کے ساتھ ساتھ زینی ساری عمر گزار سکتی تھی۔ بہرام اب اسکی جانب مڑا۔

"زینش تم جاؤ ان کے ساتھ۔ کھانے کے میز پر ملاقات ہو گی۔"

وہ بے یقینی سے سر ہلاتی ایک نظر سختی سے گھورتیں بی جان اور دوسری نظر جلتی بھنتی رومانہ پر ڈالے باہر کی جانب چل دی۔ بہرام کی نظروں نے اس کا دور تک پیچھا کیا پھر جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو بہرام نے رخ موڑ کر بی جان کی جانب دیکھا۔

"جی بی جان اب بولیں۔"

وہ عقیدت سے بولا مگر بی جان کے ضبط کی انتہا ہو گئی تھی۔ایک نظر اسے گھور کر سر جھٹکتیں وہ باہر کو چل دیں۔

بہرام نے حیرت سے ان کا سرد رویہ دیکھا انھیں پکارا مگر وہ سنی ان سنی کر کے جا چکی تھیں۔

بہرام نے گہرا سانس بھرا پھر بستر پر جا لیٹا وہ انتہا سے زیادہ تھک چکا تھا۔تھکن روح کی تھی یا بدن کی کہنا مشکل تھا۔

☆☆☆☆☆

وہ بہرام کی آمد سے دو روز قبل ہی واپس لوٹ گئے تھے۔پہلا دن واپس آ کر سامان خریدنے میں گزرا۔ہوسٹل میں بدمزہ کھانا تو مل جاتا تھا مگر بے وقت کی چائے نصیب نہ ہوتی تھی۔علاوہ ازیں دیگر سنیکس اور چھوٹی موٹی اشیا کی خریداری سے تھک کر وہ آرام کی نیت سے واپس کمرے میں آئے تو افسوس کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔وہاں سے فارغ ہو کر وہ بستر پر ڈھیر ہو گئے۔دوسرے دن آنکھ دیر سے کھلی مگر یونیورسٹی ہر صورت جانا تھا۔کھلتی بند ہوتی آنکھوں سمیت ایک دوسرے کو دھکے دے دے کر وہ تیار ہوئے اور یونیورسٹی کے لئے نکل گئے۔ارادہ یہ تھا کہ پہلے لیکچر کے بعد ہی منہ دھو لیں گے اور ناشتہ بھی وہیں کر لیں گے۔وہ دوڑتے ہوئے گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔پیون انہیں دیکھ کر ہنسا مگر وہ نظر انداز کرتے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی جانب چلے گئے۔راستے میں جس جس نے انھیں دیکھا ہنستا ہی رہا۔کچھ چہ مگوئیاں بھی کرتے رہے۔انہوں نے کندھے اچکائے اور کلاس میں چلے آئے۔لیکچر کا آغاز ہو چکا تھا اور وہ دس منٹ تاخیر کا شکار ہوئے تھے۔سر فہیم نے ان کی جانب دیکھا پھر چشمہ درست کیا اور اوپر سے نیچے تک انھیں گھورا۔وہ کھلتی بند ہوتی آنکھوں سمیت انھیں دیکھ رہے تھے۔کلاس میں قہقہوں کا طوفان امڈ آیا تھا۔

"برخوردارو۔۔۔!لگتا ہے بہت صدمہ لے چکے ہو۔"

صائم نے ناسمجھی سے سر ہلایا۔

"کیا ہوا سر؟"

زعیم نے حیرانی سے پوچھا۔اب صدمہ ہونا تو قدرتی بات تھی۔آخر کو انہوں نے اپنا فرسٹ کزن کھویا تھا۔مگر اب کیا ہوا تھا کہ سب ہنس رہے تھے۔

"یہ زعیم کی الٹی شرٹ، یہ صائم نے جو شرٹ پہنی ہے اس کا گلا پچھلی جانب ہے، آنکھیں تم دونوں کی کھل نہیں رہیں۔صائم نے ایک پاؤں میں چپل پہنی ہے دوسرے میں بوٹ اور آپ نے مختلف جرابیں پہن رکھیں ہیں۔کیا بات ہے بہت صدمہ لیا ہے؟"

زعیم اور صائم کی حالت تو ایسی تھی کہ ہاتھ لگاتے ہی گزر جائیں۔جبکہ کلاس میں ہر کسی کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ان کی آنکھیں تو حقیقتاً کھلی ہی اب تھیں۔صائم نے زعیم کی جانب دیکھ کر ابرو اچکائے مطلب یہ تھا کہ پہلے تو فٹے منہ پھر یہ کہ اب کیا کیا جائے؟

زعیم نے گلا تر کیا۔

"ہاہاہاہا سر یہ۔۔۔یہ تو فیشن ہے سر"

اس نے بے فکری سے کچھ زیادہ ہی ایکشن دکھاتے ہوئے سر سمیت پوری کلاس کو مطمئن کیا۔

"مطمئن وہ ہے تو"

صائم ہلکی آواز میں بولا۔سر خاموشی سے انھیں دیکھ رہے تھے۔ہنسی ضبط کیے انھیں بیٹھنے کا اشارہ دیا۔وہ کھسیا کر اپنے ڈیسک کی جانب بڑھے۔

"کلاس فیشن ان ہے آپ سب بھی ٹرائے کر لیجیے گا۔"نکلنے سے قبل سر فہیم کی بات پر ایک بار پھر سب کے قہقہے بے ساختہ تھے۔زعیم جل بھن کر اٹھا۔صائم نے اپنا اور اس کا بیگ سنبھالا۔

"تم پینڈو لوگ کیا جانو فیشن ہے کیا چیز۔"

صائم جیسے فلسفہ جھاڑ کر باہر نکلا۔وہ دونوں خفگی سے ایک دوسرے کو گھورنے لگے۔پھر زعیم نے صائم کی کمر پر مکا دے مارا۔

"آخیر لیول کے منحوس ہو۔اب جلدی چلو کم از کم شرٹ کی حالت ہی درست کر لیں اس سے پہلے کہ وہ چڑیلیں بھی ہمیں دیکھ لیں۔"

زعیم نے صفا اور مروا کا ذکر کیا تو صائم نے چور نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیا چند ایک سٹوڈنٹ انھیں دیکھ کر مسکراہٹیں دباتے پھر رہے تھے۔

"فیشن ہے یہ۔"

ان کے پاس سے گزرتے وہ نخوت سے بولتے جا رہے تھے۔ابھی وہ بمشکل چند قدم چل پائے تھے کہ ان کے سامنے صفا اور مروا آ رکیں۔انھیں دیکھتے ہی وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئیں۔

"ماشاءاللہ کافی تعریف ہو رہی تھی تم دونوں کے نئے فیشن کی یونیورسٹی میں،ہم نے سوچا کہیں محروم نہ رہ جائیں۔دیکھ ہی آئیں۔"

مروا نے تیر برسانے شروع کیے تو وہ دونوں ہی جل بھن گئے۔پاؤں پٹختے زعیم وہاں سے ہٹ گیا۔بدلہ کسی اور وقت کے لئے ادھار رکھ لیا تھا۔صفا نے مسکراہٹ دبائے زعیم صائم کو دیکھا۔صائم شرمندہ سا ہنستے وہاں سے نکل گیا۔

"تصویر لی ہے؟"

مروا ان کے جانے کے بعد صفا کی جانب مڑی۔

"ہاں بنا تو لی ہے پر یار ایسا نہ کرو بیچاروں کی عزت کا معاملہ ہے۔"

صفا کی ہمدردی جاگی۔

"تم نہ ہی سمجھاؤ مجھے"

وہ یونیورسٹی کے آفیشل پیج کو تصویروں کے ساتھ ٹیگ کرتی دوسری جانب چل دی۔

"نکل گیا ان کی عزت کا جنازہ"

صفا بڑبڑائی۔

☆☆☆☆☆

کھانے کے میز پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔زینی سر جھکائے برتن میز پر لگا رہی تھی۔بہرام کا انتظار ہو رہا تھا وہ اب تک میز پر نہیں آیا تھا۔سلیمان خان اور زمان خان سے اس کی ملاقات بہر حال ہو گئی تھی مگر آغا جان سے اب تک ملاقات نہ ہو پائی تھی۔

بلا آخر وہ سیڑھیاں اترتا نظر آیا۔چند ثانیے بعد خوشبو بکھیرتا وہ کھانے کے میز تک پہنچ چکا تھا۔رسوئی کی جانب جاتی زینی نے اس کی جانب چہرہ موڑ کر دیکھا۔وہ اتنا خوبرو مرد تھا کہ وہ فورا نظریں ہٹا گئی پھر حواس باختہ ہوئے رسوئی میں چلی گئی۔وہ آغا جان سے ملنے کے بعد کرسی کھینچ کر بی جان کے سامنے بیٹھا۔بی جان نے ناراضگی سے چہرہ موڑ لیا۔کھانے کا آغاز ہوا تو بہرام نے نظریں گھمائیں مگر وہ کہیں نظر نہ آئی۔بی جان سمیت باقی سب نے اس کا یوں ارد گرد دیکھنا محسوس کیا۔میز کے کونے میں رخ موڑ کے بیٹھی کشف نے بھی دوپٹے کی اوٹ سے اس کا بے تابانہ انداز دیکھا۔

"بہرام بچے خیر تو ہے؟"

آغا جان پوچھے بنا نہ رہ پائے۔میز پر گہری خاموشی تھی۔

"زینش کہاں ہے؟"

اس کے سوال پر سب کو سانپ سونگھ گیا۔بی جان نے حیرت سے اسے دیکھا۔کشف چہرہ جھکا گئی۔آغا جان نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

"کون زینش؟"

"میری بیوی"

اس نے کانٹا پلیٹ میں واپس رکھتے ہوئے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔رسوئی میں کھڑی زینی نے دوپٹہ ہاتھوں میں مضبوطی سے جکڑ لیا۔اب کیا ہو گا۔پہلے بی جان نے اسے خوب ڈانٹا تھا اور سزا کے طور پر سارا کھانا بنانے کا کام اور برتن دھونے کی ذمہ داری مکمل طور پر اسے سونپ دی تھی۔روبینہ کو تو سنتے ہی پتنگے لگ گئے۔

"پچھلے دروازے سے صحن میں دفع ہو جاؤ۔کپڑے تاروں سے اتارو۔"

اس نے زینی کو منظرِ عام سے ہٹانا چاہا۔زینی نے تھوک نگل کر اسے دیکھا۔آج خجستہ نہیں تھی ورنہ وہ اسے بچا لیتی۔

"پچھلی طرف اندھیرا ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔روبینہ نے سختی سے اسے گھورا۔

"دفع ہوتی ہو کہ نہیں؟"

وہ جاہلانہ لہجے میں بولی زینی مرتی کیا نہ کرتی کے مصادق مرے مرے قدم اٹھاتی باہر کی جانب چل دی۔اس کے جانے کے بعد روبینہ کو کچھ اطمینان ہوا مگر کھانے کے میز پر مکمل خاموشی تھی بہرام نے سب کی جانب دیکھا۔

"ایسا کیا کہہ دیا میں نے کہ آپ لوگ خاموش ہو گئے ہیں۔وہ اس حویلی کی بہو ہے۔اس کا حق ہے یہاں بیٹھنا۔"

وہ بے نیازی سے بول رہا تھا۔سلیمان خان نے زور سے کانٹا پلیٹ میں واپس پٹخا۔سب کا کھانا حلق میں ہی اٹک چکا تھا۔

"بہرام خان یہ بات مت بھولو کہ اس کے بھائی نے تمہارے جان سے پیارے چوتھے لاڈلے کا قتل کیا ہے۔ وہ ونی ہے اور ونی کسی کی بیوی نہیں ہوتی اور تم ہوتے کون ہو اس طرح منہ بھر کے اسے بیوی کہنے والے؟ وہ بیوی نہیں ہے تمہاری۔ بس ہماری نوکرانی ہے۔ بہتر ہے کہ تم بھی اپنی اوقات میں رہو اور اسے بھی اس کی اوقات میں ہی رہنے دو۔"

آغا جان نخوت سے بولے۔ بہرام نے گہرا سانس کھینچے ضبط کیا پھر کرسی پیچھے کو دھکیلتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"تو یہ بات آپ کو میرا اس سے نکاح کروانے سے پہلے سوچنی چاہیے تھی میں ایسی کسی رسم کو نہیں مانتا۔ آپ کی مان کر دیکھ لی اب وہی ہو گا جو میں چاہوں گا کیونکہ میں اس کا شوہر ہوں۔"

وہ تند ہی سے بولا اور رسوئی کی جانب بڑھا مگر آغا جان کے الفاظ نے اس کے قدم زنجیر کر دیے۔

"رک جاو۔۔۔ یہ میرا حکم ہے"

اس نے آہستہ سے گردن موڑ کر آغا جان کو دیکھا پھر سب کی جانب دیکھا اور دوبارہ رسوئی کی طرف چل دیا۔ آغا جان نے بے یقینی سے بی جان کی طرف دیکھا جنہوں نے نظریں چرا لیں۔ انہوں نے گردن موڑ کر سلیمان خان کی جانب دیکھا پھر رسوئی کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ تمہارا بیٹا میری حکم عدولی کر کے گیا ہے۔ اس کی اتنی جرت۔۔۔ کہ دو کوڑی کی لڑکی کی خاطر میری یعنی کے عطا اللہ خان کی حکم عدولی کی۔"

ان کا تنفس تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ خود سلیمان خان سمیت باقی سب بھی دم سادھے حیران بیٹھے تھے یہ کیسی بغاوت کی ہوا چلی تھی۔

☆☆☆☆☆

وہ رسوئی میں آیا گردن گھما کر ارد گرد دیکھا مگر وہ کہیں نہیں تھی۔وہاں محض روبینہ تھی۔جو شیلف کے پاس کھڑی تھی۔اس نے سوالیہ نظروں سے روبینہ کی جانب دیکھا۔

"وہ کہاں ہے؟"

"کون کہاں ہے سرکار؟"

روبینہ بالکل انجان بنتے ہوئے بولی۔بہرام نے نظریں گھمائیں۔

"زیادہ بننے کی کوشش مت کریں میں جانتا ہوں کہ آپ سمجھ چکی ہیں۔"

وہ تیز لہجے میں بولا تو روبینہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔تیزی سے اس نے باہر جاتے دروازے کی جانب اشارہ کیا"وہ سرکار وہ پچھلی جانب۔۔۔"

اس کی باقی بات کو نظر انداز کرتے وہ تیزی سے پیچھے جاتے دروازے کی طرف بڑھا دروازہ کھول کر باہر آیا تو گہرے اندھیرے نے اس کا استقبال کیا۔دور سرونٹ کوارٹر سے آتی ہلکی سی روشنی کے سبب کچھ حد تک بینائی اس ماحول سے شناسا ہوئی۔کوئی ہیولا کونے میں لگی تاروں پر سے کپڑے اتارنے میں مصروف تھا وہ دبے پاؤں چلتا اس کے پیچھے جا کر کھڑا ہوا آہٹ محسوس کرتی زینی چونکی اور فوراً سے مڑی۔مگر پیچھے ایک دم ہی کسی کو کھڑا پا کر اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ہاتھ میں موجود کپڑے بھی نیچے جا گرے جبکہ دوسری جانب بہرام اس کے یوں بوکھلانے پر گھبرا گیا اس سے قبل کہ وہ اپنے آپے سے باہر ہو کر چیخنے چلانے لگتی بہرام بول اٹھا۔

"ہوش میں آؤ یہ میں ہوں۔"

بہرام کی آواز سن کر اسے کچھ سکون محسوس ہوا ورنہ اسے ایسا لگا جیسے پیچھے بخش کھڑا تھا۔وہ نقاب میں نہیں تھی نیم اندھیرے میں وہ اس کا خوبصورت چہرہ دیکھ سکتا تھا وہ چہرہ جو اس نے ہمیشہ ڈھکا ہوا ہی دیکھا تھا آج اس کے لئے حلال بھی تھا اور ڈھکا ہوا بھی نہیں تھا وہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا وہ کتنی معصوم تھی اور کتنی چھوٹی

تھی۔وہ چہرہ اتنا خوبصورت تھا کہ اگر وہ اسی چہرے کو دیکھتا رہتا تو شاید وہ کام بھول جاتا جس کے لیے وہ یہاں آیا تھا اس نے سر جھٹکا۔وہ جھک کر کپڑے اٹھانے لگا تو اسے بھی شرمندگی محسوس ہوئی وہ بھی ساتھ ہی جھک کر کپڑے اٹھانے لگی بکھرے کپڑے اکٹھے کرنے کے بعد بہرام نے وہ کپڑے اسے تھما دیے۔

"یہ کپڑے روبینہ کو پکڑاؤ اور آ کر کھانا کھاؤ ہمارے ساتھ۔"

زینی اس کی جانب ایسے دیکھنے لگی گویا اس کا دماغ چل گیا ہو۔"

"کیا ہوا؟" بہرام نے حیرانی سے پوچھا تو زینی نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں وہاں نہیں بیٹھ سکتی، میں وہاں بیٹھ ہی نہیں سکتی۔"

وہ بوکھلا کر بولا اٹھی۔وہ ان رویوں کی اب مزید عادی نہ تھی مگر وہ اس کی عادتیں بگاڑ رہا تھا بہرام نے اس کی جانب خفگی سے دیکھا۔

"میں تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ تم وہاں بیٹھو گی۔اس کے بعد بھی؟"

اس نے سوالیہ انداز اپنایا زینی سر جھکا گئی۔

"صاحب میں ان رویوں کی عادی نہیں ہوں خدارا جو چند دن آپ نے یہاں رہنا ہے اس نے مجھے بھی سکون سے رہنے دیں اور خود بھی سکون سے رہیں۔آپ تو چلے جائیں گے لیکن آپ کے بعد میرے لیے ہی مسائل پیدا ہوں گے۔" وہ سر جھکائے بولتی گئی پھر اس کے برابر سے ہو کر اندر جانے والی تھی جب بہرام نے اس کا بازو تھام کر اسے اچانک روکا۔

"میں تمہارا شوہر ہوں اور میں تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ تم ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤ تم جانتی ہو کہ شوہر کے حکم ٹالنے والی بیوی کو کتنی سخت سزا ملتی ہے۔"

اس نے زینی کو ڈرانا چاہا۔زینی نے بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"میں آپ کی بیوی نہیں صرف ونی ہوں"

وہ تلخی سے بولی اب وہ مزید بہرام کی بات نہیں سننا چاہتی تھی مگر بہرام شاید آج اس کی سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"میرے سامنے ونی ہونے کا رونا مت رو۔ میں ایسی کسی بھی رسم یا ایسی کسی بھی فضول چیز کو نہیں مانتا تو خاموشی سے میرے ساتھ اندر چلو اور مجھے سختی کرنے پر مجبور مت کرو ورنہ پچھتاو گی۔"

اب کی بار اس کا لہجہ واقعی سخت تھا کسی بھی رعایت سے پاک۔ زینی بھی خاموشی سے اس کے ساتھ چل دی وہ دروازے سے اندر آئے تو ربنانے تند ہی سے اسے گھورا۔ بہرام کے اشارے پر اس نے وہ تمام کپڑے روبینہ کو سونپنا چاہے تو روبینہ نے اس کی جانب دیکھا روبینہ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ بہرام نے زینی کا کانپنا محسوس کر لیا تبھی سخت لہجے میں روبینہ سے مخاطب ہوا۔

"آپ اپنا کام کریں جا کر"

"جی صاحب جی روبینہ اثبات میں سر ہلاتی ہیں وہاں سے پلٹ گئی تو بہرام نے مڑ کر زینی کو دیکھا جس نے نفی میں سر ہلایا جیسے وہاں جانے سے انکار کر رہی ہو مگر بہرام نے اس کی ایک نہ سنی اور اس کی کلائی کو گرفت میں لیے وہ کھانے کے میز کی جانب بڑھا۔

انہیں ایسے آتا دیکھ کر کھانے کے میز پر سناٹا چھا گیا زینی خوفزدہ نظروں سے سب کی جانب دیکھ رہی تھی کشف کے دل کو سکون نصیب ہوا جبکہ آغا جان زور سے میز پر ہاتھ مارتے اٹھے اور کھانے کا میز ہی چھوڑ گئے بی جان نے غصے سے چہرہ موڑ لیا مگر بہرام کو کسی کی پرواہ نہ تھی اس کے برابر کی کرسی کھینچ کر وہاں زینی کو بٹھایا اور پھر مڑ کر اس کے ساتھ والی کرسی پر جا بیٹھا وہ جانتا تھا کہ زینی بہت خوفزدہ ہے اور خود سے کچھ نہ لے گی نہ کھائے گی اس لیے وہ

اس کے لیے وہیں بیٹھ گیا۔وہ اس کے لئے کھانا نکال رہا تھا پھر اس کے بعد اپنے لئے کھانا نکالا پلیٹ اس کے سامنے رکھی اور اپنی پلیٹ اپنے سامنے۔

"کھانا شروع کرو"

اس نے نرمی سے کہا اسے کچھ حوصلہ ہوا آہستہ سے کام کا ہاتھ بڑھا کر اس نے چمچ اٹھایا۔یہاں اس کے چمچ اٹھانے کی دیر تھی وہیں بی جان بھی میز چھوڑ کر چلی گئیں۔پل کی پل بہرام نے نظریں اٹھا کر دیکھا پھر واپس اس کی جانب دیکھ کر مسکرایا۔

"تم کھانا کھاؤ"

وہ نرم لہجے میں بولا۔زینی مروتاً مسکرائی پھر بمشکل نہ چاہتے ہوئے بھی حلق سے چند لقمے نیچے کیے۔بہرام کو حوصلہ ہوا زیادہ نہ سہی وہ کچھ تو کھا رہی تھی بہرام کو دلی طور پر بی جان اور آغا جان کے رویے پر افسوس ہوا مگر وہ ان کے معاملے میں بھی بے بس تھا اور اس معاملے میں بھی بے بس تھا وہ کسی کے ساتھ ظلم کرنے والا نہیں تھا وہ ان لوگوں میں سے تھا ہی نہیں جو عورتوں پر رعب جماتے ہیں وہ ان لوگوں میں سے تھا ہی نہیں جو کسی پر ظلم کر سکتے ہیں۔

"میں جا رہا ہوں کمرے میں تم میرے لئے چائے بنا کر لے آنا۔"

کھانا کھانے کے بعد وہ آغا جان سے بات کرنے کی نیت لیے اٹھا مگر وہاں سے جانے سے قبل زینی کو ہدایت دینا نہ بھولا۔زینی نے ایک نظر کشف کی جانب دیکھا جو اپنا چہرہ چھپا کر ہنس دی۔زینی نے خفت سے سر اثبات میں ہلا دیا۔بہرام سنجیدگی سے اسے دیکھتا وہاں سے چل دیا۔وہ بھی ٹھیک سے اپنی قسمت پر نازاں بھی نہ ہو سکی کہ پل بھر میں روبینہ کسی آفت کی طرح وارد ہو گئی۔

"چل اٹھ تجھے بی جان نے بلایا ہے۔"

زینی نے تھوک نگلا۔اب اس کی سخت پیشی تھی۔مرتی کیا نہ کرتی محاورے پر عمل کرتی وہ جلدی سے اٹھی۔ہاتھ دھونے کے بعد وہ رومانہ کے ہمراہ بی جان کی کمرے کی جانب بڑھ گئی۔رومانہ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور ایک جانب ہو گئی۔وہ اندر گئی تو رومانہ بھی پیچھے پیچھے چلی آئی۔میز کے قریب ادھر سے ادھر ٹہلتی کشف کی پریشان نظریں دروازہ پر جمی ہوئی تھیں۔وہ کیا کرے؟ایک دم اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھی۔

☆☆☆☆☆

وہ کمرے میں آئی تو بی جان ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھیں۔اسے آتا دیکھ کر اپنے بستر پر جا بیٹھیں۔اس نے اطراف میں نظریں گھما کر حالات کا جائزہ لیا۔صبور خانم بھی وہیں تھیں۔وہ بے تاثر انداز میں اسے دیکھ رہی تھیں۔

"جی بی جان"

وہ ایسی معصومیت سے بولی کہ بی جان بھی عش عش کر اٹھیں۔

"کیا کہا ہے تم نے بہرام خاناں کو؟"

انہوں نے سخت لہجے میں کہا۔وہ حیرانی سے بی جان، پھر صبور اور آخر میں روبینہ کی جانب دیکھنے لگی۔

"میں نے کچھ نہیں کہا انھیں۔وہ خود ہی۔۔۔"

وہ بولنے والی تھی جب روبینہ تیزی سے آگے بڑھی۔ایک بخش اور ایک روبینہ، یہ انہی لوگوں میں سے تھے جنھے مالک کے سامنے اچھا بننا ہوتا ہے۔

"بکواس کرتی ہے۔خاناں پر الزام لگاتی ہے۔"

اس نے زینی کی چوٹی پکڑ کر اسے ادھر سے ادھر زور سے گھمایا۔زینی اس شدت پر بلبلا کر رہ گئی۔بی جان خاموشی سے بیٹھی تھیں تنفر بھری نظریں اسی پر مرکوز تھیں۔صبور خانم نے چہرہ موڑ لیا تھا۔

"میں کہہ رہی ہوں ناوہ خود۔۔۔"

بات مکمل کر پاتی اس سے قبل ہی روبینہ نے زور دار تھپڑ دے مارا۔تھپڑ کی شدت ایسی تھی کہ وہ زمین پر جا گری۔چند پل خاموشی کی نظر ہوئے،گہری خاموشی۔زینی گہرے سانس بھرے خود پر ضبط کر رہی تھی۔پھر وہ ایک دم اٹھی۔اب تک وہ روبینہ کا لحاظ ہی تو کر رہی تھی مگر اب مزید نہیں۔وہ بھی تو انسان تھی۔مگر جب حویلی میں کسی نے اب تک اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا تو روبینہ کون تھی یوں ہاتھ اٹھانے والی۔

"آپ کی ہمت کیسے ہوئی مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی؟"

اس کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔گال پر تھپڑ کا نشان بہت واضح تھا۔اپنی تکلیف کو پس پشت ڈالے اسے اپنی اہانت کا احساس مار رہا تھا۔روبینہ نے حیرت سے اسے دیکھا پھر گردن موڑ کر تماشا دیکھتی بی جان کو۔

"زبان چلائے گی؟"

اس نی دوبارہ ہاتھ اٹھانا چاہا جب ایک دم زینی نے اس کا وہ ہاتھ ہوا میں ہی روک دیا۔

"ہمت بھی مت کیجیے گا۔طعنے مارنے ہیں سو بار ماریں مگر آپ نہیں،صرف بی جان اور حویلی کے لوگوں کو حق ہے ایسا کرنے کا،ان کا لال مرا ہے۔آپ کا کچھ نہیں گیا سو آپ کا کوئی حق بھی نہیں ہے۔"

اس کا چہرہ لال بھبھوکا تھا۔بی جان بھی ٹکر ٹکر اسے دیکھ رہی تھیں۔بہرام کی ذرا سی توجہ نے اسے اتنی ہمت دی تھی تو اگر وہ محبت بھی اسی سے کر بیٹھا اسے بیوی تسلیم کر گیا تو کیا ہو گا؟بی جان کو حویلی کا مستقبل تاریک نظر آیا انہوں نے فورا سے سر جھٹکا روبینہ خفگی سے بی جان کی جانب دیکھ رہی تھی۔

اس کا غصے سے برا حال تھا جبکہ صبور خانم ایک بار پھر سفیر کے ذکر پر اداس ہو گئی تھیں اسی لیے کمرہ چھوڑ کر چلی گئی ان کی جائے کے فورا بعد کشف اندر آئی اس نے ارد گرد دیکھ کر حالات کی سنگینی کو بھانپا۔بی جان کا غصہ،روبینہ کی بری حالت اور زینی کا چہرہ اسے سب بتا گیا اس سے پہلے کہ حالات مزید بگڑتے،اس نے اپنا لہجہ سخت بنایا۔

"لڑکی باہر اب تک میز پر برتن کیوں پڑے ہیں فورا جا کر برتن اٹھا۔"

وہ ان کے سامنے اس کے لیے آپ جناب والا طرز مخاطب بھی نہ اپنا سکی اسے دلی طور پر اپنے اس رویے پر افسوس تھا مگر مزید وہ زینی کو ادھر نہیں چھوڑ سکتی تھی اسی لیے بہانہ بنا کر وہاں سے رخصت کیا زینی نے اس کی جانب دیکھا۔

بھیڑ میں کوئی تو اس کا ہمدرد تھا اس کا دل بھر آیا مگر وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔وہ سر جھکا کر باہر نکلی اور میز پر پڑے برتن اٹھا کر رسوئی میں رکھنے لگی۔

برتن رسوئی میں رکھ لئے تو انہیں دھونے کے لئے اس نے نل کھولا۔جیسے ہی نل کھولا اس کے آنسو بہہ نکلے لیکن اس نے سختی سے انہیں پونچھ ڈالا۔حویلی کے باقی لوگوں کو حق تھا کہ وہ اس کے ساتھ سخت لہجہ اپناتے،اسے طعنے دیتے،اسے مارتے مگر روبینہ جو کہ ایک ملازم تھی اسے ایسا کوئی حق حاصل نہیں تھا کہ وہ زینی کی عزت کو مجروح کرے۔نہ تو اسے ایسا کوئی حق حاصل تھا اور نہ ہی زینی نے ایسا کوئی حق اسے دیا تھا۔

بہرام کے ذرا سے نرم لہجے نے اسے بہت ہمت دے ڈالی تھی۔کہاں وہ کسی کے سامنے کچھ نہیں بولتی تھی اور کہاں اب اس میں اتنی ہمت آگئی تھی۔کہاں وہ ان کے کھانے کے بعد بچا کھانا کھاتی تھی اور کہاں آج سب کے ساتھ بیٹھ کر کھا رہی تھی۔اسے بار بار رونا آرہا تھا۔اس کا محسن اب تک اس کا محسن تھا اور وہ کتنا ہمدرد آدمی تھا۔اتنا سب کچھ ہونے کے بعد بھی اس نے زینی سے حویلی کے باقی لوگوں کی طرح نفرت نہیں کی تھی،نہ ہی اسے طعنے دے رہا تھا۔

اسے امید نہیں تھی کہ اسے صبر کا پھل اتنا بہترین ملے گا۔اگر بہرام ہمیشہ اس کا ساتھ یونہی دیتا رہے تو وہ بہت جلد اس حویلی میں اپنا مقام حاصل کر لے گی۔وہ خوش فہم نہیں ہونا چاہتی تھی مگر بہرام کا رویہ اسے خود یہ موقع فراہم کر رہا تھا۔اب وہ دلی طور پر خوش فہم ہونا بھی چاہتی تھی۔مزید وہ دوسروں کے طعنے اور مار برداشت نہیں کر سکتی تھی۔اب بہت ہو چکا تھا۔کیا اس کے نصیب میں ہر طرف سے ٹھکرانا ہی لکھا تھا۔پیدا کرنے والے ماں باپ نے چھوڑ دیا تھا۔جنہوں نے پالا انہوں نے اپنے مفاد کے لیے اسے ونی بنا دیا اور اب کیا سب یہ چاہتے تھے کہ وہ سانس لیتی جاگتی انسان اپنے خوابوں کو مار دے؟کیا یونہی؟سانس بھی ان کی مرضی سے لے؟جیے بھی انکے لئے؟مرے بھی ان کے لئے؟سفیر تو مر گیا اب اس کے قتل کی پاداش میں وہ بھی مر جائے؟لاتعداد سوال اس کے ذہن میں منڈلا رہے تھے اور جواب یہی تھا کہ اب اسے اپنے حق لیے کھڑا ہونا تھا۔مزید وہ روبینہ کے طعنے برداشت نہیں کر سکتی تھی۔باقی اسے کہنے کا حق رکھتے تھے مگر روبینہ؟وہ کوئی حق نہیں رکھتی تھی۔

وہ رات دیر تک رسوئی کا کام کرتی رہی اسے بالکل بھول گیا کہ بہرام کے لئے چائے لے کر جانا تھی۔وہ تو اپنی سوچوں میں مگن تھی اور وقت گزرتا رہا۔باہر تاریکی مزید چھا رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

جب سے جاڑے کا آغاز ہوا تھا سردی خوب جم کر برس رہی تھی اس سال تو سردی نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ پورے زوروں سے برسے گی۔اٹاری میں انگیٹھی جل رہی تھی۔کوئلوں کے چٹخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

کھانا کھانے کے بعد سے اب تک وہ وہیں بیٹھے تھے کونے میں چارپائی لگائی گئی تھی جس پر گل شیر سر جھکائے بیٹھے تھے۔بیوی سے کیا وعدہ تو پورا کر چکے تھے مگر جو وعدہ انہوں نے خود سے کیا تھا وہ پورا نہ کر سکے یہ غم انہیں دن بہ دن اندر سے مارتا جا رہا تھا مگر وہ کیا کرتے؟وہ تقدیر کے سامنے بے بس تھے۔بس اسی بے بسی کو روتے رہتے۔قمر کا

دکھ بھی ان سا تھا۔اس نے لڑکپن کی محبت کھوئی تھی۔یہ دکھ کم نہ تھا کہ اب وہ کسی اور کی تھی۔ایسا نہ کبھی چاہا تھا ،نہ سوچا تھا اور یہ کیا ہو؟

یہ تقدیر نے کیا کر دیا؟وہ خواب جو اس نے بھنے تھے۔وہ امید کے جگنو جو زینی کی آنکھوں میں جگمگاتے تھے۔کیا اب بھی جگمگاتے ہوں گے ؟کیا اب بھی وہ مسکراتی ہو گی؟اسے یاد کرتی ہو گی۔سوچیں ذہن میں گردش کر رہی تھیں اس کی نظریں سامنے دہکتے کوئلوں پر تھیں۔

☆☆☆☆☆

آغا جان کے کمرے میں سناٹا اور خاموشی تھی۔وہ آغا جان کے سامنے خاموشی سے بیٹھا تھا۔آغا جان تند ہی سے اسے گھور رہے تھے۔

"تو پھر کیا تھا وہ سب جو تم نے کھانے کے میز پر کیا تھا؟ایک ونی لڑکی کو میرے برابر لا بٹھایا؟تمہیں اندازہ ہے کہ تم نے ہمیں کتنا خوار کروایا ہے۔ذمہ دار ہے وہ قتل کی،تمہارے سگھے بھائی کے قتل کی۔"

وہ تنفر سے بولے۔بہرام نے گہرا سانس بھرا۔

"آغا جان یہ بات آپ دوسری بار کر رہے ہیں۔میں بتا تو رہا ہوں۔قتل کی ذمہ دار وہ نہیں اس کا بھائی تھا۔تو سزا کیوں ایک لڑکی کو ملے ؟بلا فرض دینی بھی ہو تو کیوں دیں ہم کسی کو سزا؟ہمیں حق نہیں۔"

وہ بے زاری سے بولا۔عجیب عقیدے بنے ہوئے تھے۔اور عجیب رسمیں۔بہرام کو کئی بار سوچ سوچ کر غصہ آتا تھا۔کہ وہ کسی کی زندگی برباد کرنے میں برابر کا شریک ہے۔

"چار جماعت پڑھ کر مجھے مت سکھاو۔جتنی تمہاری عمر ہے اس سے زیادہ تجربہ ہے میرے پاس۔تمہاری آنکھوں پر اس کے حسن کی پٹی چڑی ہے۔اتار لو خمار،پھر دل بھر گیا تو چھوڑ دینا اسے اس کے حال پر جو اس کی اوقات ہے۔پر اسے ہمارے برابر نہ لاؤ۔"

وہ کیا کہہ رہے تھے؟ کیا بات کر رہے تھے؟ اس کی بیوی کے لئے ایسی باتیں؟ اس کے کردار پر ایسی ضرب؟ کیا وہ دل پھینک مرد تھا؟ اسے آغا جان سے ایسی باتوں کی توقع نہ تھی۔ وہ کچھ غلط نہ بول دے اسی خوف سے اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھا جب آغا جان کی آواز سنائی دی۔

"کدھر جا رہے ہو؟ عمل کرنے؟"

ان کے لہجے میں برچھی کی کاٹ تھی۔ بہرام نے خود پر ضبط کرنا چاہا۔ پھر دانت کچکچائے۔

"میں خود کو کچھ کہنے سے باز رکھ رہا ہوں۔ آپ کو احساس نہیں مگر مجھے ہے کہ میرے منہ سے کوئی ایسا لفظ نہ نکل جائے جو آپ کی دل آزاری کا سبب بنے۔ اس لئے معذرت۔"

ٹھک کی آواز سے دروازہ بند ہوا تھا۔ پھر کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔

☆☆☆☆☆

وہ کمرے میں آیا تو بے چینی سے ادھر، ادھر ٹہلنے لگا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ آغا جان اس پر ایسا بے ہودہ الزام لگائیں گے۔ اس کی بیوی کے لئے ایسے الفاظ کا استعمال کریں گے۔ وہ جیسی بھی تھی اس کی بیوی تھی۔ وہ دوسروں کے ساتھ حق تلفی کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ جس روز اس نے اس سے نکاح کیا تھا اسی روز وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ کبھی بھی اس کا حق نہیں مارے گا۔ وہ اسے اس کا وہ حق دلا کر رہے گا جو اس کا اصل حقدار ہے اور وہ معصوم سی تھی۔ گاؤں کی باقی لڑکیوں کی طرح بھولی بھالی، اسے ترکیبیں نہیں آتی تھیں۔ وہ سادی زندگی کی عادی سادی سی معصوم لڑکی تھی۔ جس روز بہرام نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس روز وہ سفیر سے خوفزدہ تھی اس کی وہ خوفزدہ ہرنی جیسی آنکھوں میں بہرام کا دل اسی روز ڈوب گیا تھا۔

اس کے لئے اپنا فرض سب سے زیادہ اہم تھا اور فرض کے سامنے اس کے لئے کوئی انسان معنی نہیں رکھتا تھا یہاں تک کہ اس کی اپنی ذات بھی اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ فرض کی پکار پر وہ دوڑا چلا جاتا تھا جیسے اس روز

وہ فوراواپس لوٹ گیا تھاورنہ وہ اس کے حق کے لئے وہیں رہتااور اسے اس کا حق دلاتا۔وہ لڑکی تھی، بہت ہی معصوم تھی، کم عمر، بھولی بھالی لڑکی، وہ اسے اس مقام پر دیکھنا چاہتا تھا جہاں حویلی کی باقی عورتیں تھیں۔وہ دل سے چاہتا تھا کہ وہ بھی کھل کر جیے اور اپنا مقام حاصل کرے۔ابھی تک اس نے سفیر کے قتل پر تفتیش کا آغاز نہیں کیا تھا۔وہ ان پنچایت کے فیصلوں کو نہیں مانتا تھا۔نہ ہی وہ ایسی کسی رسم کو خاطر میں لاتا تھا۔وہ سفیر کے قتل کا معاملہ خود دیکھنا چاہتا تھا مگر وہ چاہتا تھا کہ کچھ عرصے بعد اس کیس پر کام شروع کرے۔

پہلی بار زینی سے اس کی ملاقات ہونااور زینی کا سفیر سے خوفزدہ ہو کر بھاگنا پھر مزید یہ کہ اس روز بھی وہ زینی کو ہی اپنے ڈیرے پر اٹھالایا تھا جس کی خبر اسے اس کے مخبر نے دی تھی۔وہ اس سے قبل وہاں پہنچنا چاہتا تھاوہ اپنے بھائی کو روکنا، اسے بچانا چاہتا تھا مگر وہ اسے بچانہ پایا۔اس نے اسے باز رہنے کا کتنا کہا مگر وہ سفید جھوٹ بول گیا شاید تقدیر میں اس کی موت ایسے ہی لکھ دی تھی اور ازل سے طے تھی مگر اب جب زینی ونی بن کر ہی صحیح اس کے نکاح میں آ گئی تھی تووہ رتی برابر بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی حق تلفی کرے۔اسے اس کے اس حق سے محروم رکھے۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ حویلی کے باقی لوگ اب مزید زینی کے ساتھ غلط رویہ اپنا کر رکھیں۔اور آج آغاجان کی باتوں نے اسے صحیح معنوں میں تکلیف پہنچائی تھی۔وہ کبھی بھی آغاجان کے منہ سے ایسی باتیں نہیں سننا چاہتا تھا مگر آج آغاجان نے جو باتیں کی تھیں ان باتوں نے بہرام کو بہت دکھ پہنچایا تھا۔اس کا دماغ بہت سی باتیں سوچ رہا تھا سر درد سے پھٹا جارہا تھااور کوئی راہ سجھائی نہ دے رہی تھی۔لاشعوری طور پر وہ چائے کے انتظار میں تھا مگر چائے نہیں آئی شاید وہ کسی کام میں مصروف تھی اسے جا کر دیکھنا چاہیے کہ نہیں؟کیا اس وقت زنان خانے جانا مناسب تھا کہ نہیں؟مگر اس نے تمام سوچوں کو پس پشت ڈالا اور گھڑی کی جانب دیکھا۔گھڑی رات کے گیارہ بجے کا پتہ دے رہی تھی۔وہ آہستہ سے کمرے سے نکل آیا۔اپنے پیچھے دروازہ بہت ہی آہستہ آواز سے بند کیا اور راہداری سے ہوتا زنان خانے کی جانب بڑھا۔زنان خانے میں گہرے اندھیرے نے اس کا استقبال کیا۔حویلی میں سب کو دس بجے

تک سو جانے کی عادت تھی۔ دس بجے ہر کوئی اپنے بستر کو چلا جاتا تھا۔ اس کا مطلب کے اب تک وہ بھی سو چکی تھی۔ اس نے سوچا پھر رسوئی کی جانب بڑھا۔ وہاں گہرے اندھیرا تھا۔ اس کا مطلب وہ یہاں بھی نہیں تھی۔ وہ جانے کے لئے مڑنے والا تھا جب اسے کسی کے سسکنے کی ہلکی سی آواز آئی۔ وہ لمحوں میں پہچان گیا کہ یہ کون ہو سکتی تھی۔ اس نے سوئچ بورڈ پر ہاتھ مارا تو لمحے میں رسوئی خانے میں دن کا سماں ہو گیا۔ ایک دم ہی اتنی روشنی پھیلی کے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھے چند پل تک خود کو اس ماحول سے روشناس کروانا چاہا ۔جب بینائی اس ماحول سے روشناس ہوئی تو اس نے ارد گرد نظر دوڑائیں۔ کونے میں سلیب کے ساتھ نیچے زمین پر سر جھکائے وہ بیٹھی تھی۔ غالباً بتی جلنے پر ہوش میں آئی تھی اور اب وہ مزید سسک نہیں رہی تھی۔

"زینی؟"

وہ ہلکی آواز میں اسے پکارتا اس کے قریب آیا۔ زینی نے جلدی سے رخ موڑ کر آنسو چھپا لئے کہیں وہ اس کے آنسو ہی نہ دیکھ لے مگر وہ کیا جانے کہ جن سے روحوں کا رشتہ جڑ جاتا ہے وہ تو آپ کی ایک تکلیف کو محسوس کر کے بے بس ہو جاتے ہیں۔ نکاح روحوں کے ملنے کا ہی تو نام ہے۔

"جی؟"

وہ خود کو قدر سنبھال کر بولی اس کی جانب دیکھنے سے وہ گریز کر رہی تھی بہرام اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھا۔

"چائے مانگی تھی؟"

اس سے یہ سوال جان بوجھ کر نہیں کیا کہ تم کیوں رو رہی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا اس کا دل دوبارہ بھر آئے گا وہ شاید اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی، اپنا بھرم قائم رکھنا چاہتی تھی بہرام کو یاد آیا ان کی چھت پر جو ملاقات ہوئی تھی وہ کتنی خوشگوار ملاقات تھی۔ تب وہ کس طرح اس کی ہر بات کا جواب دے رہی تھی اور اب محض چند مہینوں میں وہ کتنا بدل کر رہ گئی تھی۔ رنگت پیلی پڑ چکی تھی جیسے سارا خون نچڑ گیا ہو۔ آنکھوں کے گرد حلقے بھی نمایاں

ہونے لگے تھے۔وہ کہیں سے بھی چہکتی ہوئی لڑکی معلوم نہیں ہوتی تھی جو اس روز بہرام کو ہر بات کا جواب فوراً دے رہی تھی۔

"جی بنا دیتی ہوں۔"

اچھا تھا کہ اس نے زینی سے یہ نہیں پوچھا کہ تم کیوں رو رہی تھی کیونکہ اگر وہ پوچھ لیتا تو زینی کیلئے اپنے آنسوؤں پر قابو پانا مشکل ہو جاتا یہ اچھا تھا کہ اب بھرم کا پردہ قائم تھا۔بہرام خاموشی سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا جب کہ وہ اس کے لئے چائے بنانے کا انتظام کر رہی تھی۔

"تم نہیں پیو گی؟"

بہرام نے اچانک سوال پوچھا۔اس نے حسرت سے چولہے پر پکتے دودھ کو دیکھا اس کا کتنا دل چاہتا تھا کہ چائے پیے جب وہ گھر رہتی تھی تو پھوپھی روزانہ اسے دو کپ چائے دیتی تھی گھر کا دودھ تھا تو کھلے سے چائے پیتی تھی یہاں اسے چائے بنا کر پینے کی اجازت نہ تھی اگر ہوتی بھی تو روبینہ اسے پینے ہی

نہ دیتی تھی اسے بس ایک وقت کی چائے ملتی تھی وہ صدا سے چائے کی دیوانی تھی اور وہ ایک وقت کی چائے بھی ہفتے میں دو تین بار ہی نصیب ہوتی۔اس کا دل کیا کہہ دے میں نے بھی پینی ہے مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش رہ گئی اور دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"مجھے چائے نہیں پسند۔"

بہرام چند پل اسے خاموشی سے دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ کر فریج سے دودھ کا پتیلا واپس نکالا اور اس کے قریب رکھا۔

"پھر آج میرے کہنے پر میری خوشی کے لئے ہی ایک بار پی کر دیکھو میں سچ کہہ رہا ہوں کہ تمہیں پسند آئے گی۔"

زینی کی آنکھوں میں پانی آنے لگا جسے اس نے کمال مہارت سے چھپالیا مگر بہرام دیکھ چکا تھا وہ جانتا تھا کہ زینی اس سے جھوٹ بول رہی ہے اور حویلی والوں کے خوف سے ہی انکار کیا ہے۔ مگر بہرام نے اتنے خوبصورت طریقے سے اسے پیشکش کی تھی کہ اس کے بھرم کا پردہ بھی قائم رہا۔ چائے بن گئی تو اس نے ہچکچاتے ہوئے بہرام کے نکالے دو کپ میں چائے نکالی۔

"آپ نے تکلف کیا۔ میں پیالی میں پی لیتی۔"

وہ کہہ نہ پائی کے اگر میں کپ میں پیوں گی تو مجھے ایک بار پھر صلواتیں سننے کو ملیں گی۔ بہرام ہلکے سے مسکرایا اور وہ باہر کی جانب کھلتی کھڑکی کے ساتھ آن کھڑا ہوا۔

"کوئی بات نہیں دھو کر خشک کر کے رکھنا، کسی کو علم بھی نہیں ہو گا۔"

زینی نے اثبات میں سر ہلایا اسے بہرام کی تجویز پسند آئی تھی وہ اپنا چائے کا کپ تھامے زمین پر بیٹھنے ہی والی تھی جب بہرام بول اٹھا۔

"زمین پر نہیں بیٹھو گی تم یا تو ادھر میرے پاس آ کر کھڑی ہو جاؤ یا پھر کرسی پر بیٹھو۔"

وہ نرم لہجے میں اسے سمجھا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس کی ہر بات کو سمجھے اور اپنا مقام پہچانے۔ زینی نے نفی میں سر ہلایا۔

"ایسی بات نہیں ہے میں اپنے گھر میں بھی ایسے ہی بیٹھی تھی آپ کو پتا ہے۔۔۔"

وہ کچھ کہتے کہتے رکی۔ بہرام کو افسوس ہوا۔ وہ کم از کم اس سے کچھ حد تک ہی سہی مگر بات تو کر رہی تھی۔ لیکن ابھی بھی جھجھکتی تھی۔

"ہاں بولو کیا ہوتا ہے تمہارے گھر میں؟"

وہ نرم لہجے میں بولتا اس کے قریب چلا آیا پھر وہیں بغیر کچھ بولے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ زینی خاموشی اور حیرانی سے اس کی جان یک ٹک دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ سفیر کا بھائی تھا؟ کیا یہ اس خاندان کا وارث تھا؟ کیا یہ سردار کا بیٹا تھا؟ کیا یہ ملک کا خدمت گزار تھا کہ جس کے نام سے دشمن خوف کھاتے تھے کون تھا یہ؟

زینی کا خاموشی سے اس کی جانب دیکھتے رہنا، بہرام کو سمجھ آگئی کہ وہ کیوں اسے یوں دیکھ رہی ہے۔ حیرانی تو بہرام کو خود بھی ہوئی تھی مگر اس کو سمجھانے کے لیے بہرام کو اس کے لیول تک ضرور آنا تھا۔ تبھی وہ اسے سمجھا سکتا تھا اور پھر وہاں سے لئے اس سے اپنے لیول تک لے جا سکتا تھا۔ کبھی کبھی ہم سمجھتے ہیں کہ مقابل کو ہم ایک ہی لمحے میں سمجھا لیں گے اور اسے اپنے مقام یعنی اپنے لیول تک فوراً لے جائیں گے لیکن در حقیقت کسی انسان کو سمجھانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے آپ اس کے لیول یا اس کے مقام تک پہنچو۔ پھر وہاں سے اسے لے کر اپنے مقام اور لیول تک جاؤ۔ ایسے نہ تو آپ کی شان میں کمی آئے گی اور نہ ہی اس کی شان میں کمی آئے گی بلکہ ایسے آپ کے درمیان جو رشتہ ہے اس کی خوبصورتی مزید بڑھ جائے گی۔

بہرام ان مردوں میں سے نہیں تھا جسے یہ سب باتیں معمولی لگتی تھیں۔ وہ عام مردوں میں سے نہیں تھا کہ جسے بیوی کی برابری کرنا پسند نہیں تھا۔ اس کے نزدیک یہ رشتہ برابری کا رشتہ تھا اور اسے برابری سے نبھانا ہی ضروری تھا۔ اگر اب وہ اس کی بقا کے لئے اور اس کی اچھے مستقبل کے لیے اس کے سامنے گھٹنے ٹیک بھی دے گا تو آگے جا کر وہ برابری کے رشتے پر چل پائیں گے۔

"سائیں آپ نیچے کیوں بیٹھے ہیں؟ آپ اٹھیں آپ کو زیب نہیں دیتا۔ آپ میری عادتیں بگاڑ رہے ہیں۔ اگر یہاں کسی نے یوں دیکھ لیا تو آپ کو کچھ نہیں کہیں گے۔ ساری آفت مجھ پر ہی آئے گی۔"

بات کی آخر میں اس نے منہ بسورا اور ایسا کرتے ہوئے وہ بہت ہی پیاری لگی بہرام نے مسکراہٹ دبالی۔

"اللہ کی زمین ہے سب کو بیٹھنے کا حق ہے۔ کیا خاص؟ کیا عام؟ جانا تو اسی مٹی میں ہے۔"

وہ یاسیت سے بولا اسے قبرستان کا واقعہ یاد آنے لگا مگر اس نے سر جھٹکا اور اس کی جانب متوجہ ہوا جو کہ اپنا کپ زمین پر رکھے کپ کی سطح پر انگلی پھیر رہی تھی۔ وہ عام لڑکیوں کی نسبت اپنی عمر سے خاصی بڑی لگتی تھی۔ سادی پلین گلابی قمیض شلوار پر کوٹ پہن رکھا تھا۔ اوپر سے ایک کالی بڑی سی چادر لے رکھی تھی۔ غالباً یہ کپڑے بھی کشف کے تھے۔

"آپ کو پتا ہے۔۔۔ یہاں سب بہت اچھے ہیں۔ کشف بی بی تو سب سے اچھی ہیں۔ خجستہ بھی بہت اچھی ہیں۔ بی جان ڈانٹتی ہیں مگر وہ مارتی نہیں ہیں۔ آغا جان تو میری جانب دیکھتے بھی نہیں ہیں۔ آپ کی امی، بڑی امی، بڑے ابا اور چھوٹے ابا ان کا رویہ بھی کچھ خاص نہیں ہے۔ آپ کو پتا ہے جب میں چھوٹی ہوتی تھی۔"

یہ بات اس نے ایسے کی تھی جیسے اب بہت بڑی ہو گئی۔

"گاؤں کی کوئی لڑکی جب ونی ہوتی تھی تو میں یہ سنتی تھی کہ عورتیں اس کے نصیب پر باقاعدہ رویا کرتی تھیں۔ ان کے گھروں میں ماتم ہوتا تھا اور ان کے لیے وہ لڑکی مر جاتی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ آج یہ لڑکی مر گئی ہے۔ ان کے ساتھ جو جا رہی ہے وہ زندہ لاش ہے میں اس بات کو سمجھتی نہیں تھی۔ مجھے میری دوست نے بتایا تھا کہ جو لڑکیاں ونی ہوتی ہیں، ان کے گھر والے اس لیے روتے ہیں کیونکہ ونی کو کوئی حق نہیں ملتا کہ وہ اپنی مرضی سے جی سکے، سانس لے سکے۔ اسے کوئی حق نہیں ہوتا کہ وہ کچھ کہہ سکے، کوئی بات کر سکے۔ اپنی تکلیف، اپنا درد بیان کر سکے۔ ہنن۔۔۔"

وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی بہرام خاموشی سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا جسے شاید آج اس حویلی میں پہلی بار کوئی ایسا شخص ملا تھا جس سے وہ اپنے جذبات کا اظہار کر سکتی تھی۔ وہ بس خاموشی سے سن رہا تھا۔ وہ سننا چاہتا تھا کی آخر وہ کیا سوچتی ہے۔

"وہ دور تھا کہ جب میں اس بات پر بہت ہنسی تھی تو سمی نے کہا کہ توبہ کرو۔ونی کی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔اس دن کے بعد ہماری کبھی اس موضوع پر بات ہی نہیں ہوئی تھی۔پھر ایک دن ہماری زندگیوں میں وہ سیاہ دن آگیا۔جس دن نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔میری ذات،میری حیثیت،میرے خواب،میری حسرتیں سب ختم ہو گیا۔میں ونی ہو گئی۔مجھے لگا جب میں یہاں آؤں گی تو میں مر جاؤں گی۔حویلی والے مجھے بہت ظالم لگتے تھے۔۔۔مگر یہ سب ظالم نہیں ہے یہ بس رویوں کی مار مارتے ہیں۔یہ انسان کو مارتے پیٹتے تو نہیں بس رویّوں سے مار رہے ہیں۔آپ کو پتا ہے رویوں کی مار سب سے بری مار ہوتی ہے۔یہ میں نے یہاں آکر جانا ہے۔میں نہیں جانتی کہ آپ کو مجھ سے ہمدردی ہے یا آپ واقعی سچ بول رہے ہیں مگر میں نہیں چاہتی کہ آپ میری عادتیں خراب کریں۔آپ یہاں سے چلے جائیں گے تو اس کے بعد میں یہاں دوبارہ سے نہیں رہ پاؤں گی۔میری جو حیثیت ہے مجھے اس میں رہنے دیں تاکہ مجھے بعد میں بھی کسی دشواری کا سامنا نہ ہو۔خدانخواستہ اگر میری عادتیں بگاڑ دیں اور بعد ازاں انہیں عادتوں کی وجہ سے مجھے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو میں بکھر جاؤں گی اور ایسا میں بالکل نہیں چاہتی۔"

وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ گئی۔چائے کا کپ ان چھوا پڑا تھا۔مزید بھاپ نہیں اڑ رہی تھی۔بہرام بس خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا جو لمحہ بہ لمحہ اس سے دور ہو رہی تھی۔یہاں تک کہ وہ رسوئی سے نکل کر راہداری میں کہیں گم ہو گئی۔شیشے کی کھڑکی پر دھند چھا رہی تھی۔گہری دھند،مناظر چھپا دینے والی دھند،ہر شے چھپا دینے والی دھند۔

☆☆☆☆☆

اٹاری میں چولہا چل رہا تھا جس کے سبب سردی کی شدت میں کچھ حد تک کمی تھی۔قمر انگیٹھی کے پاس سینے پر بازو لپیٹے بیٹھا تھا۔پاس ہی دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ایک چارپائی پر گل شیر بیٹھا کوئی حساب کتاب کر رہا تھا جب کہ دوسری چارپائی پر رومانہ بیٹھی تھیں۔مرتضی صبح سویرے ہی گھر سے نکل چکا تھا۔اس نے ساتھ کے گاؤں کے چوہدری کے ہاں ملازمت شروع کر دی تھی کیونکہ یہاں گاؤں میں مزید کوئی ڈھنگ کی نوکری نہیں تھی اور پیٹ

کا ایندھن بجھانے کو یہ ضروری تھا کہ کوئی نہ کوئی کام کیا جاتا۔ صحن میں سونو سر جھکائے برگد کے درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ جانوروں کو سردیوں میں باڑے میں ہی ٹھہرایا جاتا تھا لیکن سونو کی کوئی عجیب ہی ضد تھی شاید اس نے اتنے روز سے اپنی مالکن کو نہ دیکھا تھا اسی لئے اس کا جی اداس تھا۔ اسی لئے وہ اسی جگہ پر منجمد بیٹھا تھا کئی بار قمر کوشش کر چکا تھا کہ کسی نہ کسی طریقے سے اسے باڑے میں چھوڑ آئے مگر وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا۔

بیرونی دروازہ بج اٹھا تو انگیٹھی میں جان بوجھ کر مٹی ڈالتا قمر چونکا۔

"جا قمر دروازہ کھول دیکھ کون آیا ہے۔"

رومانہ بیزاری سے بولیں۔ قمر سر اثبات میں ہلاتا اٹھا۔ ایک امید تھی کہ کیا پتا دروازہ کھولنے پر سامنے وہ ہو مگر یہ بھی بس امید تھی جو چند ثانیے بعد ہی کسی ہوا کی زد پر پڑے دیے کی مانند بجھ گئی۔ دروازے پر محلے کی کوئی عورت تھی آج شاید بڑے روز بعد کوئی عورت آئی تھی۔ یقیناً افسوس کرنے۔

گل شیر رومانہ کے کہنے پر اٹاری سے اٹھ کر کمرے کی جانب چل دیا۔ تاکہ وہ عورت پر سکون ہو کر بیٹھ سکے۔ قمر اب برگد تلے جا چکا تھا جس کے پتے پت جھڑ کے سبب مرجھا چکے تھے۔ وہ وہاں بیٹھے سونو کی پیٹ سہلانے لگا۔

"ہم دونوں ایک سے ہیں۔ جسے چاہا اسے کھو دیا۔"

وہ یاسیت سے بولا۔ سونو کو یہ بات پسند نہیں آئی تو اس کے منجمد بدن میں حرکت پیدا ہوئی اگلے ہی لمحے اس نے باڑے کی جانب دوڑ لگا دی۔ قمر نے سر درخت کے تنے سے ٹکا دیا۔ منڈیر خالی تھی۔ وہاں اب کبوتر نہیں تھے۔

☆☆☆☆☆

وہ عورت کیا کہہ گئی تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا؟ وہ ورطہ حیرت بیٹھی تھیں۔ ان میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ ناشتہ ہی بنا پاتیں۔ وہ ابھی تک اس دھچکے سے باہر نہیں آئی تھیں۔

"یہ کسی حقیقت ہے؟ زینی ہمارا خون نہیں تھی؟ میرے لالے کے نصیب میں اپنی اولاد تھی ہی نہیں۔"

وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔ اٹاری سے جھانک کر دیکھا تو کمرے سے گل شیر نکل رہا تھا۔ گہرے رنگ کی چادر اوڑھے وہ سردی سے کپکپاتا اٹاری کی جانب آرہا تھا۔ غالباً انگیٹھی کی خاطر۔

"لو پورا گاؤں جان گیا تمہیں پتا ہی نہ چلا۔ وہ تو سب کو پنچایت پر ہی پتا چل گیا تھا جب ولدیت کے خانے میں نام بدلا تھا۔"

اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ گل شیر اب اندر آچکا تھا۔ رنگین چارپائی پر تکیہ رکھے وہ نیم دراز ہو چکا تھا انگھیٹی بھی کھسکا کر پاس رکھ لی تھی۔ رومانہ نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ پہلے سے بڑھ کر بوڑھا ہو گیا تھا۔ جھریوں زدہ چہرے پر ایسا لبادہ چڑھا لیا تھا کہ یہ غم اللہ کے سوا کسی کے سامنے کھلنے میں ہی نہیں آتے تھے۔

"گل شیر اتنا صبر کہاں سے آیا؟"

وہ ایک دم بولی تو سامنے کی دیوار تکتا گل شیر چونکا۔ پھر ہلکے سے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا اور آسمان کی جانب اشارہ کیا۔

"زیادہ باتیں نہیں بناؤں گا بس یہی کہ اللہ کی طرف سے آیا ہے وہی اختیار رکھتا ہے ہر شے پر۔ میرا تو نفس بھی میرے اپنے قابو میں نہیں تو اتنی باتیں بنا کر کیا ملنا ہے۔"

اٹاری میں اب خاموشی تھی محض کوئلوں کے چٹخنے کی آواز آرہی تھی۔ جس بات کا بھرم اب تک قائم تھا اس کا بھرم آگے بھی قائم رہنا چاہیے تھا۔ رومانہ نے وہیں اس بات کو دفن کر دیا تھا۔ تھی تو وہ انھیں جان سے بھی عزیز اور رہنی تھی، شاید ہمیشہ۔ وہ ساتھ ہو یا نہ ہو۔ انسان سے محبت کا اندازہ اس کی موجودگی یا غیر موجودگی سے نہیں لگایا جاتا۔ اس کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔ محبت تو وہ ہوتی ہے کہ دور ہوں یا پاس، قابلِ رسائی ہوں یا نا قابلِ رسائی، عزت اور چاہت پھر بھی برابر رہے اور بڑھتی رہے۔ محبت دید نہیں احساس مانگتی ہے۔

☆☆☆☆☆

اس کے امتحانات کا آغاز ہو چکا تھا۔اسے سینٹر پر لینا اور چھوڑنا بخش کی ذمہ داری تھی۔خجستہ بھی ساتھ ہوتی تھی۔ پچھلے دو روز سے وہ محسوس کر رہی تھی کہ سینٹر کے باہر سامنے کی طرف درختوں کے پاس کوئی ہیولا کھڑا ہوتا ہے جو اشاروں میں اسی سے مخاطب ہوتا ہے۔اسے جیسے گمان تھا کہ وہ مرتضیٰ ہے۔شاید وہ زینی کے بارے میں فکر مند تھا اور اسی کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔بخش گاڑی سے بھر ٹہل رہا تھا اور خجستہ غائب تھی۔آج تیسرا روز تھا۔وہ پرچہ دے کر سینٹر سے باہر آئی تو بخش کو گاڑی کے ارد گرد گھومتا پایا۔

"خیر ہے؟"

اس نے قریب آکر پوچھا۔بخش چونکا اور سر جھکائے گاڑی کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔

"بی بی سرکار وہ خجستہ کو اپنا کوئی دوست مل گیا تھا اور وہ اس کے ساتھ باتیں کرتا نہ جانے کس جانب نکل گیا۔مجھے ابھی ڈیرہ بھی دیکھنا ہے جا کر۔میں فارغ تھوڑی ہوں۔"

وہ خفگی سے بول رہا تھا۔کشف کو اس کا یوں بڑھ چڑھ کر بولنا ایک آنکھ نہ بھایا۔مانا کہ اسے اب ڈیرے کا مکمل اختیار مل گیا تھا مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ یوں بڑھ چڑھ کر رعب جمائے۔

"سب سے پہلے نظریں جھکائیں یہ ہمارا حکم ہے۔دوسری بات یہ کیا خجستہ کو حق ہے وہ ہماری ملازمہ خاص ہیں۔ہمارے ساتھ ہیں جہاں آئیں جائیں اس سے آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔اپنی حدود میں رہیں،بخش صاحب۔"

اس کا لہجہ بلا رعایت تھا۔بخش نے غصے سے رخ موڑ لیا۔

"ایک مصیبت ہٹائی تھی راستے اس نئی آگئی۔"

وہ بڑبڑایا۔اتنے میں سامنے سے خجستہ آتی نظر آئی۔بخش نے سر جھٹکا اور گاڑی میں جا بیٹھا۔وہ قریب آئی تو کشف نے اس کی آنکھوں سے ہی اس کی حواس باختگی بھانپ لی۔

"خیر کی خبر ہو؟"

گاڑی کا انجن چل چکا تھا مگر وہ باہر کھڑی تھیں۔

"حویلی چلیں پھر بتاتی ہوں مگر فلحال مڑ کر مت دیکھیے گا مرتضیٰ صاحب کھڑے ہیں۔"

خجستہ کی بات پر اس کا دل دھڑک اٹھا جی چاہا ابھی مڑ کر دیکھ لے مگر اس کام میں مرتضیٰ ہی کی جان کو رسک تھا۔ بخش اگر ذرا سا بھی بھانپ لیتا تو مسئلہ بن جاتا۔ وادیِ سوات میں جاڑے کا موسم زوروں پر تھا۔ ایسی سردی کہ رگ و جان میں اتر کر کپکپانے پر مجبور کر دے۔ دل، دماغ، اور ذات کو منجمد کر دے۔ جاڑے کے بکھرے پتوں کی کڑکڑاھٹ فضا کو مزید بوجھل بنا رہی تھی۔ زن سے گاڑی گزری تو کئی پتے روندھے گئے تو کئی اڑ کر دور جا گرے۔ نقاب کی اوٹ سے جھانکتی وہ جھیل آنکھیں سڑک پار جاتے آدمی کی پشت تک رہی تھیں۔ جو مڑ کر دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے یاسیت سے گردن واپس موڑ لی۔ سڑک پار کرتے مرتضیٰ کے دل و دماغ میں جو جنگ چلی تو دل ہی فتح یاب ہوا نہ صرف ہوا بلکہ اسے گردن موڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ محبت میں الہام نہ ہو تو کیا خاک محبت؟ دلوں پر الہام ہوتے پاکیزہ جذبے، جن کے زیر اثر نا جانے کس الہام پر اس نے بھی گردن موڑی۔ فاصلہ بے شک گزرتے ہر پل بڑھ رہا تھا مگر اک یقین اور مان تھا جس کا رشتہ مضبوط ہو رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

وہ بہت ہمت والا مرد تھا۔ رشتوں کو بچانے والا۔ محبت و پیار بانٹنے والا۔ اسے تھوڑا وقت مل جاتا تو شاید وہ سفیر کی جان بھی بچا لیتا۔ شاید وہ اسے بھٹکنے سے بچا لیتا اسے روک لیتا۔ پاؤں بھی پڑنا پڑتا تب بھی پڑ جاتا بس اسے کہہ دیتا کہ اپنے نفس کا غلام نہ بن۔ اسے چھوڑ دے۔ مگر نہ اسے مہلت ملی نہ بہرام کو وقت۔

وہ کھڑکی میں کھڑا تھا۔ نظریں باہر لان میں جما رکھی تھیں۔

زینی ٹھیک کہتی تھی وہ کیوں اس کی عادتیں بگاڑ رہا ہے اگر وہ یہاں مستقل نہیں رہتا تو کیوں اس کی عادتیں خراب کرے۔ لیکن عادتیں تو وہ اس کی خراب کرنے والا تھا اور اس بات کا وہ عہد کر چکا تھا۔ وہ سوچ چکا تھا کہ اب کی بار یہاں سے اکیلا نہیں جائے گا۔

اس کا ذہن شروع سے لے کر آخر تک ہر واقعے کو سوچ رہا تھا۔ زینی سے ہوئی ہر ملاقات اور اس میں زینی کی شخصیت کا ہمیشہ مختلف ہی ہونا۔ وہ ایک اچھی لڑکی تھی باقی لڑکیوں کی طرح شاید اس کے بھی خواب ہوں گی جو اس گھٹیا رسم کے سبب دم توڑ گئے ہوں گے۔

"کاش مرتضیٰ سفیر کو جان سے نہ مارتا۔"

اس نے کھڑکی سے سر ٹکا دیا۔

"کیا وہ مار سکتا ہے؟"

ایسے ہی اس کے ذہن میں خیال آیا۔ اس نے سر جھٹکا۔ ذہن پنچایت کی جانب گیا اور پھر مرتضیٰ کا اقرار کرنا یاد آیا۔

"میری ان سے بحث ہو گئی تھی۔ اپنے دفاع کی خاطر میں نے گلدان سے ان پر ایک وار کیا تھا جس کی وجہ سے ان کا سر پھٹ گیا اور وہ موقع پر مر گئے۔ بس یہی وجہ تھی۔۔۔"

مرتضیٰ کی آواز کی بازگشت ہوئی۔ تو کتنی اس بات سے وابستہ تکلیف دہ یادوں نے دل پر دستک دی۔ وہ کھڑکی سے ہٹا۔ پردہ گرانے کو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دل دھک سے رہ گیا۔ ہاتھ پہلو میں جا گرا۔

"ایک وار کیا تھا جس کی وجہ سے۔۔۔"

بازگشت پھر سے سنی۔ دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا وہ بستر پر جا بیٹھا۔ کیس اتنا سیدھا نہیں تھا۔

"ایک وار؟"

اسے ایسا لگا جیسے سفیر لوٹ آیا ہے۔ جیسے اس سے سوال کر رہا ہے۔ اس کا سانس گھٹنے لگا۔ یہ حویلی والوں سے کیا ہو گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

وہ لال بھبھو کا چہرہ لئے ارد گرد چکر کاٹ رہا تھا۔ صائم بستر پر بیٹھا اس کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔

"آرام کر لے زعیم، آدھے گھنٹے سے ریل کا انجن بنے گھوم رہے ہو۔ ایسے کرنے سے ویب سائٹ سے وہ تصویریں ریموو تو نہیں ہو جائیں گی۔"

کل ہی کسی نے ان کے فیشن کی خاصی دھجیاں اڑاتے ہوئے پوری یونیورسٹی کو ان کے نہار منہ کا درشن کروانے کو ان کی تصویر یونیورسٹی کی آفیشل ویب پر ڈالی تھیں۔ ستم یہ کہ کیپشن میں نہ صرف انھیں مینشن کیا بلکہ اچھے خاصے امیج کا بیڑا غرق کر دیا تھا۔ اگر کچھ روز سے تانیہ نامی مصیبت یونی نہیں آ رہی تھی تو اب یہ نئی مخلوق آ نکلی تھی۔

"ڈیٹیل نکلوا کون ہے یہ بابا کی پرنسس۔ لکھوا لے اس آئی ڈی کے پیچھے کوئی اماں کا منا ہی ہو گا۔"

زعیم کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

"فکر کیوں کرتے ہو؟ ہم بھی بابا کا گڈا نام کی آئی ڈی بنا کر اس بابا کی پرنسس کو گھیرتے ہیں۔"

زعیم کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

"ہے ویسے تو انتہا کا نکما پر کبھی کبھی اچھا لگتا ہے۔"

وہ اس کے برابر میں آ بیٹھا اور اب اقبال کے شاہین بابا کے گڈے بن گئے تھے۔ بابا کی پرنسس پھنسانا مقصود تھی جو بھی لازماً اقبال ہی کا کوئی شاہین تھا۔

☆☆☆☆☆

ناشتے کے بعد ہی آغا جان اور بی جان نے سب کو لاؤنج میں بلوالیا تھا۔ خجستہ کی زبانی اسے علم ہوا تھا کہ صبح سے ہی بڑوں کا اجلاس بیٹھا ہوا تھا۔ ایسی کیا بات تھی؟ وہ ورطہ حیرت تھی۔ دل۔ دھک دھک کر رہا تھا۔ کیا ہونے والا تھا۔ ایسا بھی کیا فیصلہ تھا۔ ذہن اور دل غلط ہونے کا پتا دے رہے تھے۔ وہ اوپر ہی رہی اور خجستہ کی زبانی بی جان کو اطلاع بجوادی کہ میں اوپر کھڑی ہو کر ہی سب سن لوں گی۔

آہستہ، آہستہ سب وہاں جمع ہو گئے۔ بی جان سے آغا جان اور ان سے لے کر سلیمان خان اور زمان خان تک چاروں مطمئن تھے۔ بہرام رات بھر کا جاگا معلوم ہوتا تھا مگر وہ بھی ان کے درمیان بیٹھا تھا۔ صبور خانم اور سبین خانم بھی ایک جانب خاموش بیٹھی ان کے فیصلے کو سننے کی منتظر تھیں۔ نا جانے کیا فیصلہ ہوا تھا۔ اتنا سب جانتے تھے کہ کل کے واقعہ پر بہرام کو چھوٹ نہیں ملنی تھی مگر انھیں دیکھنا تھا کہ آخر سزا کیسے اور کیا ملنا تھی۔ صبور خانم دعاوں میں مشغول تھیں۔

"ہم نے ایک فیصلہ کیا ہے۔"

آغا جان کی آواز نے سکوت توڑا۔ سب کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔

"کیسا فیصلہ؟" صبور خانم نے بے چینی سے پوچھا۔

"آرام سے خانم۔۔۔ اتنا مت گھبراؤ یہ تو خوشی کی خبر ہے۔"

بی جان مسکراتے لہجے میں بولیں۔ بہرام سمیت، کشف بھی چونکی۔

"ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اگلے جمعہ بہرام خاناں اور کشف کی شادی کر دی جائے۔"

رسوئی میں دم سادھے کھڑی زینی کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر گرا۔ چھناکے کی آواز سے وہ ٹوٹ کر کئی حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

اپنی کہنے سنانے کے بعد آغا جان جا چکے تھے۔ بہرام بھی غصے میں واک آؤٹ کر گیا۔ کسی نے اسے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ صبور خانم اور سبین خانم بی جان کے اشارے پر ان کے کمرے کی جانب بڑھ گئیں، اب انھیں شادی کی تیاریوں کا آغاز کرنا تھا۔ کچن میں داخل ہوتی روبینہ نے تمسخر سے زینی کے پیلے چہرے کو دیکھا اور قہقہہ لگایا۔ زینی نے فوراً نظروں کا زاویہ بدل لیا۔ اس کی خوشیوں کی عمر ہمیشہ مختصر ہوتی تھی۔ عجیب ہوتی ہیں یہ خوشیاں بھی، قلیل وقت کے لیے ہوتی ہیں مگر انسان کو اس قلیل وقت میں بھی اپنا غلام بنا چھوڑتی ہیں، انسان پر حاکم بن کر راج کرتی ہیں، انسان بھی ان کے دھوکے میں آسانی سے آجاتا ہے، وہ لاشعوری طور پر سوچتا ہے کہ شاید اب ہمیشہ خوشیاں ہی اس کا نصیب ہیں مگر خوشیوں کے ان چمکتے ستاروں کو غم کے بادل جلد ہی گرہن لگا دیتے ہیں تب انسان کو اپنی اوقات کا اندازہ ہو جاتا، غم کے وہ بادل تمسخر سے اسے دیکھ کر جیسے بڑبڑاتے ہیں کہ ہوش کی دنیا میں لوٹ آؤ کیوں کہ نہ تو تم کوئی شہزادی ہو اور نہ ہی دنیا ڈزنی لینڈ کہ جہاں تمہاری کہانی کے آخر میں "happily everafter" لکھا جائے گا۔ اس نے پلکیں جھپک جھپک کر آنسوؤں کو پیچھے دھکیلنا چاہا مگر آنسو تھے نا، اسی لیے بغاوت پر اتر آئے۔

"چچ چچ۔۔۔ اسی لیے شروع دن سے میں تمھیں اپنے رویئے سے سمجھا رہی تھی کہ اوقات میں لوٹ آؤ۔ انسان اوقات سے زیادہ سو جائے تو میٹھے خواب تلخ زندگی کی حقیقت دیکھنے ہی نہیں دیتے۔ تجھے روئیوں کی مار ماری تاکہ تو ہوش کی دنیا میں آجائے، تو ونی ہے اور ونی خواب دیکھنے کو پیدا نہیں ہوئی۔"

وہ لفظوں کے تیر نشتر کر کے جا چکی تھی۔ واقعی انسان اوقات سے بڑھ کر خواب دیکھ لے تو ہر ٹوٹتی امید نئے سرے سے اذیت میں دوچار کرتی ہے۔ غم میں دلاسا دینے والے لوگ کم، تکلیف دینے والے زیادہ کندھا دے دیتے ہیں، پھر بے شک وہ دل توڑے یا زخم چیرے۔

"اس کی باتوں کو دل پر نہ لے۔ سوہنا مالک کوئی سبب بنا ہی دے گا۔"

خجستہ اس کے کندھے تھپتھپا کر جا چکی تھی۔لوگ جتنا بھی کہہ لیں کہ فلاں کی بات دل پر نہ لینا مگر زبان سے نکلے شعلے دل جلا کر ہی دم لیتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

اسے انتہا سے زیادہ غصہ آرہا تھا۔ آغا جان نے راتوں رات یہ فیصلہ محض اس کا جی جلانے کو کیا تھا۔ پھر ایک دم ہی اس کے ذہن میں ایک خیال لپکا۔اس نے فوراً سے گاڑی ڈیرے کے راستے پر ڈال دی۔ایک سوچ اب مسلسل اس کے ذہن میں ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ مستعد گارڈ نے حویلی کی گاڑی دیکھ کر تیزی سے گیٹ کھولا اور سلام کیا۔ سر ہلا کر بہرام نے سلام کا جواب دیا۔ گاڑی پتھریلی روش پر فراٹے مارتی جا رہی تھی۔ چڑ کی آواز سے گاڑی رکی۔ برآمدے میں گاؤ تکیے لگائے بیٹھا بخش چونکا تیزی سے مڑ کر دیکھا جہاں گاڑی کا دروازہ کھولے بہرام گاڑی سے نکلا تھا۔نیلے آسمانی کرتا شلوار میں کھیڑی کی چھب ہی نرالی تھی۔اوپر سے چلنے کا انداز۔ بخش تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔اس جگہ کا کرتا دھرتا اب وہی تھا مگر مالکوں کے آنے پر وہ پھر سے غلام ہی ہوتا تھا۔دوسری جانب بہرام کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ کبھی یہاں اس کا بھائی ہوتا تھا۔اس کے جگر کا ٹکڑا۔ جسے ہر بار دیکھ کر دل نئے سرے سے خوش ہوتا تھا۔ڈیرے میں تب زندگی کی رمق نظر بھی آتی تھی مگر اب سب ہوتے بھی اس ایک شخص کی کمی سے سب ادھورا لگ رہا تھا۔اتنی دیر میں بخش وہاں آچکا تھا۔

"سلام سرکار، آمد کی اطلاع موصول ہی نہیں ہوئی۔"

اس نے محتاط انداز میں کہا، ساتھ ہی گردن موڑ کر پیچھے کھڑے دو ملازموں کو اشارہ کیا۔اشارہ ملتے ہی وہ اندر کی جانب بڑھ گئے۔اندر سے صفایا بھی تو کرنا تھا۔

"کیا میں بتانے کا پابند ہوں؟"

اس کا لہجہ عام مگر سپاٹ تھا اور اوپر سے اس کی سرد آنکھیں۔ بخش نے تھوک نگلا۔

"میرا وہ مطلب نہیں تھا، سرکار، اطلاع مل جاتی تو ہم بہتر طریقے سے آپ کی خاطر مدارت کر سکتے تھے۔" چاپلوسی کرتے لہجے میں بول کر اس نے گردن گھما کر پیچھے کام کرتے ایک نوکر کو آواز دی۔

"سرکار حاکم ہیں ہمارے، تو نے سلام کرنا بھی گوارا نہیں سمجھا؟"

شاید یہ بات بدل دینے کا طریقہ تھا۔ اس لڑکے نے گھبرا کر ان کی جانب دیکھا۔ سفیر سرکار ایسی غلطیاں معاف نہیں کرتے تھے اور اب یہ نجانے کیا کرتے۔ اس نے تھوک نگل کر کچھ بولنا چاہا کہ اس سے قبل ہی ہاتھ اٹھا کر بہرام نے اسے بولنے سے روک دیا۔ پھر پاس آنے کا اشارہ کیا۔ وہ لڑکا سر جھکائے اس کی طرف چلا آیا۔ باقی ملازم اپنے کام میں مصروف ہو گئے تھے۔ جانتے تھے کہ اب اس لڑکے کی شامت پکی ہے۔ بہرام کیاریوں کی طرف چل دیا، اس لڑکے نے بھی بہرام کی پیروی کی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

گلاب کے پودے دیکھتا وہ مصروف سے انداز میں بولا۔

"دل۔۔۔ دلاور خان" اس نے کانپتے لہجے میں جواب دیا۔

"تو ایسا ہے دلاور کہ مجھے بہت اچھا لگا جب تم اپنے کام میں مصروف رہے۔ کون آیا ہے؟ وہ کیا ہے اس کی پروا کیے بغیر۔ کوئی انسان کسی پر حاکم نہیں ہو سکتا۔ انسان تو اپنی ذات پر بھی حاکم نہیں ہے۔ جب انسان کا اپنے نفس پر قابو آجائے اس وقت وہ خود پر حاکم ہو گا اس سے قبل تو اسے نفس پر قابو رکھنے کے لیے بھی رب سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ حاکم صرف رب کی ذات ہے۔ تم پر، مجھ پر اور اس کل ارض و سماء کی ہر شے پر۔ انسانوں سے متاثر ہونا چھوڑ دو۔ یہ اکیسویں صدی ہے۔ اب مالک اور غلام کا فرق اور رشتہ پرانا ہوتا جا رہا ہے۔ کوشش کرو کہ دوسروں کو بھی یہ سب سکھاؤ۔ تم کام کرنے کی اجرت لیتے ہو، محکوم بننے کی نہیں۔"

بات کے آخر میں نرم سی مسکراہٹ اس کی جانب اچھال کر وہ دوسری جانب چلا گیا۔ دلاور نے نم آنکھیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ رب کے بھلے بندوں سے زمین بھری پڑی تھی۔ کیسا شخص تھا وہ؟ متاثر کر گیا اور یہ بھی کہہ گیا کہ انسانوں سے متاثر ہونا چھوڑ دو۔

☆☆☆☆☆

جاڑے کی کڑکڑاتی شام کی زردی مائل رنگت اب بوسیدہ پڑ چکی تھی۔ شجر پر موجود چرند بھی اب گھونسلوں میں جا چھپے تھے۔ آسمان کی چادر پر افشاں انڈیلنے کا وقت ہوا جا رہا تھا۔ فضا میں مغرب کی اذانوں کی صدا گونج رہی تھی۔ تین اذانیں دی جا چکی تھیں۔

پکے صحن کے کونے میں بنے کمرے میں گھر کے مکیں دبکے بیٹھے تھے۔ سردیوں کی شامیں جلد ہی چھانے لگتی ہیں۔ ابھی چھ بھی نہ بجے تھے اور باہر رات کا سماں تھا۔ کمرے کے کونے میں انگیٹھی پڑی تھی جس میں کوئلوں کے چٹخنے کی آواز برابر آ رہی تھی۔ ایک چارپائی پر مرتضی لیٹا ہوا تھا۔ چہرے پر رضائی ڈال رکھی تھی اسی لیے اس کے جاگنے یا سونے کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ پاس کچھ کتابیں پڑی تھیں، سرِ ورق سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ قانون کی کتابیں ہیں۔ اس نے مزید آگے پڑھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کب تک وہ دوسروں کے نوکر بن کر کام کرتا رہے گا۔ گل شیر اس کے اس فیصلے پر خوش تھے۔ کم از کم اس نے تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ تو کر لیا تھا۔ وہ دو دن بعد لاہور جا رہا تھا۔ گاؤں میں کوئی انھیں اب قبول ہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مرتضی چاہتا تھا کہ یہاں سے سب بیچ کر وہ شہر چلے جائیں۔ آغاز پر تو کرائے کا گھر ہی لینا ہو گا۔ بعد ازاں سب ٹھیک ہوتا جائے گا۔ انھیں زینی کے لیے بے انتہا دکھ تھا۔ دل پر پتھر رکھ کر بیٹی دے تو دی تھی مگر اب وہ پھانس عمر بھر سینے میں چبھنا تھا۔ رومانہ کے کہنے کے مطابق کہ جب تک یہاں رہیں گے، لوگوں کی نظروں اور باتوں کا جواب دے دے کر ویسے ہی تھک جائیں گے۔ قسمت نے

اس کے لیے بہتر لکھا ہوا تو وہ دوبارہ اس سے ضرور ملیں گے۔ کمرے میں تپش بڑھتی جا رہی تھی۔ رومانہ کے ٹرنک میں کپڑے رکھتے ہاتھ تھمے۔

"قمر، انگیٹھی اٹاری میں رکھ دے۔ دیکھیو ہاتھ نہ جلا لیو۔"

صفحے پر لکیریں کھینچتے قمر نے ذرا کی ذرا سر اٹھایا پھر سر واپس گرا لیا۔ کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ رومانہ پھر سے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ باہر لکڑی کا دروازہ بجنے لگا تو قمر کو ہوش آیا۔ ہر دستک پر اسی کے آنے کا گمان ہوتا تھا۔ وہ تیزی سے لحاف ہٹاتا اٹھا اور باہر کو لپکا۔ دروازہ کھولنے پر ایک بار پھر اس کی نگاہیں ناامید لوٹ آئیں۔ اس نے زنجیر چھوڑی اور اندر کی جانب بڑھ گیا۔ تپش بڑھ رہی تھی واقعی انگیٹھی کو اب اٹاری میں ہونا چاہیے تھا۔ گل شیر اندر آئے تو چہرہ خوشی سے دھمک رہا تھا۔

"السلام علیکم"

با آواز بلند سلام کر کے وہ مرتضی کے بستر کی طرف چلے آئے۔ انھوں نے آہستہ سے لحاف ہٹایا تو مرتضی نے بند آنکھیں کھولیں۔ بھورے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں بے رونق تھیں۔

"مجھے لگا شاید سو چکے ہو۔"

انھوں نے اس کے ماتھے سے بال ہٹاتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ وہ دھیمے انداز میں مسکراتا سر نفی میں ہلاتے اٹھ بیٹھا۔

"نہیں بس ستا رہا تھا۔"

"مبارک ہو، رہائش کا انتظام ہو گیا ہے۔" گل شیر نے رومانہ کے ہاتھ سے پانی کا گلاس پکڑتے ہوئے دبے، دبے جوش سے کہا۔ مرتضی نے چونک کر انھیں دیکھا۔

"مجھے لگا تھا کہ ابا کام پر ہیں۔" وہ سپاٹ انداز میں بولا۔

"گیا تو کام پر تھا پر وہاں رفیق کی دکان پر بچپن کا دوست مل گیا، بختیار اور میں سکول تک ساتھ پڑھے تھے، پھر میں آگے پڑھ نہ پایا اور وہ لاہور چلا گیا۔ اس کا ذاتی مکان ہے وہاں۔ باتوں سے بات نکلی تو میں نے اسے لاہور جانے کی بابت بتایا، اس نے اپنے مکان کے اوپر والے پورشن کو کرائے پر دینا تھا، میں نے موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ مناسب قیمت تھی تو میں ایڈوانس دے آیا ہوں۔"

بات کے آخر میں ان کے لہجے میں جوش آ گیا۔ جیسے انھیں اس بات کی بے انتہا خوشی ہو۔ مرتضی نے اثبات میں سر ہلایا اور دھیمے انداز میں مسکرایا۔ نظر گل شیر پر گئی جن کے مسکراتے چہرے کی جوت پھر سے بجھ چکی تھی۔ وہ بنا سنے بھی جان گیا کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔

"اس کی فکر مت کریں۔ میں آخری بار کچھ بھی کر کے اس سے مل کر ضرور جاؤں گا۔"

اس کے لہجے میں ہلکی سی لغزش تھی۔ مگر اس نے جلد اس پر قابو پا لیا۔

"ہمممم"

اس کے بعد ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ کچھ زخم بہت گہرے ہوتے ہیں، اتنے گہرے کہ کتنا ہی خوشی کا موقع ہو، کمبخت مجال ہے جو مسکرانے بھی دیں۔

☆☆☆☆☆

رات کی سیاہی مائل چادر پورے آسمان کی روشنی مٹا چکی تو مسافروں کی راہنمائی کو چاند نے تاریک چادر پر اپنی روشنی بکھیرنا ضروری سمجھی۔ ٹمٹماتے ستاروں نے بھی چاند کا مقابلہ کرنا ضروری سمجھا۔ گاؤں کی فضا میں مقدس خاموشی کا ڈیرا تھا۔ کپاس کی فصلوں میں سے گزرتی ٹھنڈی ہوائیں فصلوں میں ہلچل مچاتیں اور چند پل بعد پھر خاموشی چھا جاتی۔ کچی، پکی پگڈنڈیوں کے کنارے لگے لاتعداد اونچے چیڑ کے درخت خالی ڈالیوں سمیت ہیبت ناک معلوم ہو رہے تھے۔ کہیں دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں برابر آ رہی تھیں۔

حویلی اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پتھریلی روش چاند کی روشنی میں نہائی معلوم ہو رہی تھی۔ کنارے پر بنے عوض میں چاند سمیت حویلی کا عکس بھی نمایاں ہو رہا تھا۔ گارڈ دروازے کے پاس چارپائی ڈالے لحاف میں دبکے سو رہے تھے۔ ہوا زور سے چلی تو پتوں کے کڑکڑانے، ڈالیوں کے ہلنے کی آواز آئی اور ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ کسی نے حویلی کی پچھلی دیوار سے دالان میں چھلانگ لگائی۔ دو پل خاموشی کی نظر ہوئے اور پھر وہ ہیولا دیوار کے ساتھ دم سادھے آگے کی جانب بڑھنے لگا۔ چہرہ کالی چادر کے سبب چھپا ہوا تھا۔ ان سے جھانکتی آنکھیں اضطراب کی کیفیت میں ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔

☆☆☆☆☆

جب سے اس نے یہ خبر سنی تھی کہ آغا جان نے اس کا رشتہ بہرام خان سے طے کر دیا ہے وہ جلے پاؤں کی بلی بنی پورے کمرے کے چکر کاٹ رہی تھی۔ انگلیاں اتنی بار چٹخا چکی تھی کہ اب انگلیوں میں بھی درد ہونے لگا تھا۔ وہ کیا کرے؟ انکار؟ کبھی یہ خیال آتا تو کبھی یہاں سے بھاگ جانے کا خیال آتا۔ سوچ، سوچ کر وہ بے حال ہو رہی تھی اور ہر دروازہ تھا کہ بند نظر آ رہا تھا۔

کمرے میں چلتے بلب کی پیلی روشنی منظر واضح کر رہی تھی۔ کالے ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں، اس کے بھورے بال کمر ڈھانپے ہوئے تھے۔ ناک کی نتھ چمک رہی تھی۔ آنکھوں میں الجھن، بے زاری اور غصہ تھا۔ دل بس ایک شخص کا نام لیتا دھڑک، دھڑک کر بے حال ہو رہا تھا۔ اس کے سوا کوئی نام سننے کو نہ دل تیار تھا، نہ دماغ۔ وہ نہ تو خانزادی تھی، نہ حویلی والوں کی بیٹی، تو کیوں وہ اپنے جذبات کی قربانی دے کر ان کی محبت امر کرے، کیوں وہ ان کے پوتے کے لیے اپنی زندگی جہنم بنا دے۔ وہ آغا جان کے سامنے، حویلی کے کسی دوسرے فرد کے سامنے جب مرتضی کا نام نہیں لے سکتی تھی تو کیوں وہ خواہ مخواہ قربانی کی مثال بنے۔ اسے مرتضی کے پاس جانا تھا۔ اسے اپنی

محبت کی قربانی نہیں دینی تھی۔ اسے نہ ہی قربانی کی عظیم مثال بن کر تاعمر تکیے بھگونے تھے۔ اسے کون سا روز زندگی ملنا تھی۔ اس نے گالوں پر آئے آنسو تیزی سے صاف کیے اور الماری کی طرف بڑھی۔

☆☆☆☆☆

وہ ہیولا اندازے لگاتا رسوئی سے پیچھے کی جانب جاتے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ ہینڈل آرام سے گھمانا چاہا مگر بے سود۔ اس نے ارد گرد دیکھا۔ ہر جانب خاموشی کسی ذی روح کے نہ ہونے کی اطلاع تھی۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے تیکھی نوک والا چاقو نکالا پھر احتیاط سے لاک میں ڈال کر اسے مہارت سے گھمایا۔ اگلے پل ٹک کی ہلکی آواز سے لاک نے دروازے کے کھلنے کا پتا دیا۔ اس نے چاقو جیب میں ڈالا اور آہستہ سے دروازہ دھکیلا جو آرام سے بنا آواز کے کھل گیا۔ دھک، دھک کرتے دل کو سنبھال کر اس نے اندر قدم رکھا۔ رسوئی میں گھپ اندھیرا تھا اس نے آنکھیں زور سے بند کیں اور پھر کھولیں اب منظر کچھ حد تک واضع تھا۔ اس نے ہر قدم پھونک پھونک کر رکھا۔ یہاں اس سے ذرا سی چوک ہو گی وہاں اس کی لاش بھی کسی کو نہیں ملے گی۔ اس لیے ضروری تھا کہ جوش سے زیادہ ہوش سے کام لیا جائے۔ نجستہ نے اسے بتایا تھا کہ زینی کو کس کمرے میں ٹھہرایا گیا ہے۔ وہ راہداری میں آیا تو گھپ اندھیرے نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے ارد گرد محتاط انداز میں دیکھا اور اس کوٹھڑی تک چلا آیا۔ وہ ہاتھ ڈال کر دروازہ کھولنے ہی والا تھا کہ اندر سے آتی ہلکی آوازوں پر چونک کر رکا۔

"کیوں جاؤں میں آپ کے کمرے میں؟"

تیکھی سی یہ آواز زینی کی تھی۔ جواباً کوئی دھیمے انداز میں ہنسا۔

"محترمہ زینی صاحبہ اگر تم بھول گئی ہو تو میں یاد کروائے دیتا ہوں کہ تم میرے نکاح میں ہو اور بیوی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اپنا بستر علیحدہ کرے۔"

بہرام نے مسکراتے ہوئے نرم آواز میں کہا۔ زینی نے نظریں اٹھا کر اس کی گہری آنکھوں میں جھانکا۔

"وہاں آپ کی دوسری بیوی آنے والی ہے۔مجھے بھی زیب نہیں دیتا کہ میں خاوند اور بیوی کے ذاتی مسائل کا حصہ بنوں۔میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ مجھے اتنے خواب مت دکھائیں،مجھے زیب نہیں دیتا خواب دیکھنا۔"

زینی کے لہجے میں اب کی بار گہرا دکھ تھا۔بہرام کے دل کو کچوکا لگا۔باہر کھڑے مرتضی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔وہ بہرام کا جواب سننے کو بے تاب تھا۔آج کی رات یا تو وہ یہاں زینی کو خدا کی امان میں چھوڑ کر جانے والا تھا یا پھر ساتھ لے جانے کو آیا تھا۔

بہرام نے گہرا سانس بھرا،دو پل خاموشی کی نظر ہوئے پھر بہرام قمیض جھاڑتا اس کے بستر کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا۔مسکراتی نظر اس پر ڈال کر ہاتھ بڑھایا۔

"مجھے خود پر بھروسہ ہے،اور میرا بھروسہ مجھے یہ کہتا ہے کہ بہرام خان تم بس ایک بیوی کے ساتھ ہی انصاف کر سکتے ہو،لہٰذا تمھیں زیب نہیں دیتا کہ تم خدا کو مزید ناراض کرو اور کسی کے دل کو دکھانے کا سبب بنو۔"

اس کے لہجے میں بہت مٹھاس اور نرمی تھی۔زینی کا دل یکبارگی سے دھڑکا ان کی ہر ملاقات اس کی نظروں کے سامنے سے گزری۔دل مسکرا اٹھا۔

"مم۔۔۔مطلب؟"

اس نے نا سمجھی کی اداکاری کی۔

"مطلب یہ کہ میں شادی نہیں کرنے والا،مگر حویلی والوں کا دماغ درست کرنا بھی ضروری ہے۔۔۔"

وہ مزید بھی کہہ رہا تھا مگر دل میں ڈھیروں اطمینان لیے خدا کا شکر ادا کرتے مرتضی وہاں سے ہٹا اور ایک بار پھر خاموشی سے اندھیرے کا حصہ بنتا گیا۔

☆☆☆☆☆

وہ پچھلے حصے کی طرف آیا پھر ارد گرد دیکھ کر دوسری جانب مڑا، مڑنے کی دیر تھی کہ کسی نسوانی وجود سے ٹکرا گیا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ اس سے دور ہوا۔ گہرا سانس بھرے اس نے اپنے حواس بحال کیے۔ گہرے اندھیرے میں اس بات کا اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ نسوانی وجود کس کا ہے۔ دوسری جانب کشف کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا تھا، آخر کون تھا وہ جو اس سے ٹکرا گیا؟ کہیں بہرام؟ پہلا خیال یہی تھا جس نے دماغ کو جکڑ لیا تھا۔

"کون ہے؟" بالآخر مرتضی نے ہمت کر ہی لی۔ یہ آواز؟ یہ تو وہ ہزاروں میں بھی پہچان سکتی تھی۔ اس کا دل یکبارگی سے دھڑک اٹھا مگر سوال یہ تھا کہ وہ یہاں کیوں تھا؟ اور اس پہر؟ قسمت کا اتفاق حسین تھا۔

"مرتضٰی" اس کے لبوں سے سرسراتی آواز نکلی۔ دوسری جانب مرتضی کے لیے جیسے کل کائنات تھم گئی تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ یہ شاید اس کا وہم تھا۔ وہ آج کل کشف کے بارے میں بہت سوچنے لگا تھا۔ یہ غالباً اس کا وہم ہی تھا۔ وادیِ محبت میں رقصاں محبت اس بے خبری پر دھیمے سے مسکرا دی۔ الہام نے اپنے سنہرے پر سمیٹے اور کسی اور دیس کی سیر کو نکل گیا، ایک اور کہانی لکھنے۔ محبت اور الہامِ محبت فتح مند ٹھہرے تھے۔ غلام شہزادے کے دل میں شہزادی کے لیے محبت بالآخر پیدا ہو ہی گئی تھی۔

"یہ آپ ہی ہیں نا؟ مرتضی جواب دیں۔" وہ آہستہ آواز میں دوبارہ چلائی۔ دیوار کی جانب رخ موڑے کھڑے مرتضی کا دل تھم سا گیا۔ کیا یہ حقیقت تھی؟ لمحے کے ہزارویں حصے میں اس نے رخ موڑا اور اس جانب دیکھا۔

"آپ حقیقت ہیں؟"

اس نے بے خبری سے کہا تو کشف غیر متوقع جواب پر چونکی آنکھیں سکیڑ کر چاند کی روشنی میں اس کا چہرا دیکھنا چاہا جو نیم اندھیرے کے سبب خاص واضع نہیں تھا۔

"میرا مطلب ہے۔۔۔ آپ یہاں کیا کر رہی ہیں خانزادی صاحبہ؟"

اس نے جلد خود پر قابو پایا اور گلہ تر کرتے بات بدل کر رکھ دی۔

"کیا یہ سوال ہمیں آپ سے نہیں پوچھنا چاہیے؟"

اس نے جواب میں سوال پوچھ لیا۔ مرتضی چند لمحے اندھیرے میں کھڑے اس ہیولے کو دیکھتا رہا۔ دل و دماغ میں جنگ جاری تھی۔ کیا اسے بتا دینا چاہیے؟ اس کا دل توڑ دینا چاہیے؟ یہ سوچ اس کا اپنا دل توڑ رہی تھی۔ کیا ستم تھا یہ؟ وہ اس حویلی کا ہی بیٹا تھا مگر وہ کھل کر اپنا حق بھی نہیں مانگ سکتا تھا۔ وہ تنہائی میں خود کو ناجائز کہنے پر روپڑتا تھا وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ دنیا اسے ناجائز سمجھے۔ کل حویلی والے اسے اپنا خون ماننے سے انکار کریں گے تو پرسوں دنیا اسے انسان ماننے سے انکار کر دے گی۔ غربت سے ہی سہی مگر عزت تو نصیب تھی۔ جس بات کا پردہ رب نے ڈال دیا تھا، بندہ ہو کر اسے کیا حق تھا کہ اسے بے پردہ کر دیتا۔

"آپ کے اور میرے راستے ازلوں سے جدا ہیں خانزادی صاحبہ، یہ جو ہمارے درمیان روایتوں، اقدار اور حویلی کی زنجیر ہے، یہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتی۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ باخدا اپنے دل کو سنبھال لیں۔ میں یہاں اپنی بہن سے ملنے آیا تھا۔ آخری بار، اور یہ دیکھ کر دل کو اطمینان ہوا کہ وہ بہت خوش ہے۔ اب میں اپنے نئے سفر پر پرسکون ہو کر نکل سکتا ہوں۔ چلتا ہوں۔ خدائے پاماں۔"

ماتھے تک ہاتھ لے جا سلام کیا اور اندھیرے کا حصہ بن گیا۔

کشف سن سی رہ گئی تھی۔ بے دم ہوتی وہ گھٹنوں کے بل زمین پر آ گری۔

"آپ کے اور میرے راستے ازلوں سے جدا ہیں خانزادی صاحبہ، یہ جو ہمارے درمیان روایتوں، اقدار اور حویلی کی زنجیر ہے، یہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتی۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ باخدا اپنے دل کو سنبھال لیں۔"

اس کا دل مٹھی میں آ گیا۔ مرتضیٰ کی آواز کی بازگشت جاری تھی۔ وہ کہاں جا رہا تھا؟ وہ جتنا سوچ رہی تھی دل اتنا اداس ہو رہا تھا۔ گمان جب حقیقت بنتا ہے تو عذاب لگتا ہے۔ اسے بھی یونہی معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی آہستہ آہستہ اس کا دل چیر رہا ہے۔ رات کی سیاہی مزید بڑھ رہی تھی۔ کچی پگڈنڈی پر چلتے مرتضی کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

یوں محسوس ہو رہا تھا کہ مسافر دل کہیں چھوڑ آیا ہے۔اس کی پشت تکتے چیڑ کے درختوں کو محسوس ہوا کہ وہ آستین سے آنسو صاف کرتا گمنام راستوں کی جانب جا رہا ہے۔

کاش تیرے میرے راستے جدا ہوتے
میرے دل کو پھر اتنے گماں نہ ہوتے
تیرے ساتھ بیتے پل خواب ہوتے
آنکھ کھلتی تو وہ سب سراب ہوتے
کاش ہم نہ ہوتے، کاش وہ نہ ہوتے
اے کاش، پھر یہ کاش ہی نہ ہوتے
(از خود)

☆☆☆☆☆

سرمئی دھوپ کے سبب دھند کچھ حد تک کم محسوس ہو رہی تھی ورنہ سامنے سے آتا بندہ دیکھنا دشوار ہو جاتا تھا۔ایسے میں یونیورسٹی میں ایک بار پھر امتحانات کا موسم جاری تھا اور سٹوڈنٹس کے لیے امتحان جاڑے کی سردی میں آتش کا کام کر رہے تھے۔وہ امتحان سے فارغ ہو کر کیفے چلا آیا۔کیفے ٹیریا میں آج کچھ خاص رش نہ تھا۔اس نے چنے اور نان کا آرڈر دیا اور کھڑکی کے پاس لگے میز کرسی کی جانب چلا آیا۔اسے صائم کا انتظار تھا جو ہمیشہ اس کے بعد ہی امتحان گاہ سے نکلتا تھا۔آجکل وہ امتحانوں کے سبب ناشتہ یہیں آکر کرتے تھے۔وہ کرسی کھینچ کر بیٹھا اور بیگ میز پر رکھا۔زپ کھول کر وہ منہ تقریباً بیگ میں گھسائے بیٹھا تھا جب کسی نے سامنے والی کرسی کھسکائی۔ایک

دم ہی آس پاس زنانہ پرفیوم کی خشبو پھیل سی گئی۔جب وہ وجود بیٹھ گیا تو خوشبو مزید بڑھتی چلی گئی۔زعیم نے چونک کر سر اٹھایا۔نظر سیدھی بازو پر گئی۔سخت سردی میں بھی وہ بازو کی آستین چڑھائے بیٹھی تھی۔بازو دیکھ کر ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی اور نہیں تانیہ ہی ہے۔اس نے آہستہ سے نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔ہلکے میک اپ میں وہ جاذبِ نظر خوبصورت لڑکی آنکھوں میں امید لیے بیٹھی تھی۔زعیم کے دل کو کچوکا لگا۔کیوں اتنے عرصے سے وہ اسے اپنی امید پر بے حال کر رہا ہے۔وہ کیوں اسے جواب نہیں دے دیتا۔وہ اس کے احساس و جذبات کے ساتھ کیسے کھیل سکتا تھا۔

"تانیہ آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

اس نے لہجے کو بے حد سنجیدہ بنالیا تھا۔تانیہ نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔آنکھوں کی چمک مدھم پڑی۔

"کیا مجھے یہاں نہیں ہونا چاہیے؟"

اس کے لہجے میں اشتیاق تھا۔زعیم نے گہرا سانس بھرا۔

"میں نے کبھی آپکو یہاں ہونے کے لیے نہیں کہا تھا۔کبھی آپکو امید نہیں دلائی۔پھر آپ کا یہاں ہونا بنتا ہی نہیں ہے تانیہ۔"

وہ سنجیدہ لہجے میں ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر ادا کر رہا تھا اور تانیہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں نے کبھی آپ کے لیے کوئی خط نہیں لکھا تھا۔کسی نے مجھ سے بدلہ لینے کی خاطر یہ انتہائی قدم اٹھایا۔مجھے اس بات پر سخت ندامت ہے کہ آپ ایک کاغذ کے ٹکڑے کے سہارے پر اتنی دور آنکلی ہیں۔مجھے اس پر افسوس بھی رہے گا مگر میں آپکو یوں بے مول نہیں کر سکتا تھا۔آپ مجھ جیسے شخص کے قابل نہیں ہیں۔آپ کے جذبوں میں سچائی ہے مگر جو آپ کو مجھ سے ہے،اسے پیار نہیں کہا جا سکتا۔پیار جب آپ کو ہو جائے گا تو چیخ چیخ کر اپنی موجودگی کا اعلان کرے گا۔میں آپکی عزت کرتا ہوں اور اسی لیے آپ کو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ محبت کرنے والا انسان

ڈیزرو کرتی ہیں۔ لہٰذا خود کو مزید اذیت۔۔۔"رک کر اس کے بازو کی جانب اشارہ کیا تو اس نے بھی ڈبڈبائی نظروں سے اپنا بازو دیکھا۔ جابجا لگے نشان، اس کا آنسو بازو پر جا گرا۔ ابھرے زخموں سے بہتا وہ میز کی شفاف سطح پر جا گرا۔

"مزید اذیت مت دیں۔ آپ اپنے آپ پر ظلم کر کے نہ صرف خود کو اذیت دے رہی ہیں بلکہ رب کو بھی ناراض کر رہی ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ آرٹس ڈیپارٹمنٹ کا زین العابدین صحیح معنوں میں آپکی محبت میں گرفتار ہے۔ پروفیسرز اس بات کو لے کر سخت پریشان ہیں کہ وہ بس ایک ہی شخص کی تصویر بناتا رہتا ہے۔" تانیہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ آنکھوں میں الجھن تھی۔ زعیم نے گہرا سانس بھرا۔

"جانے تو جانے سارا باغ ہی جانے، نہ جانے تو گل ہی نہ جانے۔" وہ بڑبڑایا۔ پھر بیگ اٹھایا اور کرسی دھکیلتا اٹھا۔ تانیہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ مڑنے سے قبل وہ ایک پل کو رکا پھر ہلکی سی مسکراہٹ اس کی جانب اچھالی۔

"مجھے لگتا ہے کہ آپکو اس کے بے رنگ سکیچ میں اب رنگ بھر ہی دینا چاہیے۔" مبہم مسکراہٹ سے بولتا وہ کیفے سے باہر چل دیا۔ دل پر سے بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ تانیہ نے نظریں پھیر کر کھڑکی سے پار دیکھا۔ شیشے پر رات کے ٹھہرے شبنم کے قطرے اب تک موجود تھے۔ نظریں پھیر کر اس نے اپنے بازو کو دیکھا۔ انگلیوں کی پور سے زخموں کے ابھار محسوس کرتے اس نے یاسیت سے سر کرسی کی پشت سے لگا دیا۔ آج ساتھ چھوڑ جانے والا جاتے جاتے بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

کبوتر آج بہت چہک رہے تھے تبھی صبح، صبح اونچی فصیل سنبھال لی تھی۔ چہک چہک کر وہ صبح کا اعلان کر رہے تھے۔ اونچی حویلی پوری شان سے کھڑی تھی۔ کیاریوں کے پھول بھی جھوم رہے تھے اور ہوا کے ساتھ محوِ رقص تھے۔ ہوا کا گیت نرالا تھا اور دور دور تک سبزہ زار اب برف سے ڈھکا ہوا تھا۔ کہیں کہیں سے بمشکل گھاس نظر

آرہی تھی۔اندر کی طرف چلیں تو ماحول میں سخت تناؤ تھا۔آغا جان سمیت حویلی کے تمام لوگ لاؤنج میں بیٹھے تھے۔یہ مردان خانے کا لاؤنج تھا۔سب کی نظریں اوپر جاتی سیڑھیوں سے چپکی ہوئی تھیں۔ونی کو جہاں ٹھہرایا تھا وہ وہاں نہیں تھی،تو آخر وہ کہاں تھی؟بہرام نے اب کھلے عام بغاوت کر ڈالی تھی۔آغا جان خود پر بڑی مشکل سے جبر کیے بیٹھے تھے۔بی بی سرکار کی حالت بھی مختلف نہ تھی۔گھڑی کی ٹِک ٹِک شور مچاتی سب کو آنے والے وقت کے لیے تیار کر رہی تھی۔بالا آخر ٹھک کی آواز سے بہرام خان کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔کشف نے بے چینی سے بھاری پپوٹوں والی آنکھیں گھما کر دیکھنا چاہا۔قدموں کی چاپ سنائی دی اور چند لمحے بعد جب بہرام خان نے نیچے آتی سیڑھی پر قدم رکھا تو وہ واقعی تنہا نہیں تھا۔حویلی والوں کو سانپ سونگھ گیا۔بی بی سرکار کی دنیا گھوم گئی۔روبینہ کو بھی سانپ سونگھ گیا۔جب کہ بہرام بھرپور اعتماد سے ڈری بوکھلائی زینی کا ہاتھ تھامے نیچے اتر رہا تھا۔بی بی سرکار پہلی نظر میں اسے پہچان ہی نہ سکیں۔کلیوں والا سرخ پاؤں تک آتا فراک پہنے آج وہ ونی نہیں پہلے دن کی دلہن معلوم ہو رہی تھی۔پیروں کی پازیب بھی چھن چھن کر رہی تھی۔کھلے نم بالوں کی آبشار کمر پر تھی۔نکھرا گلاب چہرہ اور ہی داستان سنا رہا تھا۔بی بی سرکار سمیت سب کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔نیچے پہنچ کر بہرام نے اس کے ہاتھ پر گرفت مضبوط کر دی۔اس کے ٹھنڈے پڑتے ہاتھوں سے وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ خوف زدہ ہے۔

بہرام نے چہرہ موڑ کر اس کا گلاب چہرا دیکھا۔لونگ چمک رہا تھا مگر آنکھوں میں خوف کی رمق تھی۔بہرام نے مسکرا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔گویا اسے اپنے ہونے کا یقین دلایا پھر ہلکے سے مسکرایا اور اس کا ہاتھ دبا کر چھوڑا۔زینی نے گہرا سانس بھرا اور نظریں اٹھا کر سب کو دیکھا جو ہکا بکا رہ گئے تھے۔سب سے قبل آغا جان کو ہوش آیا۔

"یہ سب کیا ہے بہرام خان؟"

ان کی آواز غصے سے بھاری اور سانس پھول رہا تھا، زمان خان ایک جانب سکون سے بیٹھے تھے۔ وہ بس ایسے موقعوں پر تماشائی کا فرض ادا کرتے تھے۔ سلیمان خان بھی خاموش اور بے یقین تھے۔ صبور اور سبین خانم کے چہرے سے کسی بھی بات کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ کشف کے دل میں اطمینان اترا تھا۔

"کیا مطلب کیا ہے؟" اس نے نا سمجھی سے کندھے اچکائے۔

"تم جانتے ہو ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ لڑکی تمھارے ساتھ کیوں تھی؟"

آغا جان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ سب سے پہلے ان دونوں کو مار ڈالتے پھر خود کو۔

"میری بیوی ہے تو میرے ساتھ ہی رہے گی نا آغا جان، بہرام خان اتنا بے شرم نہیں ہے کہ اپنی بیوی کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرے۔"

اس کے لہجے میں چٹانوں سی سختی تھی۔ سب دم سادھے اسے دیکھ رہے تھے۔ آغا جان نے گہرا سانس بھرا پھر ایک نظر زینی کو دیکھا اور طنزیہ ہنسے۔

"جی بھر گیا ہے بہرام خاناں یا ابھی اور وقت چاہیے؟"

اتنی بے باک گفتگو سننے کی سکت عورتوں میں نہ تھی اسی لیے وہ وہیں سے مڑ گئیں جبکہ مارے غصے کے بہرام کا برا حال تھا۔ وہ کان کی لو تک سرخ پڑ گیا۔

"بس کریں آغا جان، خدا کا خوف کریں۔ میری بیوی کے لیے یا میرے لیے ایسے الفاظ بولنے کا حق آپ کو کسی نے نہیں دیا۔ اس لیے آئندہ بولنے سے پہلے سو بار سوچیے گا۔"

وہ بمشکل خود پر ضبط کیے ہوئے تھا۔ مڑ کر اس نے سر جھکائے کھڑی زینی کا ہاتھ تھاما ہی تھا کہ آغا جان اپنے حقے کی نال غصے سے زمیں پر پٹخ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"مت بھولو کہ یہ محض ونی ہے۔اس کے بھائی نے ہمارے پوتے، ہماری جان کے ٹکڑے کو ہم سے چھین لیا تھا۔ جاؤ عیش کر لو اور دل بھر جائے تو چھوڑ دینا پر شادی تمھاری کشف سے ہی ہو گی۔"

بہرام کے قدم زنجیر ہوئے اگلے ہی پل وہ آنکھوں میں چنگاریاں لیے مڑا۔

"بس! ایک لفظ مزید نہیں سنوں گا میں۔اس کے بھائی نے مارا ہے۔اس نے نہیں اور ایک بات میں واضع کر دوں، جرگے بلا کر ناحق کسی کی زندگی برباد کرنے کا حق نہیں ہے آپ سب کو۔انسان ہیں، انسان رہیں، خدا بننے کی کوشش نہ کریں۔"

وہ کہہ کر مڑا اور زینی کا ہاتھ تھام کر باہر کی جانب بڑھا، زینی نے بھی ساتھ ہی قدم اٹھائے اور فخر سے اسے دیکھا۔وہ پل بھر کو رکا اور رخ موڑ کر آغا جان کو دیکھا جو تنفر سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"قتل اس کے بھائی نے بھی نہیں کیا۔" اس کی بات پر سب سن رہ گئے اور خود زینش بھی۔تو کیا وہ جانتا تھا کہ قتل زینی نے کیا تھا۔زینی اب بے دم سی ہوئی اس کے قدموں سے قدم ملاتی جا رہی تھی۔دروازے کے پاس پہنچ کر انھیں رکنا پڑا کیوں کہ سامنے ہی صبور خانم ہاتھ میں چادر پکڑے کھڑی تھیں۔

"حویلی کی عورتیں بے نقاب کہیں نہیں جاتیں، خاناں۔"

ساتھ ہی چادر اس کی طرف بڑھا کر خاموشی سے واپس اندر چلی گئیں۔بہرام نے چادر کھول کر زینی کے گرد لپیٹ دی۔زینی نے خود کو بے انتہا محفوظ پایا۔اتنا وہ جانتی تھی کہ وہ باہر جا رہے ہیں، مگر کہاں؟ یہ وہ نہیں جانتی تھی۔وہ خوفزدہ تھی کہ بہرام اس کا راز پا چکا ہے۔بہرام نے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا تو وہ ممنون آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی، کہاں رہی تھی اسے ان لاڈ نخروں کی عادت مگر اب بالا آخر صبر کا پھل مل گیا تھا۔وہ انجام کی پرواہ کیے بغیر جینا چاہتی تھی۔وہ اب کل کی پروا کے بغیر آج کو جینا چاہتی تھی۔کھڑکی سے جھانکتی کشف نے خاموشی سے پردے واپس گرا دیا۔اندر کہیں بہت اطمینان اترا تھا۔

☆☆☆☆☆

وہ خاموش کھڑی تھی۔ کسی بھی پل بے دم ہو کر گرنے کو تیار، اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بہرام اسے یہاں لائے گا۔ اتنے ماہ بعد وہ پھر اس دہلیز کے سامنے کھڑی تھی جہاں سے وہ ونی بن کر نکلی تھی۔ یہ گلیاں، محلہ سب اس کے لیے جیسے اجنبی ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ لوگوں کی چہ مگوئیاں جاری و ساری تھیں۔ کوئی کہہ رہا تھا یہ کیا ہے؟ کوئی گونگا ہو گیا تھا۔ لوگوں کو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا؟ ونی ہوئی لڑکی ایسے کیسے سج دھج کر کیسے کھڑی تھی۔ یہ تو گاؤں کی تاریخ میں پہلی بار ہو رہا تھا۔ بہرام کی معیشت میں وہ لکڑی کے دروازے کے پاس پہنچی مگر دستک دینے کو ہاتھ ہی نہ اٹھ پا رہے تھے۔ وہ منجمد ہو گئی تھی۔ اس دروازے کو کھول کر اس نے اس روز مصیبت کو دعوت دی تھی، ادھر سے ہی وہ ابا اور حویلی کے ملازموں کے ساتھ جرگے گئی تھی۔

بہرام اس کی حالت کو سمجھ سکتا تھا تبھی بغیر کچھ بولے آگے بڑھ کر اس نے دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ چند پل بعد ٹھک کی آواز سے دروازہ کھلا، سامنے گل شیر کھڑے تھے۔ ان کی پہلی نظر بہرام پر گئی جو سنجیدہ چہرے سمیت ان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ انھوں نے جھٹ سے گردن گھما کر ساتھ کھڑے نسوانی وجود کو دیکھا۔ دل تڑپ اٹھا۔ یہ تو ان کی رانی تھی وہ نقاب میں بھی پہچان گئے تھے۔ اگلے ہی پل زینی تڑپ کر ان کے گلے آ لگی۔ دونوں باپ بیٹی زار و قطار رہ رہے تھے۔ بہرام بھی چوکھٹ عبور کر کے اندر آ گیا۔ اب نظریں گھمائے وہ اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ سامان باندھا پڑا تھا اس کا مطلب وہ کہیں جانے والے تھے۔

"ابا کون ہے؟" یہ مرتضی کی آواز تھی۔ وہ جونہی سامنے آیا کنگ رہ گیا۔ بہرام نے ہلکی سی مسکراہٹ کا تبادلہ کیا۔ مرتضی نے بے یقینی سے بہرام کو اور اس کے بعد زینی کو دیکھا اور تیزی سے ان کی جانب لپکا۔

"لالہ" زینی خوب رونے کے بعد اب مرتضی کی جانب مڑی۔ اٹاری سے رومانہ اور قمر بھی نکل آئے۔ قمر کا چہرہ پیلا پڑ رہا تھا۔ رومانہ زینی کی جانب مڑتیں پل بھر کو بیٹے کا خیال کر کے رکیں، پھر مڑ کر اس کا بازو پکڑ کر ہلکا سا دبایا۔

"زینی اکیلی نہیں ہے پتر، اس کا شوہر بھی ساتھ ہے۔"

گویا یہ جتانا بہت ضروری تھا، وہ بیٹے کے دل سے امید کا آخری دیا بھی بجھانا چاہتی تھیں۔ پھر وہ بھی انہی کی جانب بڑھ گئیں۔ قمر نے دھندلائی نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا۔ زینی اکیلی نہیں تھی اس کا شوہر اس کے ساتھ تھا۔

☆☆☆☆☆

چمکتی دوپہر باسی ہو گئی تھی۔ برگد تلے آج میلا لگا ہوا تھا۔ گاؤں کی عورتیں اسے دیکھنے یوں آ رہی تھیں گویا وہ میوزیم میں پڑا کوئی قدیم شو پیس ہو۔ عورتوں کا تعجب تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ قمر اسے سلام کہہ کر خاموشی سے اندر چلا گیا تھا، اس کی چمکتی آنکھوں نے جواب دے دیا تھا اب قمر کے پاس کوئی جواز بچا ہی نہ تھا۔ سمی جب سے آئی تھی زینی کے ساتھ ساتھ تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اب دوبارہ کبھی وہ اس سے مل پائے گی۔ مگر یہ تو جیسے معجزہ تھا۔ انھوں نے اس قلیل وقت میں ڈھیروں باتیں کر ڈالی تھیں۔

دو گھنٹہ قبل ہی بہرام مرتضی کو ساتھ لیے باہر گیا تھا۔ بقول اس کے اسے مرتضی سے ضروری بات کرنا تھی۔ گل شیر تو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک بجھا رہے تھے۔ قسمت نے ان پر بڑا کرم کیا تھا۔ مرتضی کی زبانی اس کی خیریت جان کر اتنی تسلی نہیں ہوئی تھی جتنی اب ہو گئی تھی اور زینی اتنی اچھی بیٹی تھی کہ مجال جو خود پر ہوئے ظلم کا رتی برابر ذکر کیا ہو، وہ سب کو اپنے رویئے سے مطمئن کر رہی تھی۔ اب جب غم کے بادل چھٹ رہے تھے تو کیوں وہ اس کہانی کو پھر دوہرا کر سب کے ساتھ ساتھ خود کو بھی تکلیف دیتی۔

☆☆☆☆☆

وہ ڈھلوان دار سطح پر بیٹھے تھے جو قریب بہتی جھیل سے نسبتاً اونچائی پر تھی۔ بہرام کے ہاتھ میں چند پتھر تھے جنھے وہ تاک تاک کر جھیل میں پھینک رہا تھا۔ وہ پتھر پہلے جھیل کی سطح پر بلبلے بناتا پھر دائرے اور پھر ڈوب جاتا۔

مرتضی بھی اس کے ساتھ بیٹھا یہی تماشا دیکھ رہا تھا۔ پھر بالآخر تہمید باندھنے کو بہرام نے گلا کھنکھارا۔ مرتضی چونکا۔

"سفیر کی موت سے تمھیں کیا ملنا تھا؟"

اس کا سوال غیر متوقع تھا۔ مرتضی نے گہرا سانس خارج کیا۔ پھر نظریں جھیل کے بہتے پانی پر جما دیں۔

"بتایا تو ہے، ان سے جھگڑا ہوا تھا، وہ بدتمیزی سے پیش آتے تھے بس اس لیے غصے پر قابو نہیں رہا۔"

وہ سکون سے بولا تو رخ موڑ کر چند لمحے وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں سپاٹ تھیں۔ مرتضی نظریں چرا گیا۔

"زینش کو بچا رہے ہو؟" اس کی بات پر مرتضی سن رہ گیا، پتلیاں ہلنے سے انکاری ہو گئیں اور زبان تالو سے چپک گئی۔

"نن۔۔۔ نہیں تو۔" لحظہ بھر کو اس کے لہجے میں لغزش آئی پر وہ قابو پا گیا۔ بہرام نے نفی میں سر ہلایا۔

"سفیر کی گندی نظر تھی نا اس پر" وہ وثوق سے بولا۔ اس کے لہجہ میں یقین تھا۔ چاہ کر بھی مرتضی اسے جھٹلا نہیں سکا۔

"جانتے ہو جہاں میں نوکری کرتا ہوں میں ہمیشہ چاہتا تھا وہاں کوئی نہ جانتا ہو کہ میں سرداروں کا بیٹا ہوں، مگر ایسا بھلا کیسے ہو سکتا تھا ہم اپنا بیک گراونڈ نہیں چھپا سکتے تھے۔ یہ بات میرے لیے اعزاز نہیں تھی، نہ ہو سکتی ہے جانتے ہو کیوں؟ کیوں کہ لوگ کہتے ہیں: یہ سرداروں کا لڑکا ہے اسے تو نوکری ملنا ہی تھی، اس نے کون سا محنت کی ہے۔ میرے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی اور رہے گی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا لوگ میرے ذریعہ معاش کا مذاق اڑا رہے ہیں، اسے حرام کہہ رہے ہیں۔ اس لیے میں نے جب بھی حاصل کیا، جو بھی حاصل کیا، بس اپنی محنت کے بل پر کیا۔ اس واقعے سے تین ہفتہ قبل مجھے جو کیس سونپا گیا اس کی کڑی سوات سے آمل رہی تھی۔ اس بات نے مجھے

تعجب میں ڈال دیا تھا۔ جو کیس میں حل کر رہا تھا وہ سمگلنگ اور تسکری کا تھا، اس کا یہی نتیجہ نکل رہا تھا کہ کوئی ہے جو سوات سے بھی اس سمگلنگ میں مدد دے رہا تھا۔ سمگلنگ کے لیے جاتے ٹرک اکثر غلط نمبر پلیٹ کے ہوتے تھے اس لیے کوئی انھیں پہچان نہیں سکتا تھا مگر جب سوات کے روٹ سے وہ نکلتے تھے تو کوئی تھا جو باحفاظت انھیں وہاں سے نکالتا تھا۔ میرا کیس پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا۔ جب ہم نے ایک ٹرک حراست میں لیا تھا تب تفتیش کے ذریعے میں بخش تک پہنچا۔"

مرتضی دم سادھے اسے سن رہا تھا۔ جبکہ وہ پرسکون سا بولتا جا رہا تھا۔

"بخش جیسا عام ملازم یہ کام اکیلے کر ہی نہیں سکتا تھا، لاجک کی بات ہے۔ اس کا ساتھ کوئی دے رہا تھا اور جب مجھے اس بات کا علم ہوا کہ وہ کوئی اور میرا بھائی ہے،" رک کر اس نے اذیت سے آنکھیں موندھ لیں۔ مرتضی جانتا تھا وہ تکلیف میں ہے۔ کچھ حد تک یہ تمام بات وہ خود بھی جانتا تھا۔

"وہ میرا بھائی تھا تو میرے سر پر آسماں رہا نہ پاؤں تلے زمیں، بے بسی کسے کہتے ہیں اس بات کا مجھے اچھے سے اندازہ ہو گیا تھا۔ میں نے وہاں ایک مخبر تعینات کر دیا اور جو خبریں وہ دیتا تھا انھیں سن کر میرے اوسان جاتے رہتے تھے۔ اس کے قتل کے روز مجھے مخبر نے اطلاع دی کہ آج وہ کوئی لڑکی اٹھوانے لگا ہے۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں ایک اور لڑکی تسکری کا حصہ نہ بن جائے۔ میں اسی روز سوات پہنچا تھا۔ مخبر کی خبر کس حد تک سچی تھی مجھے اس کا علم نہیں تھا مگر بخش کو حویلی دیکھ کر میں حیران ہوا۔ اگر انھیں لڑکی اغوا کرنی تھی تو وہ وہاں کیا کر رہا تھا؟ اس بات نے مجھے تعجب میں ڈالا مگر اس نے کہا سفیر سب کے ساتھ شادی پر گیا ہے، میں یہ جان کر پرسکون ہوا، شاید انھوں نے اپنے ارادے کو مؤخر کر دیا تھا۔ پھر۔۔۔"

وہ رکا اور اب اس کی آنکھ شدتِ ضبط سے سرخ ہو رہی تھیں، جو بھی تھا، جیسے بھی تھا وہ شخص اس کا بھائی تھا، اس میں لاکھ بری عادات تھیں مگر اسی کے ساتھ اس میں کئی اچھی عادات بھی تھیں۔

"وہ جب لاش کی صورت لوٹا تو میرا دل چھلنی ہو گیا۔ وہ لہولہان تھا۔ اس وقت مجھے تم پر شدید غصہ تھا، میرا دل کر رہا تھا تم سامنے ہوتے تو قصاص ادا کر لیتا، پھر میرے حواس بحال ہوتے گئے اور میں نے جیسے جیسے سوچنا شروع کیا میں الجھتا گیا۔ بخش کا جھوٹ، اسی کا لاش کو لانا، یہ سب ایسی باتیں تھیں جو مسئلے کو پیچیدہ کر رہی تھیں۔ میں نے جائے وقوع کا بھی جائزہ لیا مگر وہاں جیسے ہر شے کا صفایا کر دیا گیا تھا۔ پھر زینش سے میرا نکاح ہوا اور حالات الجھتے گئے۔ مجھے اسی کیس کے لیے لوٹنا پڑا۔ چاہ کر بھی میں سفیر کے قتل کے معاملے کو اس کیس کے ساتھ ملا نہ پایا۔ چند روز قبل تمھاری کی بات میرے ذہن سے گزری۔ تم نے کہا تھا کہ تم نے محض ایک ہی وار کیا تھا۔"

مرتضی نے حیرانگی کی حالت میں سر ہلایا۔ اس بات کا کیا مقصد تھا؟ بہرام نے گہرا سانس بھرا۔

"مطلب زینش نے ایک ہی وار کیا تھا۔ سامنے کی طرف سے، مگر غسل کے وقت جب اس کے سر پر میں نے پٹی باندھی تو اس کے سر پر اس وقت دو زخم تھے، ایک سامنے کی جانب، جو کہ زینی نے دیا تھا، وہ اتنا گہرا نہیں تھا مگر پیچھے کی جانب کے زخم کی نوعیت مختلف تھی۔ وہ زخم حد سے زیادہ گہرا تھا۔ نیچے گر کر آنے والے زخم کی حالت اور ہوتی ہے پر کسی کے دیئے زخم کی حالت اور ہوتی ہے۔ مجھے اس وقت وہ تمھارا دیا زخم لگا تھا مگر وہ تمھارا یا زینی کا دیا زخم نہیں تھا وہ کسی اور کا دیا زخم تھا۔"

اس نے اب کی بار ایک بڑا سا پتھر اٹھایا اور تاک کر نشانہ باندھا۔ مرتضی کی حالت یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ سن بیٹھا تھا۔

"کس کا؟"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"سفیر کے مرنے سے اور تم پر الزام آنے سے اگر کسی کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچ سکتا تھا تو وہ بخش تھا۔ ڈیرے کا انتظام اس کے ہاتھوں میں تو آنا تھا ہی، تم سے بھی اس کی جان چھوٹ جانا تھی، ڈرگز کی سمگلنگ اور تسکری کا بھی

سوات میں ایک وہی کرتا دھرتا رہ جاتا تھا، سارا منافع اور فائدہ اسے ہی ملنا تھا۔ چونکہ یہ میرے کیس سے جڑا ہوا ہے تو کسی بھی وقت پولیس ڈیرے پر پہنچتی ہی ہو گی۔"

اب کی بار وہ سکون سے کہتا اپنی جگہ سے اٹھا اور کپڑے جھاڑنے لگا۔ مرتضی بھی لڑکھڑاتے ہوئے اٹھا، اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ یہ سب کیا تھا؟ بہرام اتنے عرصے سے اس کیس پر ہی کام کر رہا تھا۔ وہ سب جانتا تھا، تو کیا وہ زینی کو لے کر واقعی سنجیدہ تھا یا نہیں؟ ایسے کئی سوال اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ بہرام اب خاموش کھڑا اس کے تاثرات جانچ رہا تھا۔

"ثبوتوں کے بغیر؟"

اس نے ابرو اچکائی۔ بہرام نے نفی میں سر ہلایا۔

"چھاپے کے دوران پولیس کو وہاں سے منشیات مل جائیں گی پھر ایک بار وہ سلاخوں کے پیچھے چلا گیا تو باقی کا کام میں سنبھال لوں گا۔ تفتیش سخت ہوتی ہے، وہ سب اگل دے گا۔"

وہ ہاتھ جھاڑتا گاڑی کی جانب بڑھا تو مرتضی بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔

"زینی کو واقعی اپنی بیوی مانتے ہیں آپ؟ سب جان کر بھی؟" اس نے ذہن میں کب سے چلتا سوال پوچھ ہی لیا۔

"ہاں بالکل! اس کی جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی اپنے دفاع کے لیے یہی کرتی۔ مجھے خوشی ہے کہ اسے اپنا دفاع کرنا آتا ہے۔"

اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے رسان سے جواب دیا۔ مرتضی نے دل ہی دل میں رب کا ڈھیروں شکر ادا کیا اب اس کی ہر پریشانی ختم ہو چکی تھی۔ دل میں بس ایک پھانس تھا اور وہ شاید تا عمر رہنا تھا۔ وہ سوچوں میں مگن تھا جب گاڑی گھر کے سامنے رکی۔ وہ سر کے اشارے سے سلام کرتا گاڑی سے اتر گیا۔ بہرام اسے بتا چکا تھا کہ وہ

یہاں سے سیدھا ڈیرے جائے گا اور جیسے ہی مسئلہ حل ہو گا وہ زینی کو لے جائے گا۔ مرتضی دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ بہرام کی آواز سنائی دی۔

"میں ہر بات جانتا ہوں اس بات سے زینی کو بے خبر رکھنا، وہ دل کو لگا لے گی یہ بات اور میں اپنی وجہ سے اسے شرمندہ نہیں دیکھنا چاہتا۔" بات کے اختتام پر اس نے گاڑی کا شیشہ چڑھایا، زن سے گاڑی دھواں چھوڑتی وہاں سے جا چکی تھی۔ مرتضی سے تیزی سے اندر بڑھا، اسے اب کی پریشانی رفع کرنی تھی، اسے سب کو بتانا تھا کہ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہاں وہ آج بھی زینی کے کیے وار کا الزام اپنے سر لینا چاہتا تھا۔

☆☆☆☆☆

ڈیرے پر جیسے قیامت آ چکی تھی۔ جب پولیس کے چھاپے کی اطلاع ملی تو اسی وقت سلیمان خان، زمان خان اور آغا جان وہاں پہنچ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں بہرام بھی وہاں پہنچ گیا۔ سلیمان خان لپک کر اس تک آئے۔

"بہرام روکو انہیں۔ یہ سرچ وارنٹ اور اریسٹ وارنٹ ساتھ لائے ہیں۔ یہ بخش کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ ڈرگز کی بات کر رہے ہیں۔" بہرام نے نظریں ہٹا کر کچھ فاصلے پر ہتھکڑیوں میں کھڑے بخش کو دیکھا پھر بے رخی سے چہرہ سامنے کر لیا۔

"پولیس کو اپنا کام کرنے دیں سر۔"

وہ اس وقت ان کا بیٹا نہیں وطن کا سپاہی بن چکا تھا۔ اپنے کندھوں پر دھرے سلیمان خان کے ہاتھ ہٹا کر وہ اندر کی جانب بڑھ گیا۔ سلیمان خان سمیت، آغا جان اور زمان خان بھی ہکا بکا رہ گئے۔ ڈیرے کے پچھلی جانب بیسمنٹ بنایا گیا تھا۔ طویل جدوجہد کے بعد پولیس اس تک پہنچ چکی تھی۔ وہاں سے نکلنے والے ڈرگز سمیت اسلحے نے بھی سب کو چونکا کر رکھ دیا تھا۔ خون اور رسیاں اس بات کی گواہ تھیں کہ وہاں تشدد بھی کیا جاتا تھا۔ زمان خان، آغا جان اور سلیمان خان کو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ بخش کا مارے غصے کے برا حال تھا۔

"کس نے مخبری کی ہے؟ بتاؤ مجھے؟ میں اس کی جان لے لوں گا۔"

بخش خود کو چھڑوانے کی کوشش کرتا بے حال ہو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ سب تہس نہس کر کے رکھ دے۔ وہ بپھرا ہوا جانور لگ رہا تھا۔ بہرام اس کی کمزوری بھانپ گیا تھا، ایسے مجرم جوش میں اعتراف کر لیتے تھے۔

"یہ سب کیا ہے بہرام؟"

آغا جان بے دم نظر آ رہے تھے۔ عزت ملیامیٹ ہو رہی تھی، یہ کیا تھا؟ ان کے ڈیرے میں یہ سلسلہ کب سے جاری تھا؟ اتنا ڈرگ کب آیا۔

"اسی نے سفیر کا قتل کیا تھا۔ ایسا ہی ہے نا بخش؟"

اس نے چڑاتے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ بخش نے ایک بار پھر خود کو چھڑوانا چاہا۔

"ہاں مارا تھا اسے، مرتضی کے جانے کے بعد وہ اس چھوکری کے پیچھے جانے والا تھا جو تمھیں ونی ہو کر ملی ہے، وہ زندہ سلامت تھا اپنے ہاتھوں سے مارا تھا میں نے اسے،۔۔۔ اور تمھیں بھی مار دوں گا۔"

وہ عزت کے تمام پردے چاک کیے دیدہ دلیری سے بولا۔ بہرام کے اشارے پر دو مزید پولیس والوں نے اسے پکڑا۔ آغا جان کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ سلیمان خان کی حالت بھی مختلف نہیں تھی۔

☆☆☆☆☆

قتل کی شام

اس نے رشیدے کو حویلی اطلاع دینے بھیجا، پھر تیزی سے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیلی۔

"اچھا ہوا اپنی آئی پر مر گئے سرکار، ورنہ ایک دن تو ویسے بھی مرنا ہی تھا۔ مرتضی نے میرا کام آسان کر دیا۔" اس نے قہقہہ لگایا مگر جس لمحے سفیر نیم ہوش میں آ کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا بخش کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

"تیری خباثت۔۔۔کا علاج میں بعد میں کرتا ہوں پہلے یہ بتا وہ ذلیل عورت کہاں ہے؟"

وہ بمشکل بولتا بستر کا سہارا لیے اٹھا۔ سر پکڑے وہ گرتے پڑتے دروازے تک پہنچا۔ بخش کی نظر بستر پر پڑے ٹوٹے گلدان کے ٹکڑے پر گئی، اس کے حواس کام کرنا چھوڑ گئے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر تیزی سے وہ ٹکڑا اٹھایا اور تقریباً دوڑ کر سفیر تک پہنچا۔ اس سے پہلے وہ ہینڈل پر ہاتھ رکھتا اور اس پر خون کا نشان لگ جاتا بخش نے پوری قوت سے وہ ٹکڑا اس کے سر پر دے مارا۔ اب کی بار چوٹ دماغ کے اندر لگی تھی ایک لمحے میں ہی اس کا پورا جسم ناکارہ ہوتا گیا۔ اسے بخش کا چہرہ نوچ لینے کا بھی وقت نہ ملا۔ جب تک لوگ وہاں سے لاش لے جانے آئے، سفیر خان واقعی مارا جا چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

"لے جائیں اسے انسپیکٹر" اس نے سر ہلایا۔ وہ اس شخص کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا اسے خدشہ تھا کہ وہ اس کی جان نہ لے لے۔

"ہمت ہے تو ہاتھ کھول، مرد بن" بخش جان بوجھ کر اسے للکار رہا تھا۔ بہرام نے سر جھٹک کر گویا ناک سے مکھی اڑائی، پھر چہرا موڑ کر اپنے پیچھے کھڑے زمان خان کو دیکھا۔ بخش کو تھام کر کھڑے پولیس آفسر سے ہلکی سی چوک ہوئی تو فوراً سے ہاتھ ڈال کر اس نے پولیس والے کی بندوق نکال لی۔ پہلی گولی اس پولیس والے کی ٹانگ میں دے ماری۔ بہرام تیزی سے آگے بڑھا تاکہ اس کے ہاتھ سے بندوق چھین سکے۔ پولیس والے بھی اسی وقت اس تک پہنچے مگر اس سے قبل ہی وہ فائر کھول چکا تھا۔ بندوق ناک کی سیدھ میں نکلی تھی، بہرام فوراً زمین پر بیٹھ گیا مگر پھر بھی کوئی دھاڑ سے زمین پر گرا تھا۔ اسی کے ساتھ آغا جان اور سلیمان خان کی چیخ و پکار سنائی دی۔ بہرام فوراً سے ہوش میں آیا۔ بخش کو دوبارہ سے قابو کر لیا گیا تھا اور اب کی بار اس کے سر پر ہوسٹلر مار کر اسے بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ بہرام تیزی سے مڑا اور زمین پر بے دم پڑے زمان خان کی جانب چلا آیا جن کے سینے سے خون ابل ابل کر

نکل رہا تھا اور چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ آغا جان تو ہمت کھو گئے تھے۔ باپ سے پہلے بیٹے کی موت ہو جائے تو باپ ویسے ہی مر جاتے ہیں۔ انھیں بھی مکمل طور پر سلیمان خان سنبھالے ہوئے تھے۔ بہرام نے فوراً سے ان کی نبض ٹٹولنا چاہی، جو کہیں نہ تھی۔ وہ بے دم ہو کر وہیں بیٹھ گیا۔

☆☆☆☆☆

کھلی کھڑکی سے اندر جھانکا تو ہوا کو معلوم ہوا کہ کوئی نسوانی وجود کرسی پر بیٹھا ہے۔ بھورے بالوں کی آبشار کھول رکھی ہے، جو ہر جانب سے اسی کے دوش پر لہراتے اسے چھیڑ رہے تھے مگر وہ مگن سی لکھنے میں مصروف تھی۔

"اگلی شام میرے گھر والے شہر جا چکے تھے، زمان خان قبر میں اور بخش جیل میں۔ میں حویلی کی بہو بن کر وہاں لوٹی تھی اور پہلی بس سے زعیم اور صائم سوات۔ بخش پر کیس کا آغاز ہو چکا تھا، برائی کا انجام برا ہی تھا اور جیسے کہانیوں میں دکھاتے ہیں، برے لوگ ہر صورت اپنے انجام کو پہنچ جاتے ہیں۔ ویسے ہی بخش کا انجام بھی ہو چکا تھا۔ زمان خان نے بھی اپنی عمر گزار لی تھی اور اب وہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گئے تھے۔ آغا جان کی اکڑ نکل گئی تھی، پے در پے واروں نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی اور وقت نے ان کے کس بل نکال دیئے تھے۔ میں چند روز وہاں حویلی رہی۔ سب کا میرے ساتھ رویہ بہترین ہو گیا تھا۔ میری امی نے سکھایا تھا کہ کوئی آپ پر جتنا ہی ظلم کیوں نہ کر لے، ایک وقت آتا ہے وہ پچھتاتا ضرور ہے پھر آپ سے معافی مانگے تو آپ پر لازم ہے اسے معاف کر دیں، کیوں کہ معاف کرنا رب کی رضا حاصل کرنے کا بہترین طریقہ ہے، اور میں نے بدلہ لینے اور معاف کر دینے میں سے معاف کر دینے کو ترجیح دی۔

میں بہرام کے ساتھ اسلام آباد آ گئی ہوں۔ ہمارا گھر چھوٹا پر بہت خوبصورت ہے۔ بہرام کہتے ہیں کہ ہم اپنی محبت سے اس گھر کا کونا کونا سجا دیں گے۔ یہ پیار شادی سے پہلے ہوا یا بعد میں، یہ کہنا میرے لیے بھی مشکل ہے اور بہرام کے لیے بھی۔ سوات کا کچھ اور یاد آئے یا نہ آئے، کبوتر بہت یاد آئیں گے۔"

اس نے قلم بند کیا اور ڈائری کے صفحے کو نظر بھر کر دیکھا۔ زندگی اب ایک ڈگر پر چل نکلنے والی تھی۔ محبت اس راہ میں پلکیں بچھائے بیٹھی تھی۔ آزمائشوں سے نکل کر وہ کندن بنے تھے اور اب افق کے ستاروں کی طرح چمکنے والے تھے۔ کالی ڈائری خاموش پڑی خود میں

بہت بھید چھپائے ہوئے تھی۔

☆☆☆☆☆

چار سال بعد

وکلاء کے دفاتر میں روز کی وہی عام چہل پہل تھی۔ راہدری میں کونے تک دونوں جانب دفاتر تھے۔ وہ راہدری میں چلتی جا رہی تھی۔ شال اپنے ارد گرد لپیٹے اس کی چال بہت خوبصورت تھی، نقاب سے جھانکتی نیلی آنکھیں بہت خوبصورت معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ جہاں جہاں سے گزر رہی تھی لوگ خود اس کے لیے راستہ بناتے جا رہے تھے۔ بلا آخر وہ کونے میں دائیں ہاتھ بنے دفتر کے سامنے آ رکی۔ دفتر کے باہر پلیٹ نصب تھی جس پر واضع لکھا ہوا تھا۔

"بیرسٹر مرتضی خان"

اس نے گہرا سانس خارج کیا، نیوز میں آئے روز تو دیکھ لیتی تھی پر اب روبرو چار سال بعد دیکھنے والی تھی۔ اس نے دھڑک کر بے حال ہوتے دل کو سنبھالا اور دروازہ بجایا۔ چند لمحے بعد اس کی گھمبیر آواز سنائی دی۔ اس نے دل پر بے ساختہ ہاتھ رکھ لیا، جی چاہا یہیں سے پلٹ جائے مگر دل نے روک ہی لیا۔ مجبوراً دروازہ دھکیل کر وہ اندر چلی آئی۔ مرتضی کے کلون کی خوشبو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ہمت کر کے قدم بڑھائے اور عین اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ چند پل نظریں جھکائے رہی پھر ایک دم ہی اس کی جانب دیکھا، مرتضی کے ہاتھ میں تھاما قلم نیچے جا گرا۔ پنکھے کے چلنے کی آواز کے ساتھ ہی ساتھ گھڑی کی دبی ٹک ٹک بھی سنائی دے رہی تھی۔

مرتضی خان کی بے یقین نظریں اس کے چہرے کے طواف میں مگن تھیں۔ چار سال میں ایسا کون سا لمحہ تھا جب

دل اس کے لیے ضدی بچہ نہ بنا ہو۔ ہر سانس نے اسے یاد کیا تھا، ہر دعا میں دل نے اس کی خیریت طلب کی تھی اور اب وہ سامنے تھی تو مرتضی کو سمجھ ہی نہ آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ یہ کہے کہ "اب کہیں مت جایئے گا" یا یہ کہے "چار سال کیسے گزرے"

"بہت مشکل سے گزرے یہ چار سال"

وہ نقاب اتارتے بڑبڑائی۔ اس نے مرتضی کے دل کا سوال بھانپا تھا یا اپنے دل کا حال سنایا تھا یہ کہنا بہت مشکل تھا۔ یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ راستے کھو گئے، درحقیقت راستے کہیں نہیں کھوتے، یہ انسان ہوتا ہے جو بھٹک جاتا ہے۔ راستے تو ہمیشہ سے وہیں ہوتے ہیں۔ اپنے کھوئے راہی کے انتظار میں پلکیں بچھائے۔ اس کے لوٹ آنے کی امید لیے۔

"خانزادی"

اس نے بولنا چاہا جب وہ اسے درمیان میں ٹوک گئی۔

"ہم زمانے، وقت اور اقدار و روایات کی زنجیر توڑ آئے ہیں۔۔۔ آپ کی خاطر اور اپنے دل کی خاطر"

آخری الفاظ وہ ہولے سے بڑبڑائی۔ مرتضی نے بے یقینی سے اسے دیکھا، سب کچھ جیسے اس پل میں، یہیں کہیں رک گیا تھا۔

"ایسے مت دیکھیں، ہم سب کی اجازت سے یہاں آئے ہیں، پچھلے دو برس سے یہیں ہیں۔ اپنے والدین کے گھر، زمان بابا کے بعد وہاں رکنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا، یا شاید آپ کے بعد"

اس نے بات کے آخر میں چہرا جھکا لیا۔ وہ بے چینی سے ہاتھ باہم رگڑ رہی تھی۔

"کیا کیا ان دو برس میں؟"

اس نے حیرانی سے پوچھا، کشف نے چہرا اٹھا کر براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"دنیا دیکھی، حویلی کی فصیلوں میں قید رہ کر ہم اڑان نہیں بھر سکتے تھے، اسی لیے یہاں آ گئے، سوات جاتے ہیں کبھی کبھی، مگر وہ ہمارا گھر نہیں ہے۔ یہاں آیا جی کے ساتھ اپنے گھر میں رہ رہے ہیں۔"

وہ مدھم لہجے میں بول رہی تھی۔

"کہیں کبھی زندگی کے اس سفر میں آپکو پچھتاوا ہوا ایک ناجائز شخص سے شادی کرنے پر تو۔۔۔"

کشف نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ جیسے مرتضی کے ٹوٹنے پر اسے بھی تکلیف ہوئی تھی۔

"ہم جس کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہیں، وہ صبا مرحومہ جیسی باہمت عورت کے بیٹے ہیں، گل شیر مرحوم جیسے عظیم آدمی کے بیٹے ہیں۔ زینی کے لالہ اور کشف کی محبت ہیں۔"

اس نے خوبصورت طریقے سے اس کے بھرم کا پردہ قائم رکھا۔ مرتضی کو یوں لگا کہ اسے سارے جہاں کی خوشیاں مل گئی ہوں۔ باہر درخت پر ایک اور پھول کھل اٹھا۔ بہار کی آمد آمد تھی۔

☆☆☆☆☆

پورے کمرے کا تھیم گلابی تھا اور شہزادیوں والے بے بی کاٹ میں کوئی شہزادی ہی سو رہی تھی۔ اس نے چہرے پر آنے والی لٹ کو پیچھے دھکیلا اور مڑ کر بے بی کاٹ کو دیکھ کر مسکرائی۔

"آج فروا نے مجھے بہت تنگ کیا مگر اتنی چالاک ہے کہ باپ کے پاس جاتے ہی خاموش ہو جاتی ہے۔ اس بار ہم تین دن سوات ٹھہرے، صفا اور مروا دلہن بن کر بہت حسین لگ رہی تھیں۔ چند دنوں میں، میں پھوپھو بن جاؤں گی۔ میں بہت خوش ہوں کہ زندگی نے مجھے خوبصورت اور نایاب ہیپی اینڈنگ دی ہے۔ میں آنے والے کل کی پروا کیے بغیر اپنے آج کو بھرپور انداز میں گزارنا چاہتی ہوں۔"

اس نے گہرا سانس بھر کر قلم بند کیا اور ڈائری کو محبت سے دیکھا۔ پوری زندگی کی کہانی اس میں آ سمائی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے ڈائری بند کی اور باہر کی جانب چل دی۔ بہرام کسی بھی لمحے آنے والا تھا۔ ٹھک کی آواز سے

دروازہ بند ہوا۔ کھڑکی کو لگے ریشمی پردے ہوا کے دوش پر ہلے تو نارنجی سورج کی آخری ڈوبتی کرنیں کمرے کے اندر تک آئیں اور کالی ڈائری کے سرورق کو منور کیا جہاں کسی نے قلم سے کھرچ کر لکھا ہوا تھا۔

"ساک"

☆☆☆☆☆☆☆☆

تمت بالخیر